جان کمپنی سے جمہوریہ تک

جدید ہندستان کی کہانی

مشیر الحسن

سابق نائب شیخ الجامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ

مترجم

مسعود الحق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارتِ ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)

ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110 066

John Company Se Jamhuria Tak
Jadeed Hindustan Ki Kahani
By : Musheerul Hasan

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سنہ اشاعت : جولائی۔ ستمبر 2001 شک 1923
پہلا اڈیشن : 1100
قیمت : -/114
سلسلۂ مطبوعات : 886
کمپوزنگ : محمد موسیٰ رضا

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
طابع : فہمی کمپیوٹرس، 900- دین دنیا ہاؤس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی۔ علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انہوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہو گئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور

پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے کہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

- پیش لفظ iii
- عرض مترجم vii
- تاریخ بطور مکالمہ viii
- پہلا باب 1
- دوسرا باب 16
- تیسرا باب 51
- چوتھا باب 100
- پانچواں باب 148
- چھٹا باب 195
- ساتواں باب 233
- آٹھواں باب 289
- نواں باب 341

والد مرحوم محبّ الحسن کے نام

عرض مترجم

تاریخ کا مطالعہ، بلکہ صرف تاریخ ہی کا کیوں سماجی، سیاسی اور ثقافتی ماضی کا مطالعہ صرف اس لیے ہونا چاہیے کہ اس کی کوتاہیاں ہم سے پھر سرزد نہ ہوں اور ہم اپنے حال اور مستقبل کو زیادہ گوارا بنا سکیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنے ورثے کی چھان پھٹک کرنا چاہیے کہ اس ورثے میں بہت کچھ اگر اچھا ہے تو بہت کچھ ایسا بھی ہے جس کی اب ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام ہمارے جیسے ملک میں، جہاں زبان، معاشرت، مذہب، رسوم و رواج کی چمن آرائی ہے، پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ ہمیں انتخاب کرنا ہوگا اور یہ کام بڑے جوکھم کا ہے۔ بہرحال اگر خوشگوار اور روشن مستقبل کی تمنا ہے تو وسیع النظری، وسیع القلبی اور اعتدال کا دامن پکڑنا ہوگا کہ اس کے بغیر ہمارے خوابوں کا ہندستان شاید ممکن نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ تعلیم دراصل تہذیب کا دوسرا نام ہے۔ تاریخ بھی مہذب سماج کی تشکیل و تعمیر کا ایک ذریعہ ہے۔ قدرت کی عطا کی ہوئی بوقلمونی ایک وردان ہے۔ بقول ڈاکٹر ذاکر حسین "میرے اندر کوئی چیز ہے جو مجھے یہ یقین دلاتی ہے کہ قدرت نے ہندستان کی تقدیر میں ایک ایسی تجربہ گاہ بننا لکھ دیا ہے جس میں ثقافتی امتزاج کا سب سے بڑا تجربہ کیا جائے گا اور یہ کہ اس کی تکمیل بھی انتہائی کامیابی سے ہوگی۔ ہندستان کا مشن دنیا کی تاریخ میں، مجھے لگتا ہے کہ ایک امتیازی قسم کی انسانیت کا ارتقا ہے جس میں یہ تاریخ کی پیدا کی ہوئی متنوع اور مختلف نیکیوں اور خوبیوں کا امتزاج بھی کرے گا اور انھیں ہم آہنگ بھی بنائے گا۔ اور اسی امتزاج اور

اسی ہم آہنگی سے غالبًا موجودہ نمونوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہذب وجود کے زیادہ قابل اطمینان اور معتبر نمونوں کی تشکیل ہوگی ....“۔

ماضی سے دلچسپی بڑھاپے کی علامت ہے اور پس ماندگی اور پست ہمتی کا ثبوت۔ برصغیر کا المیہ یہی ہے — بہرحال تاریخ پر پابندیاں لگائیے، اور حدبندیاں عائد کیجیے مگر یہ پابندیاں اور یہ حدبندیاں شائستگی اور تہذیب کی اور سماجی ذمہ داریوں کی پابندیاں ہونی چاہئیں — حافظے کی ناپائیداری معروف ہے مگر نازی جرمنی کو بھولنا نہیں چاہیے۔

مشیرالحسن کی اس کتاب کے ترجمے سے دلچسپی اسی لیے ہوئی کہ مجھے محسوس ہوا کہ اس کا مطالعہ ایک روادار سماج کے استحکام میں معاون ہوگا۔

آخر میں چند الفاظ ترجمے کے بارے میں — کتاب میں اردو اور فارسی کے اشعار اور عبارتوں کا استعمال ہوا ہے۔ مصنف نے یہ ساری چیزیں براہِ راست انگریزی سے لی ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ہر شعر اور ہر عبارت کو انگریزی سے ترجمہ کرنے کے بجائے اس کی اصل صورت میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ اب آپ کو کتاب میں اردو اور فارسی کے جو اقتباسات نظر آئیں گے وہ عموماً Original ہوں گے۔ بندے ماترم کا کوئی مستند اردو ترجمہ مجھے نہیں مل سکا، اسی طرح رانی جھانسی سے متعلق لوک گیت بھی دستیاب نہیں تھا۔ اس لیے ان دونوں کا ترجمہ میں نے خود کردیا ہے۔

مسعودالحق

تاریخ بطور مکالمہ

نئے ہندستان کے مورخین کے لیے ماضی کی تشکیل ایک تکلیف دہ اور کربناک عمل ہے، خصوصاً اُن مؤرخین کے لیے جن کا تعلق جنوبی ایشیا سے ہے، وجہ یہ ہے کہ تاریخ نگاری نو آبادیاتی زمانے سے ایک انتہائی متنازعہ میدان رہی ہے، یہ جذبات کو برانگیختہ بھی کرتی ہے اور زبردست کشمکشوں اور تنازعوں کا سبب بھی بنتی ہے۔ اقتدار کی خواہشوں اور احکامات کی پیروی میں تاریخ نگاری مؤرخ کی مقدس آزادی کی تحقیر کرتی ہے اور اس کی سماجی، تاریخ داں کی حیثیت کو شک بھی کردیتی ہے۔

مؤرخ ماضی کا نگہبان ہوتا ہے، اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے کے لیے وہ ناہموار وادیوں میں، مربوط، چسپاں اور پیوستہ عناصر کی جستجو میں سرگرم عمل ہوتا ہے۔ وہ ماضی سے خلاقانہ مکالمہ کرتا ہے۔ ماضی سے اس کا یہ مکالمہ حکومت اور اقتدار کے اشارے پر نہیں بلکہ آزادانہ طور پر، مفید اور پیچیدہ پہلوؤں کی دریافت کے لیے، اس کی ارفع اور ارزل علامتوں اور نقوش کی تلاش کے لیے، اس کے حیرت ناک اور پریشان کردینے والے متنوع خزانے کی جستجو کے لیے ہوتا ہے، وہ اپنے پڑھنے والوں کو ماضی کی حماقتوں سے متنبہ کرتا ہے اور تنگ نظر اور تفرقہ پرداز رجحانات کے زیاں سے آگاہ کرتا ہے۔ مبادا یہ ہماری سوچ پر حاوی نہ ہوجائیں۔ لاریب تاریخ ایک بے روح مضمون ہوکر رہ جائے گی اگر ہم پچھلے ہزار برسوں کے علم کے وارث ہونے کے بعد ماضی کے ناخوشگوار اور شرمناک واقعات سے سبق حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ ہمیں اچھا لگے یا بُرا، حقیقت تو یہ ہے کہ ہم ماضی کا مطالعہ اپنے حال کو گوارا اور رہنے

کے قابل بنانے کے لیے کرتے ہیں۔ آر جی کالنگ وڈ کے قول ے مطابق ہمیں اپنے تجربے کے کچھ مخصوص پہلوؤں کا انتخاب کرنا چاہیے اور اپنی تحقیق و جستجو کو ان ہی کی پیش رفت پر مرکوز کردینا چاہیے۔

'جان کمپنی سے جمہوریہ تک' (رولی بکس، نئی دہلی 2001) اسی موضوع سے متعلق ہے۔ میری پچھلی کتاب "Legacy of Divided Nation : India's Muslims Since Independence" (London, 1997) کی طرح یہ بھی آزاد ہندستان میں آنکھ کھولنے والے ایک فرد کی تشویش، پریشانی اور تذبذب کی عکاسی کرتی ہے۔ حقیقتاً یہ کتاب میرے ذہنی سفر کی ترجمان ہے۔ سفر جو نوآبادیاتی راج سے شروع ہوکر ایودھیا میں سرجوندی کے کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ اِس لمبے راستے پر چلتے ہوئے میں نے اُن تین انتہائی اہم عُقدوں کی گرہ کشائی کی کوشش کی ہے جنھوں نے نئے ہندستان کی تاریخ اور ہمارے عصری تجربات کی صورت گری کی ہے۔ یہ تین عقدے ہیں کلونیل ازم، نیشنلزم اور کمیونلزم۔ ان باہم آمیز موضوعات کو ایک ایسی کتاب میں سمونا اور ساتھ ہی کتاب کو عام قاری کی ذہنی و مالی استطاعت کے اندر رکھنا خاصا دشوار کام تھا۔ اس دشواری پر قابو پانے کے لیے میں نے بوجھل علمی تام جھام کی بجائے مکالمے کا طریقہ اختیار کیا اور بیچ بیچ میں اردو اشعار استعمال کیے ہیں، آپ کو کتاب میں تاریخ اور اردو شعر باہم پیوست اور شیروشکر نظر آئیں گے جو اسے خالص علمی تحریر کی بے کیفی اور خشکی سے بچاتے ہیں۔

اس طریقے اور اس ہیئت کے انتخاب میں مجھے تھوڑی جھجک تھی کیوں کہ ساتھی تاریخ داں مکالماتی انداز میں لکھی جانے والی تاریخ کے سلسلے میں کچھ غیر مطمئن اور بددل لگتے ہیں۔ پروفیسر پیٹر گائل کے ساتھ ایک نشری مباحثے میں جو آرنلڈ ٹوائنبی نے اپنی کتاب، 'اے اسٹڈی آف ہسٹری' کی ساتویں، آٹھویں، نویں اور دسویں جلدوں کی اشاعت کے بعد کہا تھا، میں بھی کہوں گا کہ "میں نے اپنی گردن جان بوجھ کر پھنسائی ہے"۔

کتاب میں میرے اہم کردار ہیں عزیز الدین حسین (مؤرخ)، جگ موہن سنگھ (انجینئر) اور پردیپ کمار سکسینہ (میڈیکل ڈاکٹر)۔ یہ لوگ نوابان اودھ کی سابق راجدھانی، وضع دار اور آدم نواز لکھنؤ میں رہتے ہیں مگر ملک کی تقسیم کے بعد ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات سے پریشان ہیں، آزادی اپنی جلو میں اتنی تباہی، اتنی دشمنی اور اتنے مصائب آخر کیوں لائی؟ یہ سوال ہے ان لوگوں کا — دوسرے لوگ آخر خود اِن کی طرح بُردبار اور ایک دوسرے کی اقدار و روایات کا احترام اور پاسداری کرنے والے کیوں نہیں ہیں؟ خاندان کی خاندان سے، دوست کی دوست سے یہ اندوہ ناک جدائی کیوں؟ آخر کیوں؟

گفتگو پندرہ اگست کے یومِ آزادی کی تقریبات سے شروع ہوکر اور چائے کی بے شمار پیالیوں اور لاتعداد کباب اور کلچوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے 1950 میں جمہوریہ کے قیام تک چلتی ہے۔ عزیز، ایک پکّا لبرل 6/ دسمبر 1992 کے دن بابری مسجد کے انہدام کے بعد افسردہ و دل شکستہ مرجاتا ہے۔ ہندستان کے سیکولرازم کے عہد سے وفاداری رکھنے والے کروڑوں مرد و زن عزیز کے اس دکھ کو محسوس کرتے ہیں۔

"ہمیں پُر امید رہنا چاہیے"، پردیپ نے کہا ہوتا، "کہ آنے والے ہزار برسوں کی تہذیب اور ان کا تمدن محاذ آرائی سے نہیں، بات چیت اور باہمی گفت و شنید سے متصف ہوگا"۔

یا پھر "بدترین صورت حال یہ ہوگی"، عزیز زیرِلب کہتا، "کہ ہمارے سامنے ایک ایسے ملک کا مسئلہ ہوگا جو خود اپنے باسیوں سے برسرِپیکار ہوگا"۔

"جان کمپنی سے جمہوریہ تک"، سیکولر قومیت کی توصیف کرتی ہے اور اُن مشترکہ روایات کی تلقین کرتی ہے جنھوں نے صدہا برسوں سے ہماری سوسائٹی کے سماجی تانے بانے کو ثابت و سالم رکھا ہے۔ "جیسا کہ تم جانتے ہو"، پردیپ نے کہا، "ہم کائستھ ہیں، میرے پتاجی فارسی، اردو اور ہندی پڑھتے ہیں، وہ امیر خسروؔ، ملک محمد

جائسی، کبیر، رحیم اور رس خان کے اشعار اور کویتائیں سناتے ہیں۔ ہم اپنی تاریخ کی درسی کتابوں میں ان سب کی بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے پتاجی سے معین الدین چشتی اور نظام الدین اولیا کا تذکرہ سنا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب فرقہ وارانہ منافرت کا دور دورہ ہے اِن ہی بزرگوں کے امن و شانتی، اخوت و بھائی چارے اور محبت، اور انسانیت کے پیغام کو پھیلانے کی ضرورت ہے۔

اسی طرح پردیپ کشمیری قومیت کے تصور اور مسلم نیشنلزم کے نظریے کی باہمی چپقلش کا بیان کرتا ہے۔ وہ خود بلا شبہہ گاندھی، نہرو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا ابوالکلام آزاد کے موقف کو ترجیح دیتا ہے، "میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرسکتا جو مذہبی قومیت کی تو توصیف کرتے ہیں مگر اُس اجتماعی اور مشترک ورثے کی تردید کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہی ہندستان بوقلموں تمدن کا گہوارہ رہا ہے اور ہمہ ثقافتی ساجوں میں، دنیا کا اوّلین ملک۔

"جان کمپنی سے جمہوریہ تک" کلونیل ازم پر ہونے والی حالیہ بحثوں کا عموماً اور اٹھارھویں صدی کا خصوصاً تذکرہ کرتی ہے۔ "فی الحال" عزیز کہتا ہے، "یہ کہا جاسکتا ہے کہ خوشحالی اور اتحاد کے کسی ایک سلسلے یا اُس کی کسی ایک قسم کو تمام علاقوں پر نافذ نہیں کیا جاسکتا"۔ پردیپ اپنے سامنے رکھی ہوئی نوٹ بُک کے اوراق پلٹتے ہوئے قطع کلام کرتا ہے، "تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ یہ ہے کہ ہندستان سے متعلق کوئی بھی تعمیم بالکل ویسی ہی ہوگی جیسی قصے کہانیوں میں ہاتھی کی وہ تعریف جس میں پانچ اندھے اس کے جسم کے جس حصے کو ہاتھ لگاتے ہیں اسی کو ہاتھی بتاتے ہیں"۔

میں، آخر میں، جگ موہن کے الفاظ دہرانا چاہوں گا، "ہسٹوریو گرافی ایک مسلسل چلنے والا مکالمہ ہے جو ضروری نہیں ہے کہ کسی اتفاق رائے پر ختم ہو مگر یہ مختلف اور متنوع تناظر سے کسبِ نور کرکے ماضی کی تفہیم کو بڑھاتا ضرور ہے"۔

اگر آپ اب بھی قائل نہیں ہوئے تو پھر سنیے، عزیز کیا کہتا ہے "میرا خیال ہے کہ بڑا ادیب وہ ہوتا ہے جس کا واقعات کا بیان غصے اور بُغض و عناد سے

پاک ہو اور اتنا مستحکم ہو جتنی کہ عظیم ثالث سرسوتی کی "

لوگوں نے مجھے بتایا کہ "جان کمپنی سے جمہوریہ تک" ان لوگوں کے لیے مفید ہوسکتی ہے جو ان لبرل اقدار کے حق میں دلائل کے متلاشی ہیں جنھوں نے ہندستانی قومیت کے تصور میں روح پھونکی ہے۔ مزید یہ کہ یہ بات میرے لیے فردوس گوش ہوتی ہے جب مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ میری دلیلیں اور میری توجیہیں ان لوگوں کے افکار کی کجی کو دور کرنے میں معاون ہوں گی جن کا عقیدہ ہے کہ ہندستان کو اس کے مراعات یافتہ فرقوں کے باہمی مانوی (Manichaean) تفرقوں سے بچایا نہیں جاسکتا۔ خش وَنت سنگھ جب قارئین سے "سیکولرازم کے نظریات اور مستحکم و مضبوط ہندستان کے ایک حامی دانش ور کے نقطہ نظر" کو پڑھنے اور اس پر غور کرنے کی تلقین کرتے ہیں تو یقیناً خوشی ہوتی ہے۔ اگرچہ ابھی منازلِ دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں۔

میں اپنی اس کتاب کو اپنے والد، ممتاز تاریخ داں محبّ الحسن کے نام معنون کرتا ہوں۔ افسوس ہے کہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ اس کتاب کو دیکھ نہ سکے۔ بہرحال کیلنڈر کے اوراق پلٹتے رہتے ہیں اور زندگی چلتی رہتی ہے۔

شعبہ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ — مشیرالحسن

ستمبر 2001

پہلا باب

موذّن مرحبا بروقت بولا　　تری آواز مکّے اور مدینے

استاد ذوق اپنی غزل کے اس آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے اذان کی آواز آئی، اللہ اکبر اللہ اکبر — اللہ اکبر اللہ اکبر اور اسی کے ساتھ ہی تمام شرکاء مجلس کے منہ سے نکلا تری آواز مکّے اور مدینے۔ اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہوکر مرزا فخرو نے کہا، صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو چکّر کھا کر ان کے سامنے آئی تھیں، بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی۔

"حضرات مشاعرہ ختم ہوا۔"

('دلّی کی آخری شمع' از فرحت اللہ بیگ)

یہ رمضان المبارک کے مہینے کا سولھواں دن تھا اور گرمیوں کی ایک تپتی ہوئی سہ پہر۔ اٹھاون سالہ مرزا اسداللہ خاں غالب، فتحپوری مسجد سے تھوڑی دور گلی قاسم جان میں اپنے گھر سے باہر نکلے۔ مگر اچانک ہی ان کے کانوں میں حب الوطنی کے گیتوں اور نعروں کی آواز پڑی اور وہ الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ آوازیں بلّی ماران سے نہیں بلکہ چاندنی چوک کی طرف سے آرہی تھیں، چاندنی چوک، دو رویہ درختوں والی ایک سڑک جو لاہوری دروازے سے لال قلعے کے محلات کی دیواروں تک جاتی تھی۔ مرزا نے چند نوجوانوں سے جو کسی مباحثے میں منہمک تھے، پوچھا کہ بھائی یہ شور

اور یہ ہنگامہ کاہے کا ہے۔ جب کسی نے جواب نہیں دیا تو وہ یہ شعر بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھر کو پلٹ گئے۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہورہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

وہ شام ایک مختلف شام تھی۔ گرد و غبار کا طوفان بیٹھ چکا تھا، شاہجہاں آباد کے باسیوں کو کچھ راحت ملی تھی۔ گلی قاسم جان کا محلہ جہاں رمضان المبارک کے مہینے میں شام کے وقت عموماً خاموشی رہتی تھی، جاگ پڑا تھا۔ یہ شام ایک اور لحاظ سے بھی مختلف تھی۔ قریب کے محلوں سے نوجوان اور بوڑھے جمع ہوگئے تھے جیسے انھیں کسی انہونی کے ہونے کا انتظار تھا۔ کچھ لوگ بڑے فخریہ انداز سے میرٹھ کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ بعض لوگ سراج الدین بہادر شاہ غازی کے ڈھلوائے ہوئے نقرئی سکے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں مل مل کر اپنی بے اعتباری کا اظہار کررہے تھے۔ "یہ فتح و کامرانی کی علامت ہے۔" وہ بڑے جوش و خروش سے ایک دوسرے کو بتا رہے تھے، "اللہ کے کرم سے بغاوت سارے ہندستان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے"۔ فیض بازار کا ایک تاجر، جس نے یہ سکہ ڈھالا تھا کہہ رہا تھا۔ یہ کیسے؟ مگر کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ایک باریش بزرگ نے اضافہ کیا، "قسم امام حسین کی، اب انگریزی راج کا زوال قریب ہے۔" کوئی دخل اندازی کرتے ہوئے گویا ہوا، "اور صاحب، یہ گوری چمڑی والے ہمارے بادشاہ سلامت کی جگہ نہیں لے سکتے ہیں"۔ پاس سے گزرتی ہوئی ایک برقعہ پوش نے کہا، "ان انگریزوں کا کوئی دین ایمان نہیں ہے۔ ہائے ہائے، ہماری لکھنؤ کی بیگمات کو کم بختوں نے کتنا ستیاناس کیا!"

غالب کے پڑوسی نے جو ابھی تک خاموش رہے تھے، اچانک اپنے پاس سے ایک اردو رسالہ "رسالۂ فتح اسلام" نکالا جس میں مسلمانوں کو اِن کافروں کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ کسی نے جامع مسجد کی دیوار پر لگے ہوئے ایک اعلان کو پڑھنا شروع کردیا۔ خیال یہ تھا کہ یہ اعلان شاہ ایران کی طرف سے ہے، اس میں مسلمانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ اپنے باہمی اختلافات کو ختم کردیں اور ...."

ابھی اعلان کی پوری عبارت پڑھی بھی نہیں گئی تھی کہ دو نوجوان لڑکوں نے اعلان کردیا کہ فرنگی راج ختم ہوگیا۔

ہر اہم موقع، وہ چاہے جلوسِ شاہی کی مہرولی روانگی کا ہو یا رمضان کے بعد عید کے چاند کی رویت کا، لوگوں کو یہ سوچنے پر اکساتا تھا کہ وہ کیا ہونا چاہتے ہیں، وہ کن اقدار کو رائج کرنا چاہتے ہیں، کیا ترک اور کیا میراث چھوڑنا چاہتے ہیں۔ اس وقت، بہرحال لڑکے کسی قدر قبل از وقت بول پڑے تھے۔ دہلی میں 1857 کی بغاوت ایک غبارے کی طرح پچک گئی۔ انگریزوں نے 8/ ستمبر کو قدسیہ باغ اور لڈلو کاسل پر قبضہ کرلیا۔ تین دن بعد انھوں نے کشمیری دروازے کی بُرج کو بموں سے اڑا دیا۔ "یہ انتہائی قابلِ تعریف کام ہوا ہے"، بنگال انجینیرز کے لفٹنٹ آرتھر موفات لینگ نے 12/ دسمبر کو اپنے روزنامچے میں لکھا۔ "کسی قسم کی کوتاہی کی گنجائش نہیں ہے، ہم کامیابی سے ترتیب ہیں۔ محاصروں کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں، گولہ باری کے درمیان بہادری کے ساتھ .... دیواروں پر چوبیس پاؤنڈ کے گولوں کے پھٹنے کی آوازوں کا کان میں آنا اور دیوار میں تباہ کن شگاف آتے دیکھنا اچھا لگتا ہے"۔ غالب کی حویلی پر حملہ چودہ تاریخ کو ہوا، اس دن انھوں نے لکھا۔

> "......... نامہ نگار کردار گزار را نہ دل در بر تپید و نہ پای از جای جنبید نرفتم و گفتم کہ چوں گنہگار نیستم بسرزنش سزاوار نیستم نہ انگلسیان بیگناہ کش و نہ آب و ہوای شہر ناخوش مرا چہ افتادہ کہ در اندیشہ ہای تباہ افتم و افتاں و خیزاں براہ افتم در گوشہ بی توشہ با خامہ سیہ جامہ ہمز بانم و ہم از موہ شوراب بار و ہم از رگ خامہ خونابہ فشاں........"

(غالب: دستنبو۔ مطبع مفید خلائق، آگرہ، صفحہ 28)

> ترجمہ: "میرے دل پر نہ خوف و دہشت کا اثر ہوا اور نہ پائے استقلال کو جنبش ہوئی۔ میں نے کہا کہ میں گنہگار تو ہوں نہیں کہ سزا پاؤں۔ انگریز بے گناہوں کو قتل نہیں

کرتے ہیں اور شہر کی آب و ہوا ناسازگار نہیں ہے، مجھے کیا پڑی ہے کہ ان بدخیالیوں کو دل میں جگہ دوں اور ادھر اُدھر بھاگتا پھروں۔ (اب) مکان کے ایک گوشے میں بے سروسامانی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوں (اس تنہائی میں) قلم میرا رفیق ہے، آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں اور قلم سے دردناک الفاظ ٹپکتے ہیں ......"

(ترجمہ : خواجہ احمد فاروقی)

بے دست و پا بہادرشاہ جانتے تھے کہ سب کچھ ختم ہوچکا ہے۔ وہ پریشان حال اور کمزور نظر آنے لگے، ان کے انداز سے ایک مجہول دل شکستگی عیاں تھی۔ دہلی میں موسم گرما کے بعد ایک خوشگوار موسم بہار آیا تھا مگر مغل حکمران کے لیے نہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ، جن میں ان کے عیسائی ڈاکٹر چمن لال بھی شامل تھے، لال قلعہ چھوڑ کر حضرت نظام الدین اولیاء کی درگاہ کی طرف تسکینِ روحانی حاصل کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ان کی چال میں ایک بے چینی تھی، ایسا لگتا تھا جیسے آگے قدم بڑھانے کی انھیں نہ تو کوئی وجہ نظر آرہی تھی اور نہ ہی ان کے اندر اس کی کوئی خواہش تھی۔ سفر نے بہرحال انھیں نہ کوئی سکون فراہم کیا نہ کوئی راحت — پانسہ پھینکا جاچکا تھا۔ 20/ ستمبر کے اس منحوس دن، بے بسی اور بے کسی کی حالت میں بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے پر گرفتار کرلیے گئے۔ کوئین وکٹوریا کے نمائندوں نے ان کے سر سے تاج شاہی اتار لیا، شاہی خلعت بھی اتروا دی گئی۔ شرمناک انجام کی ابتدا ہوچکی تھی۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں
مرا رنگ روپ بگڑ گیا، مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو خزاں سے باغ اجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

(بہادر شاہ ظفر)

انگریز اور سکھ سپاہیوں نے لال قلعے میں، محل کو جو کبھی شاہجہاں کا گھر تھا، لوٹا اور تمام قیمتی سامان اٹھا لے گئے۔ 20/ دسمبر 1857 کو اسی منحوس دن جامع مسجد پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ فوج کے افسر اور جوان مسجد کے میناروں پر چڑھ گئے اور "سارے شہر کو، سارے ملک کو اس بلندی سے یوں دیکھا کہ جیسے قدموں میں پڑے ہوئے کسی نقشے کو دیکھا جاتا ہے۔ ساری دہلی ہماری تھی"۔ مسجد کے اندر انھوں نے رقص کیا، بیئر اور برانڈی پی، مسجد کے صحن میں آگ جلائی۔ اس سے زیادہ جشن کرنل Baird-Smith کے گھر پر منایا گیا، نصف شب کو بوتلیں کھلیں، آتش بازی چھوڑی گئی۔

اسی دوران، شہر کے ایک لاکھ ساٹھ ہزار باسیوں کو ان کے گھروں سے نکال کر کھلے آسمان کے نیچے پہنچا دیا گیا۔ اس خانہ بدری کے بعد ہر شہری کو جو واپس آنے کا خواہشمند ہوتا، جرمانے کی ایک رقم ادا کرنا ہوتی تھی۔ مسلمانوں کو املاک کی قیمت کا پچیس فی صدی اور ہندوؤں کو دس فی صدی۔ ہزاروں افراد کو سرسری مقدمات کے بعد یا بغیر مقدمے کے ہی تہِ تیغ کردیا گیا۔ سپاہیوں نے جو بھی سامنے آیا اسے گولی کا نشانہ بنایا۔ ممتاز ادیب میاں محمد امین پنجہ کش اور مولوی امام بخش صہبائی اور ان کے دو بیٹوں کو گولی مار دی گئی۔ ان کی نعشوں کو دریائے جمنا میں پھینک دیا گیا۔ ایڈورڈ وِبارٹ نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ غدر میں شریک سپاہیوں اور دوسرے باغیوں کو قتل کرکے بارہ بارہ کے گروہوں میں کوتوالی کے سامنے ایک چبوترے پر لٹکا دیا گیا۔

شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا

(غالبؔ)

جولائی کے مہینے میں انجینئرنگ کور کے ایک افسر نے فردوس جیسے شہر پر برج (Ridge) کے اوپر سے نگاہ ڈالی۔ محل کی سرخ دیواریں، کوہ پیکر دروازے، شاندار جامع مسجد، اس کی لال دیواریں اور خوبصورت گنبد، اپنے سرسبز کناروں کے ساتھ جمنا "بحیثیت مجموعی ایک خوبصورت اور انتہائی دلچسپ نظارہ" اکتوبر کے مہینے کے آتے آتے

لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان کی بہت سی عمارتوں کو چاندماری کا میدان فراہم کرنے کی خاطر ڈھا دیا گیا تھا۔ دیوانِ عام کو ہسپتال اور دیوانِ خاص کو جو شکوہ مغلیہ کی علامت تھا، افسروں کے کھانا کھانے کی جگہ میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ فتحپوری کی خوبصورت مسجد اور دریاگنج میں اورنگ زیب کی بیٹی کی بنوائی ہوئی حسین مسجد پر قبضہ کرلیا گیا تھا اور جامع مسجد جو انگریزوں کے قبضے میں تھی ہی ڈھا دی گئی ہوتی اگر وزیراعظم Palmerston کو اپنی سی کر گزرنے کا موقع مل جاتا مگر شکر ہے کہ عقلِ سلیم حادی آئی۔ مصلحتوں نے سمجھایا کہ اگر پندرہ سو ملین افراد پر مٹھی بھر انگریزوں کو حکومت کرنا ہے تو انھیں باہمی نفاق میں (جس میں وہ مذہب اور قومیت کے احساس کے معاملے میں پہلے ہی سے الگ الگ تھے) مبتلا رکھنا ہوگا اور ان کے دلوں پر برطانیہ کی ہیبت بٹھانا ہوگی۔ وائسرے لارڈ کیننگ نے وزیراعظم کو دونوں قوموں کے مذہب کے خلاف کچھ کرنے کا مطالبہ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اور مزید یہ کہا کہ "یہ دہلی کے لوگ اور خصوصاً گھر بار والے لوگ نہیں تھے جنھوں نے بغاوت کی یا باغیوں کی امداد کی۔" بغاوت کرنے والے تو وہ سپاہی تھے جو شہر میں داخل ہوئے اور ان لوگوں کی املاک کو تہس نہس کیا۔ بغیر معاوضے کے انھیں تباہ کرنا سراسر مہمل اور وحشیانہ عمل ہوگا۔"

میرٹھ سے ۱۱/ مئی کو باغیوں کی آمد اور شہر پر انگریزوں کے چودہ ستمبر کے کامیاب حملے کے درمیانی عرصے میں غالبؔ دلی ہی میں رہے۔ انھوں نے دلّی کے قرب و جوار کے تین نوابوں کو پھانسی دیے جانے کے بارے میں بڑے کرب کے ساتھ لکھا۔ "(یہ لوگ) الگ الگ، اور الگ الگ دنوں میں لے جائے گئے اور درختوں پر لٹکا دیے گئے تاکہ کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے، کہ ان کا خون بہایا گیا"۔ ان (غالب) کے بھائی کا گھر لوٹا گیا۔ انھیں خود بھی گرفتار کیا گیا اور بعد کو ان سے پوچھ گچھ ہوئی۔ "تمھارا نام؟" کرنل نے پوچھا۔ شاعر نے جواب دیا کہ وہ آدھا مسلمان ہے کیونکہ وہ شراب پیتا ہے مگر سور کا گوشت نہیں کھاتا ہے۔ انھیں دکھ تھا کہ دلی ایک ایسا شہر ہوگیا تھا جہاں کوئی حاکم نہ تھا، ایک غلام بغیر آقا کے، ایک باغ بغیر مالی کے"۔

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

(غالبؔ)

گلی قاسم جان سے کچھ ہی دور سے شیروانی میں ملبوس ایک شخص کی آواز آئی،

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دِلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
جس کو فلک نے لوٹ کے ویران کردیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اُجڑے دیار کے

(میر تقی میرؔ)

یہ ہنگامی واقعات دہلی میں لال پتھر کی عظیم عمارت قلعۂ معلّٰی یا لال قلعے کے اندر یا اس کے اطراف میں ہوئے۔ ستمبر کے تیسرے ہفتے تک اس عظیم قلعے کے مکین بادشاہ اور ان کی بیگم زینت محل قیدی بنائے جا چکے تھے۔ ڈبلیو. ایس. آر. ہڈسن، شاہی خاندان کے اراکین مرزا مغل، ابو بکر اور خیر سلطان کو ہمایوں کے مقبرے میں لایا اور 21/ اکتوبر کو دلّی دروازے پر گولی مار دی۔ چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر اس نے خاندان تیموریہ (Tartars) کے اہم اور معزز اراکین کو ٹھکانے لگا دیا۔ "اس نے ان بدنصیب بے چاروں کی خاک کو روندنے کے اس موقعے کا بھی جشن منایا"۔ 27/ جنوری اور 9/ مارچ 1858 کے درمیان لال قلعے کے دیوانِ عام میں مقدمہ چلا، انھیں مجرم قرار دیا گیا، اکتوبر میں انھیں دیس نکالا دے کر رنگون بھیج کر قید کر دیا گیا۔ اس بن باس دیے جانے سے قبل انھوں نے اپنے دوستوں سے کہا، میں عندلیب گلشنِ ناآفریدہ ہوں"۔

اور اس طرح شاہی خاندان کو منظر سے کنارے کر دیا گیا۔ تھکے ہارے اور شکست خوردہ سپاہیوں کی یاس و ناامیدی کی جنگ کب کی ختم ہو چکی تھی۔ یہ ایک عہد کا خاتمہ اور ایک نئے دَور کا آغاز تھا۔ ناول نگار احمد علی نے اپنی کتاب "Twilight in Delhi (1940)" میں لکھا، "ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی کو 'تاریخ' کے ایک جلوس کو تیزی سے گزرتے دیکھنے اور ساتھ ہی اس میں شامل ہونے کا موقع ملتا ہو"۔ تیرھویں صدی کے اوائل میں دارالسلطنت بننے کے بعد سے علوم و نظریات کو اپناتے اور تہذیب و تمدن کی دولت لٹاتے ہوئے، اپنے حکمرانوں اور باشندوں کی اپنی نسل و اصل پرستی کے باوجود۔ بہ یک وقت یک رنگ و وسیع المشرب دلّی بحیثیت مجموعی سارے ملک کی تجسیم رہی، اور عقائد و مسالک کی اُن بدروحوں اور واہموں سے آزاد رہی جو ماضی کے متعصب تاریخ دانوں کی مردہ روحوں کے آسیب میں گرفتار نئے ہندستان کے بعض مصنفین اور ناقدین پر مسلط رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نوّے برس گزرنے کے بعد، وسط اگست میں، ایک عہد زریں کے گزر جانے پر یا ایک سلسلۂ شاہی کے معدوم ہو جانے پر کسی نالہ و شیون کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ کسی ادیب یا شاعر کے شہر آشوب لکھنے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ رات کے بارہ بجے ملک غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد ہو چکا تھا۔ مقدر سے ملاقات کے وعدے کا ایفاء جواہر لال کی فصیح و بلیغ تقریر سے شروع ہو گیا۔

> "برسوں ہوئے"، انھوں نے کہا، "ہم نے اپنے مقدر سے ایک عہد کیا تھا، آج وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں اپنا وہ عہد پورا کرنا ہوگا۔ مکمل طور پر ہی نہیں مستحکم طور پر بھی۔ نصف شب ہوگی کہ جب دنیا سوتی ہے، ہندستان آزادی اور زندگی کی فضا میں بیدار ہوگا۔ تاریخ انسانی کی ابھی صبح ہی تھی جب ہندستان نے کبھی نہ ختم ہونے والا سفر شروع کیا

تھا۔ ایک وقت ایسا آتا ہے، اور تاریخ میں شاذ و نادر ہی آتا ہے جب ہم قدیم سے نکل کر جدید میں قدم رکھتے ہیں، جب ایک عہد ختم ہوتا ہے اور دوسرا شروع ہوتا ہے، اور صدیوں سے کچلی گئی ملک و قوم کی روح کو اظہار کا حق ملتا ہے، موقع ملتا ہے .... پچھلی بے نشان صدیاں ہماری جدوجہد کے نقوش اور اس کی ناکامیوں اور کامیابیوں کی پُر شکوہ علامتوں سے پُر ہیں .... اس سنجیدہ لمحے میں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہندستان اور اس کے عوام کی خدمت بلکہ اس سے بھی زیادہ ساری نوع انسانی کی فلاح کے لیے اپنے آپ کو وقف کردینے کا عہد کریں۔ یہ کامرانی، کہ جس کا جشن ہم اس وقت منارہے ہیں، عظیم کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف محض ایک قدم ہے اور اُن نئے امکانات کا محض آغاز جو ہمارے منتظر ہیں۔"

اس کی فکر نہ کیجیے کہ گھڑیال کے نصف شب کے اعلان پر جنگ آزادی کے لاتعداد سپاہیوں کا مشن پورا ہوا یا نہیں، اہم بات یونین جیک کا اترنا تھا اور اطمینان کی بات یہ تھی کہ نہ صرف لال قلعہ پر کہ جہاں یہ 1857 میں لہرایا گیا تھا بلکہ ہندستان میں کہیں بھی اب یہ دوبارہ نہ لہرایا جائے گا۔ اب تو تین رنگ والے جھنڈے کی باری تھی آسمان میں لہرانے کی۔ یہ جھنڈا، ہندستان کے وزیراعظم نے اعلان کیا، نہ صرف ہندستان کے لیے بلکہ ساری دنیا کے لیے آزادی اور جمہوریت کی علامت ہے۔

لال قلعہ کے اندر 1945 میں آزاد ہند فوج کے مقدمات ہوئے تھے۔ ان مقدمات کے سلسلے میں نہ جانے کتنے ماہرین قانون اور ممتاز وکلاء کی، جنگ آزادی کے ان سپاہیوں کے دفاع میں قلعے کے رومی دروازے سے آمدورفت رہی۔ ان ممتاز ماہرین قانون میں تیج بہادر سپرو، بھولا بھائی ڈیسائی، کیلاش ناتھ کاٹجو، پی کے سین، آصف علی، بخشی ٹیک چند، کنور دلیپ سنگھ اور جواہر لال نہرو جو وکیل کی حیثیت سے

آخری بار سامنے آرہے تھے، شامل تھے۔ 15ر اگست کو ہندستان کی تاریخ کا یہ مرحلہ انجام کو پہنچا، سین ختم ہوا اور پردہ گر گیا۔

لوگوں کے ہجوم، وہ سب واپس لینے کے لیے کہ جو ان کا اپنا تھا، اور ایک نئے عہد کی صبح کے طلوع کا جشن منانے کے لیے لال قلعے کی طرف لپکے۔ شدت جذبات سے گلے میں اٹکتی ہوئی آواز جب مجمع کے کانوں میں پڑی تو ساری فضا ان کی پُرجوش تالیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ اپنے اسکول کے یونیفارم میں ملبوس نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے ایک آواز ہوکر نعرہ لگایا، "چاچا نہرو زندہ باد، زندہ باد" آتش بازی کے گولوں کی آواز اوکھلا جیسی دور دراز بستیوں تک میں سنی گئی کہ جہاں خود جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اسی طرح کی ایک تقریب منائی جارہی تھی۔ وہاں امیر جامعہ نے جب افلاس کے مارے ادارے کے لیے روشن امکانات کا مژدہ سنایا تو استادوں اور طالب علموں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

جھنڈا، قومی ترانہ اور قومی نشان وہ تین علامتیں ہیں جن کے ذریعے ایک آزاد و خودمختار ملک اپنے تشخص، اپنی پہچان اور اپنے اقتدار مطلق کا اظہار و اعلان کرتا ہے۔ اور اسی لیے یہ تینوں بلا استثنیٰ ہر ایک سے، افراد و اشتباہ سے مبرا احترام اور وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ تینوں خود اپنی ذات سے، ملک کے افکار و خیالات، تہذیب و تمدن اور سارا پس منظر منعکس کرتے ہیں۔ جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب "تلاش ہند" میں لکھا ہے کہ تہذیب و تمدن کے آغاز سے ہی ہندستان کے ذہن پر اتحاد و یکجہتی کے خواب کا ایک پر تو رہا ہے۔ اُس وقت استعماری غلامی سے آزادی، اس خواب کی تکمیل کی طرف پہلا بیّن قدم تھا۔

ایک برطانوی سول سرونٹ آئرش پورٹل (Irish Portal) نے چوتھی دہائی کے اوائل کے جذبات کی عکاسی علی الاعلان یہ کہہ کر کی "تمھیں لوگوں سے ان کی زمین کبھی نہیں چھیننی چاہیے۔ عوام کے لیے زمین کچھ عجیب اسرار رکھتی ہے۔ آپ جاکر تھوڑی بہت چیزوں کا حکم دے سکتے ہیں، کچھ نئے نظریات و خیالات متعارف کرا سکتے ہیں، ایک اجنبی قوم سے، ان کے لیے بالکل نامانوس رویّوں کو جبراً قبول کرانا بھی

شاید ممکن ہو" مگر پھر اس نے کہا، "مگر ان سب چیزوں کو چھوڑ کر Cheltenham میں جاکر آخری سانس لینی چاہیے"۔

☆☆☆☆☆

جشن آزادی کی تقریبات میں موتی لال نہرو کے بیٹے، کیمبرج کے تعلیم یافتہ جواہر لال کی مرکزی حیثیت تھی۔ ان کے کردار و عمل اور ان کی دین کا تخمینہ لگانا اور جائزہ لینا بڑا کام ہے کیونکہ نہرو نے متعدد دہائیوں تک انتہائی اہم اور مرکزی کردار ادا کیا ہے۔

1920ء کے اوائل میں ایک سرگرم کانگریسی ورکر کی حیثیت سے سامنے آنے کے بعد وہ مہاتما گاندھی کے سیاسی وارث بن گئے۔ لندن میں Bloomsbury group کے اثرات کے نتیجے کے طور پر وہ کانگریس کے اندر سوشلزم کے اہم وکیل بنے اور بہت سے دوسرے متعدد انقلابی گروہوں کے لیے مرکز توجہ۔ وہ اپنی ساری عوامی زندگی میں ملک بھر میں دوڑ دھوپ کرتے رہے، سرگرم عمل رہے، تجربات سے سیکھنے کے لیے تیار، تقریروں کے ذریعے اپنی بات دوسروں تک پہنچانے میں مستعد، لوگوں کو جدوجہد میں شامل کرنے کے لیے سرگرداں اور پارٹی پر اپنا اثر چھوڑنے کے لیے کوشاں۔ انھوں نے اپنے آپ کو عوام میں، اقلیتوں اور دوسرے پسماندہ اور محروم لوگوں میں مقبول بنا لیا۔ ہندستانیوں کی ایک پوری پیڑھی کے لیے لیڈر سے زیادہ وہ ایک ایسے ساتھی کی حیثیت رکھتے تھے جس نے حال کے بارے میں ایک مخصوص نقطۂ نظر کی تلقین و تصویرکشی کی اور مستقبل کی بصیرت دی۔

نہرو کی تشویش اور ان کے مقاصد، انگلستان کی ان کی لبرل ایجوکیشن کے پابند تو نہیں لیکن اُس سے متاثر ضرور تھے۔ اس کے علاوہ، تیج بہادر سپرو کے ساتھ ان کے والد موتی لال نہرو کا بھی اثر تھا، جنھوں نے الٰہ آباد میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک ethos کی تشکیل کی تھی۔ مگر خاندانی زندگی اور تعلیم ہی وہ واحد عنصر نہیں ہے جس نے ان کے مستقبل کی راہ متعین کی۔ بہرحال اردو بولنے والے

اشرافیہ کے روشن خیال نقطہ ہائے نظر نے الہٰ آباد میں رہنے والے ہر شخص کو متاثر نہیں کیا تھا۔ مثال کے طور پر ہندوتوا کے اہم مبلغ اور موتی لال نہرو کے زبردست نکتہ چیں مدن موہن مالویہ ہی کو لے لیجیے۔ اسی طرح محمد علی جناح تھے۔ اُن کا اور نہرو کا سماجی اور تعلیمی پس منظر ایک ہی سا تھا مگر وہ مسلمانوں کے ایک الگ وطن کے علم بردار بن گئے۔ اپنے ابتدائی عقائد کے خلاف، گاندھی اور نہرو کے رویّوں یا کانگریس میں ایک حلقے کی مسلم دشمن پالیسیوں کے باوجود انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یہیں نہرو اور جناح کا باہمی فرق تھا۔ جہاں جناح نے اپنے نظریاتی لباس کی قطع و بُرید سیاسی ضرورتوں اور مصلحتوں کے مطابق کی، نہرو نے تفریق کے ہر رجحان کی انتہائی عزم کے ساتھ مخالفت کی۔ وہ جناح کی طرح اپنے عقائد کے معاملے میں ڈگمگائے نہیں۔ اگست 1947 میں ہندستان نے آزادی کا پھل پایا مگر ملک بڑی بے دردی کے ساتھ تقسیم کردیا گیا۔ ایسے وقت میں سیکولر نظریات کی نہرو کی وکالت اور ان کا دفاع غیر حقیقی اور کھوکھلا لگتا تھا مگر اس صورت حال کے باوجود ایک سیکولر ملک اور ایک سیکولر سماج کے لیے ان کے جذبے میں کبھی کوئی کمی نہیں آئی اور نہ وہ اس راہ میں کبھی متزلزل ہوئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ نہرو اور جناح باہمی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کے لیے بنے ہی نہیں تھے۔ اگرچہ ان کے معاصرین کو یہ توقع تھی کہ لبرل تربیت دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ہوگی۔ دونوں کے راستے اس وقت الگ ہوگئے جب جناح نے کانگریسی وزارتوں کی برملا پُرزور ملامت شروع کی۔ ان کی تنقید سخت تھی اور انتہائی سطحی شواہد پر مبنی۔ مگر پیغام جو جناح کی تقریروں اور ان کے خطوط سے مترشح تھا وہ یہ تھا کہ نہرو کی سیکولر لفاظی سے کام نہیں چلنے والا۔ اور Pax Brittanica میں اکیلی کانگریس ہندستان کے آئندہ سیاسی ایجنڈے کو طے نہیں کرسکتی۔ اس میں مسلمانوں کی رائے کا بھی دخل ہونا چاہیے اور یہ کہ ان کے واحد ترجمان کی حیثیت سے انھیں یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا ہندستان کو متحد رکھنا چاہیے یا اسے تقسیم کردیا جانا چاہیے۔

جناح نے پاکستان حاصل کرلیا مگر بعد کو اس خیال کے حامی ہوگئے، اگرچہ دیر سے ہوئے کہ ان کے نئے ملک کا مقدر سیکولر ایجنڈا پر چلنے ہی میں ہے۔ نہرو کے لیے یہ کوئی انکشاف نہیں تھا۔ ان کا طویل المدتی منصوبہ سیکولرزم مخالف رجحانات کو قابو میں رکھنے کا تھا۔ 1940 میں انھوں نے اس بات کو یقینی بنایا کہ نیشلسٹ تحریک، جس کی رہنمائی ابھی بھی گاندھی جی کررہے تھے، اپنے جمہوری اور سیکولر مقاصد کو ترک نہ کرے۔ ایسا کرنے میں انھوں نے خالص نہروئی (Nehruvian) منزل کی راہ نہیں اپنائی بلکہ اس منزل کی طرف بڑھے جس کا تعین گاندھی نے، کانگریس کے سیکولر حلقے نے اور بائیں بازو کی تنظیموں نے کیا تھا۔

جدید ہندستان کے ایک سیاسی حل کے طور پر ایک سیکولر ریاست کی بنیاد اس جواز پر تھی کہ ایسی ریاست اپنے شہریوں کو ایک مکمل وجود میں ترقی کرنے کی آزادی عطا کرے گی۔ یہ ایک نیا اور جدید مقصد تھا جو معقول ہونے کے ساتھ ساتھ خصوصی طور پر ہندستانی بھی تھا۔ یہ اقدار سب پر واضح تھیں اور اسی لیے یہ نہرو اور ان کے ساتھیوں کے لیے سیکولر اسٹیٹ کے بنیادی اور قطعی جواز کی حیثیت رکھتی تھیں۔

"ہندستان میں ہم سب کے لیے" انھوں نے اپنے وزراء اعلیٰ سے کہا، "فرقہ وارانہ اتحاد اور ایک سیکولر اسٹیٹ کا مسئلہ بالکل صاف اور واضح کردیا جانا چاہیے۔ ہم اس نظریے کے ساتھ کافی عرصے تک کھیلتے رہے ہیں اور آج اس سے خاصے دور ہوچکے ہیں۔ ہمیں واپس ہونا چاہیے اور نہ چوری چھپے اور نہ ہی معذرت خواہی کے ساتھ بلکہ کھلم کھلا اور جارحانہ انداز میں واپس ہونا چاہیے"۔

نہرو اپنے وزرائے اعلیٰ کو یہ تحریر لکھ رہے تھے اور اسی وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جرمنی کے پڑھے ہوئے ایک عالم ڈاکٹر عابد حسین نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" کا اردو ترجمہ ختم کررہے تھے۔ جمنا کے قریب اوکھلا میں یہ حبس اور گرمی کی ایک شام تھی جب انھوں نے کتاب کے ترجمے کے کچھ حصے اپنی بیوی صالحہ عابد حسین اور اپنے ساتھیوں ذاکر حسین اور محمد مجیب کو سنائے۔ عبارت جو ان لوگوں کو

بہت دلچسپ لگی وہ وہ تھی جہاں نہرو نے ملک کی تعمیر اور ملک کے پرانے مسائل اور پریشانیوں کے حل کی تلاش میں پیش آنے والی دشواریوں کی بات کی تھی۔ عابد صاحب نے تھوڑے توقف کے بعد پڑھنا شروع کیا۔

"............... ہندستان میں ہر وقت مصیبت ہمارے سر پر منڈلاتی رہتی ہے۔ اور کبھی کبھی ہم پر نازل ہوکر ہمیں تباہ کردیتی ہے .... ہندستان کے حصّے بخرے ہو جانا اور حصّے کا دوسرے سے تعاون یا اس کی پرواہ کیے بغیر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا اس بیماری کی شدت میں اضافہ کردے گا اور ہم ایسی مصیبت میں مبتلا ہوکر رہ جائیں گے جس سے نجات پانے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ یوں بھی کافی دیر ہوچکی ہے اور ہمیں کھوئے ہوئے وقت کی تلافی کرنا ہے ....
اب بھی بہت سے لوگ ہیں جو اس کے سوا اور کوئی بات سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے کہ ان کی نمائندگی کا مناسب تناسب اور وزن مزید کیا ہو، پارٹیوں کی طاقت میں کس طرح توازن پیدا کیا جائے۔ جماعتوں کے مخصوص حقوق کی حفاظت کا کیا انتظام ہو، اور نئی نئی جماعتوں کو خاص حقوق اور مراعات کیسے دلائے جائیں۔ وہ دوسروں کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہتے ہیں کیونکہ وہ خود آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا نہیں بڑھ سکتے۔ وہ اپنے مستقل حقوق کو قائم رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں اور اہم سماجی اور معاشی تبدیلیوں سے بچنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ہندستان کا یہی موجودہ نقشہ تھوڑی بہت سطحی تبدیلیوں کے ساتھ باقی رہے۔ اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہوسکتی ہے ....۔"

(ترجمہ ڈاکٹر عابد حسین : "تلاش ہند"، جلد سوم، صفحہ 509)

مجیب نے اپنی شیروانی کے بٹن بند کیے سگار کا کش لیا اور یہ اشعار پڑھے

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

(فیضؔ)

ان اشعار کو پڑھنے کے بعد وہ اٹھ کھڑے ہوئے، اور عابد صاحب کے گھر سے نکل کر اپنی کار میں بیٹھ گئے۔ انھیں راشٹرپتی بھون میں ایک ڈنر میں شریک ہونا تھا۔

☆☆☆☆☆

اپنے رقبے کے لحاظ سے لکھنؤ تین پریسیڈنسی شہروں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کو چھوڑ کر سلطنت برطانیہ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ آج اگرچہ شہر اپنے پہلے سحر سے محروم ہوچکا ہے مگر اس کی توانائی ابھی باقی ہے اور اہل لکھنؤ مستقبل قریب ہی میں اپنے شہر کے اعادۂ شباب کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھیں یقین ہے کہ یہاں کی نبضِ حیات دوسری جگہوں کے مقابلے میں اب بھی زیادہ تیز اور زیادہ توانا ہے۔

یہی وقت تھا اپنے اُن گویّوں، رقاصوں، شاعروں اور ادیبوں کو یاد کرنے کا جنھوں نے لکھنؤ کی ادبی اور ثقافتی زندگی پر اپنی انمٹ چھاپ چھوڑی تھی، یہی لمحہ تھا اس بات کو دہرانے کا کہ یہی شہر لکھنؤ تھا جس کی حیثیت ہندستان کے بغداد اور قرطبہ کی تھی اور جو مشرق کا نشاپور اور بخارا کہلاتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں بہت سے اُن تصورات اور اختراعات نے جنم لیا جنھوں نے شمالی ہند کی کلاسیکی موسیقی کے جدید خدوخال کی تصویر گری میں مدد کی۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں نزاکت و نفاست اپنے نقطۂ عروج کو پہنچی، یہیں رؤسا کے نوجوان لڑکے تہذیب اور سلیقہ، گفتگو کا فن اور اردو اور فارسی ادب سے لطف اندوز ہونے کے لیے دیوان خانوں میں وقت گزارتے تھے، اور اس عہد کے خمار آلود مزے سے سرشار ہونے کے لیے مرزا رسوا کا ناول امراؤ جان ادا پڑھتے تھے۔

لکھنؤ زمین داروں اور تعلقہ داروں کا بہت بڑا مرکز تھا۔ 1900 میں تعلقداروں کی تعداد ڈھائی سو تھی، اور یہ لوگ اودھ کے تقریباً دو تہائی علاقے پر قابض تھے۔ صوبے کے کل مالیے کا تقریباً چھٹا حصہ مالگزاری کی شکل میں یہی لوگ وصول کرتے تھے۔ دوسری دہائی کے اوائل میں کسانوں کی زبردست بے چینی نے بہرحال آسودہ خاطر اور مطمئن راجاؤں اور نوابوں کو جو اپنے دربار، مفلس و نادار کسانوں اور خود اپنی ریاستوں میں ہمہ روز بڑھتی ہوئی بے اطمینانی سے بے نیاز، بدستور لگاتے تھے، متنبہ ضرور کردیا۔ یوپی کے لفٹنٹ گورنر اور زمین دار دوست پالیسی کے اصل مجوز و موئد جیمس میسٹن (James Meston) اور ہارکورٹ بٹلر (Harcourt Butler) نے اگرچہ خطرات سے آگاہ کیا مگر لوگوں نے ان کے انتباہ پر کوئی توجہ نہیں

کی۔ ایک بیان کے مطابق : "اندھیرا ہونے کے بعد، سفید انگرکھے، چوڑی دار پاجامے اور بڑھیا سفید ٹوپیاں پہنے پان چباتے ہوئے، مشرقی خوشبوؤں سے فضا کو معطر کرتے ہوئے، چوک کی طرف رواں دواں ان نوابوں کو پہچاننا بھی دشوار ہوتا تھا۔ چوک کے سارے راستے، ناچنے اور گانے والیوں سے ان کی مڈبھیڑ ہوتی تھی......... اپنے تمام سحر اور اپنے تمام عیوب کے ساتھ جاگیرداری نظام کی سارے لکھنؤ پر حکمرانی تھی۔"

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں کانگریس کی تحریک نے بڑے منظم طور پر تعلقداروں کی اقتصادی اور سیاسی بنیاد کو متزلزل کردیا۔ زمین داروں کی پارٹی کو 1937 کے انتخابات میں شکست فاش ہوئی۔ 1939 کے یوپی ٹیننسی ایکٹ کا پیغام بہت واضح اور بالکل صاف تھا۔ ہر شخص، زمینداری نظام کے خاتمے کا بڑے اشتیاق اور بے چینی سے انتظار کررہا تھا کہ جس کے بعد زمینداروں اور تعلقداروں سے ان کی ریاست کا بڑا حصہ لے لیا جائے گا اور زمین کاشت کرنے والے کو مل جائے گی۔ "پاگل پن کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں" ایک نوجوان مریض نے سوال کیا، جواب میں لکھنؤ کے ایک مشہور ڈاکٹر نے کہا، "اودھ میں جتنے تعلقدار ہیں۔"

اودھ کے تعلقدار اور ان ہی کی طرح مغربی یوپی کے تعلقدار ایک ایسے سماج میں حملوں کے ہدف تھے جو عوامی سیاست، بالغ رائے دہندگی، اپنے سیاسی اور اقتصادی حقوق کے مطالبات کرتے ہوئے نئے طبقات اور ملک میں ایک عام سیاسی بیداری کے زیراثر تیزی سے بدل رہا تھا۔ دوسری دہائی کے اوائل میں کسان ایجیٹیشن نے اکثر کانگریس کے اثر سے آزاد، کسانوں میں ایک بے مثال شعور کو بیدار کیا اور ان کے اندر نظام کی ناانصافیوں اور عدم مساوات کا شدید احساس پیدا کردیا۔ ابتدائی گاندھی وادی تحریکوں نے، ان میں اختلاف کرنے، احتجاج کرنے اور انجام کار اراضی کے استحصالی نظام کی بیخ کنی کرنے کی اپنی صلاحیتوں پر اعتماد و یقین کی روح پھونک دی۔

تعلقہ دار، جن میں سے بہتوں نے اپنے محل، حویلیاں اور امام باڑے بنا رکھے تھے اور برٹش انڈیا ایسوسی ایشن اور نیشنل اگریکلچرل پارٹی سے تفریحی محبت کی پینگیں بھی بڑھائی تھیں۔ لکھنؤ اور جوار لکھنؤ کے اضلاع میں سیاسی رجحانات پر

کچھ بہت اثر انداز نہیں ہوئے۔ پھر بھی لکھنؤ اہم قومی اجتماعات اور متعدد احتجاجوں کا سرگرم مرکز رہا۔ اپریل 1900 میں ناگری ریزولیوشن کے خلاف احتجاج کا خاکہ، جس نے ہندی اردو کا تنازعہ شروع کیا ان بڑی بڑی حویلیوں میں ہی بنا تھا۔ ایسی ہی ایک میٹنگ میں نواب محسن الملک نے یہ شعر پڑھا۔

چل ساتھ کہ حسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

1904 میں محڈن ایجوکیشنل کانفرنس یہیں لکھنؤ میں ہوئی۔ تاریخی کانگریس مسلم لیگ سیشن 1916 میں بارہ دری میں منعقد ہوا۔ اس کی میزبانی پیش پیش مسلمان نوجوانوں کے سرپرست راجہ صاحب محمود آباد نے کی۔

عالم اسلام کے ممتاز و محترم عالم مولانا عبدالباری فرنگی محل میں رہتے تھے، انھوں نے گاندھی جی، علی براوران اور دوسرے کانگریسی لیڈروں کی میزبانی کی، خلافت کے مسئلے پر اور مقدس مقامات کے تحفظ جیسے معاملات میں مسلمانوں کی شکایتوں کے تدارک کے لیے حکومت پر زور ڈالنے کے لائحہ عمل تیار کیے۔ مولانا عبدالباری کا بہت دن ہوئے انتقال ہوچکا ہے، ان کے بیٹے مولانا جمال میاں، پاکستان چلے گئے۔ فرنگی محل آج چوک میں نوابی شہر لکھنؤ کے انحطاط کی افسردہ اور مضمحل علامت کی طرح موجود ہے۔

زندہ دلان لکھنؤ کے ہجوم مختلف محلوں سے گزرتے تو انھیں یاد آتا کہ ان کا یہ شہر کس طرح کامیاب وکیلوں، اخبار کے اڈیٹروں، اردو اور ہندی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کا مسکن رہا ہے۔ ان لوگوں میں بہت سے یہیں پیدا ہوئے اور یہیں بڑے ہوئے، بہت سے قرب و جوار کے قصبوں سے بہتر زندگی کی تلاش میں یہاں آئے اور آکر رہ گئے۔ قصبات سے آنے والے یہ لوگ اپنے ساتھ قصباتی معاشرت سے جڑی ہوئی نفاستوں اور رعنائیوں کو بھی لائے۔ انھوں نے کلاسیکی شعر و ادب پڑھا، دوستوں کے ساتھ چوک کی ڈیرہ دار طوائفوں کے پاس بیٹھ کر گانے سنے۔ رسموں، رواجوں

اور روایتوں میں عملی طور پر شرکت کی۔ انھوں نے عید بھی منائی اور دیوالی بھی اور اسی سنجیدگی اور احترام کے ساتھ محرم بھی۔ معاشرت کے اس مشترکہ ڈھنگ نے، اپنا پرتو ڈال کر لکھنؤ میں ایک ملواں سیاسی کلچر کی بنیاد رکھی۔ وقتاً فوقتاً مذہبی اختلاف سامنے آئے مگر یہ تنازعات فرقوں کے درمیان میل و محبت اور بھائی چارے کے تانے بانے کو کمزور نہ کرسکے۔

☆☆☆

وجود رفتہ کے سائے میں، ایک بے اطمینان اور بے چین زندگی گزارتا ہوا یہ لکھنؤ سید عزیز حسین، جگ موہن سنگھ اور پردیپ کمار سکسینہ کا گھر تھا۔ باہمی محبت کے پروردہ یہ مہذب لوگ ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے اور ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ جگ موہن اور پردیپ کی، جو ایسے گھرانوں میں پلے بڑھے تھے جہاں کامیابی قدرت کا عطیہ تھی اور مواقع بن مانگے ملتے تھے۔ عمریں پچیس اور تیس کے درمیان تھیں۔ تربیت یافتہ انجینئر جگ موہن کو ٹاٹا نے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ پردیپ نے کلکتے سے میڈیکل ڈگری لی تھی، وہ لکھنؤ کے میڈیکل کالج میں سرجن تھا۔ جگ موہن نسبتاً معتدل مزاج تھا اور طنز و مزاح کا عادی، پردیپ کسی قدر دِقت پسند اور ناصح قسم کا آدمی تھا۔ عزیز، علی گڑھ کا گریجویٹ لکھنؤ یونیورسٹی میں تاریخ کا استاد۔ وہ اب پینتیس برس کا ہوا تھا، اس کا خاندان اگرچہ امیر گھرانہ نہیں تھا مگر پھر بھی اچھی خاصی حیثیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں ایک اچھے استاد کی حیثیت سے اپنا مقام بنایا تھا۔ اس کے مزاج میں نشتر، اس کے جملوں میں تیکھاپن ہوتا تھا، اس کی سوچ میں شرارت اور ایک چنگاری سی دہکتی تھی۔ وہ انتہائی غیض و غضب کا اظہار بھی کرسکتا تھا۔ سیماب وش بھی تھا مگر اس کھردرے ظاہر کے پیچھے ایک بے پناہ حساس روح بھی جلوہ فگن تھی۔ وہ انتہائی ذمہ دار اور محنتی تھا۔ اگر کام ہوتا تو وہ رات رات بھر لگ کر کام ختم کرسکتا تھا۔ بعض لحاظ سے وہ اپنے والد کی طرح تھا۔ باریک مونچھوں کے ساتھ قدیم شکوہ کا مظہر — اس کے والد صاحب کو موسیقی اور ادب

سے شدید لگاؤ تھا۔ ساتھ ہی وہ کئی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ سنسکرت سیکھنے کا شوق انھیں بہت بعد میں ہوا، انھوں نے اسے محض ایک مشغلے کی طرح اپنایا مگر اپنے ایک نجی استاد کے پی سنگھ کی مدد سے اتنی سنسکرت سیکھ لی کہ پھر بولنے اور لکھنے میں انھیں کوئی دشواری نہیں رہی۔

مختصراً یہ ہے کہ ان تینوں نے زندگی کا مقابلہ بڑی جوانمردی اور سرخروئی کے ساتھ کیا۔ ہندستان اور دوسری جگہوں پر ہمہ روز ہونے والی تبدیلیوں کی طرف سے سیاسی طور پر بیدار اور حساس، ان کی روزانہ کی مصروفیت اخبار، ایک نہیں دو دو کا غائر مطالعہ کرنا تھا۔ انھوں نے لکھنؤ کی متعدد سیاسی تحریکوں کے بارے میں سنا بھی تھا اور پڑھا بھی تھا، مثال کے طور پر 1942 میں جب گاندھی جی نے انگریزوں سے ہندستان چھوڑ دینے کا مطالبہ کیا۔ جگ موہن کے ماموں جنھوں نے اس کی تعلیم کا سارا بار اٹھایا تھا، مدنا پور میں گرفتار کرلیے گئے۔ انھوں نے اسے سلطنت برطانیہ کی بنیادوں پر گاندھی جی کی آخری یلغار "ہندستان چھوڑ دو" کی تحریک کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ عزیز کو لکھنؤ میں سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والی شورش، حضرت گنج میں نرہی اور اسٹیشن روڈ والے میدان پر ہونے والے عوامی جلسے اور "سائمن گو بیک" لکھے ہوئے غباروں کا اڑنا بھی یاد تھا مگر سب دھندلا دھندلا۔ اُس وقت اس نے نہرو، گوبند بلبھ پنت اور چودھری خلیق الزماں کو دیکھا تھا۔ ان لوگوں کو دوبارہ دیکھنا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔

1947-48 میں لکھنؤ ہندو مسلم فسادات سے پاک رہا تھا۔ لیکن عزیز، پردیپ اور جگ موہن نے جبلی طور پر محسوس کرلیا تھا کہ ملک کی تقسیم نے ان کے شہر پر بھی کتنے گہرے سائے ڈال دیے تھے۔ ان کے محدود تاریخی تجربات آہستہ آہستہ ان کے اجتماعی شعور میں سرایت کر گئے تھے۔

ہفتے کے آخری دنوں میں یہ لوگ شعر و ادب کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ان کے پسندیدہ ادیبوں میں جارج برنارڈ شاہ، رابندر ناتھ ٹیگور، قاضی نذرالاسلام، منشی پریم چند اور ای ایم فارسٹر (E. M. Forster) تھے۔ اردو شاعری ان سب کا دوسرا بڑا شوق

تھا۔ عزیز اپنا کافی وقت علما و فضلا اور ادیبوں کے ساتھ گزارتا تھا۔ اردو اور فارسی کے معروف عالم تبحر پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اس کی پسندیدہ شخصیت تھے۔ وہ گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے گذشتہ لکھنؤ کی باتیں کرتے۔ لکھنؤ کی جاندار ثقافتی زندگی اور یونیورسٹی کے دانش ورانہ کردار کی باتیں۔ میر ببر علی انیسؔ کے بارے میں مسعود صاحب کا علم بڑا گہرا اور وقیع تھا۔ میر انیسؔ 1802 میں پیدا ہوئے تھے اور میر سلامت علی دبیرؔ اُن سے ایک سال بعد۔ یہ دونوں غیر معمولی مرثیہ گو تھے۔ بہت دن ہوئے ندوۃ العماء کے مؤسس اور مولانا آزاد کے انٹلکچول گرو شبلی نعمانی نے موازنۂ انیس و دبیر کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔

پیہانی ضلع ہردوئی سے جب کبھی ان کے دوست ہمایوں ظفر زیدی، لکھنؤ آتے تو یہ لوگ بس اڈّے کے قریب کچہری روڈ پر آصف قدوائی کے مکان پر جمع ہوتے اور وہاں غالب کی غزلیں پڑھی جاتیں۔ بیچ میں کبھی کبھی ہمایوں سب سے الگ حالیؔ کی مسدس گنگنانا شروع کر دیتا۔

اس شام یہ لوگ محمود آباد ہاؤس کے نزدیک قیصر باغ میں ایک دوست کے مکان پر جمع ہوئے۔ محمود آباد ہاؤس معدوم برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کا مرکز بھی رہا تھا اور راجہ صاحب محمود آباد کی رہائش گاہ بھی۔ راجہ صاحب نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرتے ہوئے اپنا بوریا بستر لپیٹا اور کراچی چلے گئے۔ ان کے خاندان کے دوسرے افراد بہرحال عمارت کے مرکزی حصّے میں رہتے ہیں۔ راجہ صاحب کی بیوی، رانی صاحبہ آف بلہرا اپنا زیادہ وقت، روزے رکھنے اور نمازیں پڑھنے میں گزارتی تھیں۔ کچھ کھانے پینے سے اس وقت تک انکار کرتی تھیں جب تک کہ ججّن بوا اور رحیمن بی بی انھیں یہ نہ بتاتیں کہ کھانا کھانا اور پانی پینا احکام خداوندی (استخارہ) میں سے ہے۔ ججّن بوا اور رحیمن بی بی عموماً اس بات کو یقینی بنانا لیتی تھیں کہ بیگم کئی روز کی بھوکی ہو چکی ہیں۔ اس کے بارے میں ججّن بوا اور رحیمن بی بی ملازموں کو بتاتیں کہ یہ بھی اللہ کی مرضی تھی۔

بہرحال رانی صاحبہ اور ان کی مصاحبین و حاشیہ نشین خواتین ماہِ محرم کا

انتظار کرتیں، محرم کے چاند سے ایک دن قبل یہ سب خواتین اپنے برقعوں اور اپنے سیاہ ماتمی لباسوں کو باندھ بوندھ کر ضلع سیتاپور میں محمود آباد جانے کی تیاری کرلیتیں۔ یہاں قلعہ محل میں جاکر جہاں کسی زمانے میں یوپی کے لفٹننٹ گورنر ہارکورٹ بٹلر رقص و موسیقی کی محفلوں سے محظوظ ہواکرتے تھے، کربلا میں رسول کے نواسے کی شہادت کے غم سے نڈھال یہ خواتین، ایک طویل زمانہ ماتم میں گزارتیں۔ یہ ماتمی تقریبات مہینوں چلا کرتیں۔ اس زمانے میں ساری زندگی جیسے ٹھہر جاتی، معتقدین، جن میں ہندو ہوتے اور مسلمان بھی، یا حسین یا حسین۔ علی مولا علی مولا دہراتے ہوئے جلسوں میں شرکت کرتے۔

انتہائی تعلیم یافتہ اور نہایت نستعلیق راجہ صاحب محمود آباد اودھ کے مشترک تہذیبی ماحول کے پروردہ تھے۔ ان کے لیے پاکستان کا سفر اجنبی سرزمین کا ایک تنہا سفر تھا۔ اپنی بیوی، اپنے بیٹے، بھائی اور دوسرے رشتہ داروں کو چھوڑنے کا اُن کا فیصلہ خود ان کے لیے بڑا تکلیف دہ اور اذیت ناک تھا۔ کراچی کیوں؟ لکھنؤ کیوں نہیں؟ تعلقہ داری، محل، قلعہ اور امام باڑہ سب کچھ چھوڑ کر ایک ایسی سرزمین میں کیوں رہا جائے جو ان کی اپنی نہیں تھی؟ سوال کا جواب صرف اور صرف راجہ صاحب کے پاس تھا۔ اگرچہ وطن چھوڑ کر جانے والے اور بھی تھے۔ ہزاروں افراد اسلام اور مسلمانوں کی تخیلی جنت پاکستان جانے والے قافلوں میں شامل ہوگئے۔

کچھ ہی دن قبل، عزیز، جگ موہن اور پردیپ مسافروں سے بھرے ہوئے ریل کے ایک ڈبے میں بیٹھ کر آزاد ہندستان کی راجدھانی گئے تھے۔ وہاں انھوں نے دریاگنج کے علاقے میں، کہ جہاں ہندستانیوں کو 1925 کے بعد ہی رہنے کی اجازت ملی تھی، ایک ہوٹل میں قیام کیا اور بڑے جوش و خروش اور مسرت کے ساتھ جشن آزادی کی تقریبات میں شریک ہوئے۔ انھوں نے متعدد جلسوں میں شرکت کی اور 16/ اگست کو لال قلعے پر ہونے والے عوامی جلسے میں خاص طور پر شریک ہوئے۔ اخباروں میں واقعات کی خبریں پڑھیں، آل انڈیا ریڈیو پر خبریں سُنیں، 18/ اگست والی نہرو کی وہ تقریر سنی جس میں انھوں نے پانچ دریاؤں کی آفت زدہ سرزمین کے

باسیوں سے صبر و سکون سے رہنے اور امن و شانتی برقرار رکھنے کی اپیل کی تھی۔

ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے لوگوں کے ان ہجوموں سے بھی وہ بہت متاثر ہوئے جن میں شامل ہر ہر فرد کی پیشانی پر ایک روشن مستقبل کے یقین کی چمک تھی۔ ماہ اگست کے سورج کی طپش نے اگرچہ انھیں نڈھال کردیا تھا مگر ان کے جوش و خروش میں کمی نہیں آئی۔ نوجوانوں اور بوڑھوں نے، سب ہی نے موسیقی کی دھنوں پر رقص کیا، گیت گائے اور نعرے لگائے۔ فضا 'بھارت ماتا کی جے' اور 'بندے ماترم' کے پرجوش نعروں سے گونج گئی۔ دریا گنج کی ایک گلی سے جہاں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا گھر "دارالسلام" تھا کچھ بچوں کے گانے کی آواز آئی، "سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"۔ کسی نے کہا کہ گھر کا وہ فوارہ خشک ہوگیا ہے جس کے پاس بیٹھ کر گاندھی جی نے 1931 میں وائسرائے لارڈ اِروِن سے اپنی گفتگو سے قبل اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورہ کیا تھا۔ کسی اور نے اطلاع دی کہ گھر بکنے والا ہے۔ گاندھی جی نے 13/ ستمبر کو اپنی پرارتھنا سبھا میں کہا کہ یہ کیسی شرم کی بات ہے کہ ڈاکٹر انصاری کی بیٹی زہرہ اور ان کے شوہر شوکت اللہ انصاری کو ہندوؤں اور سکھوں کے حملوں سے خوفزدہ ہوکر گھر چھوڑ کر ایک ہوٹل میں رہنا پڑا۔ گاندھی جی نے تھوڑی بہت اردو، جو انھیں آتی تھی، زہرہ انصاری سے سیکھی تھی۔

شہر کی مصروف سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے عزیز، جگ موہن اور پردیپ ان بچھڑے ہوئے ہندو اور سکھ پناہ گزینوں سے ملے جن کے گھر تباہ ہوچکے تھے، جن کے دوست احباب اور رشتہ دار مسلمانوں کے مشتعل ہجوموں کے ہاتھوں قتل کیے جاچکے تھے۔ جذبات قابو سے باہر ہونے کی حد پر آچکے تھے۔ لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے ان تینوں کو نہ تو مذہبی تفریق کا کوئی احساس تھا اور نہ ہی ملک کی تقسیم سے آنے والی جراحت کا کوئی اندازہ۔ ان کے شہر میں تو کبھی کبھی ہندو مسلم نہیں شیعہ سنی جھگڑے ہوجاتے تھے۔ 1947ء میں دونوں فرقوں کے مابین تعلقات کشیدہ تھے مگر تلخ نہیں تھے۔

محرم میں جب چوک سے تعزیے کربلا جاتے تو پردیپ کی اماں تعزیوں کے ساتھ ننگے پاؤں کربلا تک جاتیں، عاشورے کے دن، دوسرے شیعوں اور سنیوں کی طرح روزہ رکھتیں۔ عبدالحلیم شرر نے لکھا ہے کہ گلیوں میں جب دل ہلا دینے والے مرثیوں اور ان کے ساتھ ہونے والے بین کی آوازیں آتی تھیں تو ہندوؤں کے گھروں میں بھی سناٹا چھا جاتا تھا۔ عزیز کا خاندان ہر تہوار کے موقع پر، پردیپ کے گھر جاتا، اُس کے لڑکے اور لڑکی کے لیے مٹھائیاں اور تحفے لے جاتا۔ ہولی اور دیوالی بھی اس کے کلینڈر میں خاص دن تھے۔

جب یہ تینوں، دہلی کالج، شمالی ہندستان کے مسلمانوں کے نشاۃ ثانیہ کی زندہ علامت کے شاندار دروازے کے قریب پہنچے تو سوچنے لگے کہ یہ کیا ہے جو غلط ہوگیا ہے، کیا بگڑ گیا ہے، لکھنؤ اور دہلی میں ، لاہور اور کلکتے میں بلکہ ہر جگہ۔ اخباروں سے معلوم ہوا کہ باپو کلکتے میں ہیں، دہلی میں نہیں؟ آخر کیوں؟ "ہندستان ٹائمز" نے جو وہ روز ہی پڑھتے تھے، قتل و غارت گری اور بھیانک تشدد کے واقعات کی خبر دی۔ دہلی کے کئی محلے نذر آتش کردیے گئے تھے۔ وہ محلے جہاں ہندو اور مسلمان صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ لال قلعے سے تھوڑی ہی دور ریلوے اسٹیشن پر ہزاروں پناہ گزینوں کا مجمع تھا۔ یہ لوگ لٹے گھر بار اور تلخ یادوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور زبانوں پر آتش زنی، لوٹ مار، عصمت دری اور کشت و خون کی کبھی نہ ختم ہونے والی کہانیاں تھیں۔ کہانیاں جو عزیز نے نازی جرمنی کے بارے میں پڑھی تھیں۔ اسی حضرت نظام الدین اسٹیشن سے ٹرینیں پاکستان کی طرف جاتی تھیں، نفرت اور انتقام کے پیشہ وروں کے پھیلائے ہوئے موت کے جالوں کی طرف۔ ان میں سے کچھ ٹرینیں اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتی تھیں اور کچھ واہگہ بارڈر سے پہلے ہی قتل و غارت گری اور بربریت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ موت کا آسیب ہر جگہ چھایا ہوا تھا۔

گاندھی اور نہرو نے اس تعصب اور انتقام کے خلاف اپنی آواز بلند کی، مگر ان کے ساتھی سردار پٹیل کے ذہن میں کچھ اور ہی تھا۔ افسوس ہے کہ عمر نے بھی ان

کی ادعائیت اور ان کے تکبر کو کم نہیں کیا تھا۔ جارحانہ خوداعتمادی سے سرشار انھوں نے اقلیتوں کے اعتماد اور بھروسے کو قائم رکھنے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اس کے برعکس انھوں نے مسلمانوں کے پاکستان جانے کی ہمت افزائی کی اور اجڑے ہوئے لوگوں کی باز آبادکاری کہاں اور کیسے ہو اس پر بھی پابندیاں عائد کردیں۔ جب ہزاروں میواتیوں کی باز آبادکاری کا مسئلہ سامنے آیا تو ان کی پریشانی ان اجڑے ہوئے لوگوں کی حالت زار نہیں تھی، اس کے بجائے ان کے سامنے مسئلہ یہ تھا جیسا کہ انھوں نے راحت اور آبادکاری کے وزیر کو بتایا تھا کہ خالص مسلمانوں کے گاؤں، اور ایسے گاووں کی ایک پٹی کے قیام سے کس طرح بچا جائے۔ خود راجدھانی میں امن و قانون کے رکھوالوں، کہ جن کا سربراہ وزیر داخلہ تھا، کی ناکوں کے نیچے جرائم ہوتے تھے۔ جس میں مشرقی پنجاب سے گئے ہوئے مسلمان پناہ گزینوں کی چھوڑی ہوئی املاک کے بدلے یہاں مسلمانوں کے گھروں پر ہندو اور سکھ شرنارتھیوں کے زبردستی قبضے بھی شامل تھے۔ ستمبر 1947 میں لٹیروں کے بڑے بڑے گروہوں نے لٹین (Lutyen) کے بنائے ہوئے مدور بازار کناٹ سرکس میں مسلمانوں کی متعدد دوکانیں لوٹ لیں۔ 3 اور 6 دسمبر کے درمیان دہلی اور اس کے آس پاس پانچ سو افراد، جن میں زیادہ تر مسلمان تھے، مارے گئے۔

عزیز، جگ موہن اور پردیپ کو گاندھی جی کا وہ کرب یاد ہے جس کا اظہار انھوں نے اپنی ایک پرارتھنا سبھا میں کیا تھا۔ انھوں نے کہا تھا:

> "رات کو میں نے ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے کی آواز سنی، ایسی بارش سے عام طور پر راحت ملتی ہے، مگر میرا دھیان ان ہزاروں پناہ گزینوں کی اور گیا جو دہلی میں کھلے کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں، میں چاروں طرف سے سورکشت ایک برآمدے میں آرام سے سو رہا تھا۔ مگر سوچ رہا تھا کہ اپنے بھائی کے خلاف آدمی کے ظالم ہاتھ اگر نہ ہوتے تو ہزاروں مرد، عورتیں اور بچے کھلے آسمان کے نیچے نہ ہوتے اور بھوکے پیاسے نہ ہوتے۔ بہت سی جگہوں پر تو یہ لوگ گھٹنے

گھٹنے پانی میں بھی ہوسکتے ہیں۔ کیا یہ سب ضروری تھا؟ اندر
سے جو جواب ملتا ہے وہ تو صرف ایک زوردار 'نہیں' ہے۔
کیا آزادی کا، جو ابھی ایک مہینہ کا بچہ ہے، پہلا پھل یہی
تھا؟ پچھلے بیس گھنٹوں میں ان ہی خیالات نے مجھے گھیرے
رکھا ہے۔ میرا مون (خاموشی) ایک وردان رہا ہے۔ اس نے
مجھے خود اپنے ضمیر سے سوال کرنے کا موقع دیا ہے۔ کیا دہلی
کے سب ہی لوگ پاگل ہوگئے ہیں؟ کیا ان میں انسانیت کی
کوئی رمق نہیں بچی ہے؟ کیا ملک کی محبت اور اس کی آزادی
سے ان کو اب کوئی تعلق نہیں رہا ہے؟

یہ آزادی اپنی جلو میں اتنا دکھ، اتنی نفرت اور اتنی پریشانیاں کیوں لائی؟ دوسرے ان کی طرح رواداراور ایک دوسرے کی اقدار و روایت کا احترام کرنے والے کیوں نہیں تھے؟ یہ خاندانوں اور دوستوں کی اذیت ناک علاحدگی کیوں؟ ان کی دوستی کو کیا ہوا، ان کی برادریوں کا تانا بانا کہاں گیا وہ طبقاتی یکجہتی، جس کا تذکرہ مارکس نے بڑی تفصیل سے کیا ہے کیا ہوئی؟ تقسیم کیوں؟ یہ نہرو، آزاد اور پٹیل، سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا[1] کی چیر پھاڑ پر خاموش کیسے رہے؟ اختلاف کے یہ بیج کہا

---

[1] سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں — سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا
پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا — وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا
گودی میں کھیلتی ہیں اس کی ہزاروں ندیاں — گلشن ہے جن کے دم سے رشک جناں ہمارا
اے آب رود گنگا وہ دن ہے یاد تجھ کو — اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا
یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دور زماں ہمارا
اقبالؔ کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا
(اقبال)

استعماری حکومت نے بوئے تھے؟ اگر ایسا ہے تو ایک قدیم تہذیب کے وارثوں نے انھیں ایسا کرنے کیوں دیا؟ دوسرے الفاظ میں 'بانٹو اور حکومت کرو' (Divide and Rule) کی پالیسی پر عمل درآمد کیسے ہوا؟ کیا ہندستان کے عوام اتنے توانا اور مضبوط نہیں تھے کہ وہ ملک و قوم کو متحد اور خود اپنے گھر کو سلیقے سے رکھ سکتے؟ یا پھر اِن کے اُن لیڈروں نے انھیں چھوڑ دیا جنھوں نے ایک سیکولر سماج کے نظریے کو عملی جامہ نہیں پہنے دیا؟ یا شاید یہ نظریہ خود ہی الجھا ہوا تھا جیسا کہ محمد علی جناح اور ہندو قوم پرستی نے بہت خوش ہوکر دنیا کے سامنے اعلان کیا تھا۔ کون جانے؟ نہرو کے پسندیدہ موضوعات ہمہ ثقافتیت اور سیکولرزم کہاں گئے؟ آخری تجزیے کے طور پر کیا ملک ان تخصیصی اور ثقافتی رجحانات کو جھیلنے کے لیے پورے طور پر تیار نہ تھا؟ اگر نہیں تھا تو پھر گوتم بدھ، اشوک، اکبر اور گاندھی کے ہندستان کے لیے پردۂ غیب میں کیا ہے؟

جگ موہن اور پردیپ کو ان سوالوں نے ہفتوں نہیں مہینوں پریشان و مضطرب رکھا۔ حقیقت جاننے کے اپنے جوش میں انھوں نے حضرت گنج کے یونیورسل بک ڈپو سے کتابیں خریدیں اور رات بھر بیٹھے پڑھتے رہے۔ تاریخ کے بارے میں کچھ بہت نہ جاننے کے باوجود وہ جیمس مِل کی ہسٹری آف برٹش انڈیا اور ای تھامس اور جی ٹی گیرٹ کی کتاب رائز اینڈ فُل فِل منٹ آف برٹش رُول اِن انڈیا میں استعماری تعصب سے ڈرے سہمے ضرور۔ کیمرج ہسٹری آف انڈیا معلوماتی تھی مگر انتہائی دقیق۔ آر سی موجمدار، ایچ سی رائے چودھری اور کے کے دتّہ کی کتاب این اڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا، مسخ شدہ واقعات اور غلط بیانیوں سے بھری ہوئی تھی۔ واحد کتاب جس کے پڑھنے میں انھیں لطف آیا وہ تھی تارا چند کی انفلوائنس آف اسلام آن انڈین کلچر۔

ایک دن سہ پہر کے وقت پردیپ نے جگ موہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، "جگ، ان میں سے بہت سے تاریخ داں ماضی کی زبان میں بات کرتے ہیں بلکہ عموماً فرسودہ زبان میں۔ ڈاکٹر تارا چند ایک استثنیٰ ہیں، میں ان کے وسیع نقطہ نظر سے اتفاق کرتا ہوں، کیوں نہ ہم اپنے تاریخ داں دوست سے رجوع کریں؟"

تینوں دوست ہفتے میں ایک یا دو بار ملتے اور گھنٹوں باتیں کرتے، بے شمار چائے کی پیالیاں ختم کرتے اور کلیجے اور کباب کھاتے۔ اُس اتوار وہ چوک میں ملے۔ سورج ابھی ابھی ڈوبا تھا اور اکتوبر کی ٹھنڈی ہوا نے ان کی روحوں میں تازگی اور نئی زندگی پھونک دی تھی۔ لکھنؤ کے شرفا کے رفاہ عام کلب سے گزرتے ہوئے انھوں نے نئی لگائی ہوئی گھاس کو سبزی مائل ہوتے دیکھا، درختوں میں نئی کونپلیں پھوٹتی اور کلیوں کو کھلتے ہوئے دیکھا۔ پردیپ اپنی ظاہری سج دھج کے بارے میں عموماً لاپرواہ رہتا تھا، وہ اکثر بے استری کے سوٹ، شکنیں پڑی ہوئی قمیصوں اور بے جوڑ رنگ کے موزوں میں ہی گھر سے باہر چل دیتا تھا۔ اس شام وہ اپنی نیلی شیروانی میں بڑے سلیقے سے ملبوس تھا۔ "پائنیر" اخبار اس کے ہاتھ میں تھا جسے اس نے ابھی تک پڑھا نہیں تھا کہ اچانک بغیر کسی تحریک یا ترغیب کے اس نے بولنا شروع کردیا۔

"یہ تاریخ داں بھی کیا بکواس کرتے ہیں! ہم انگریزوں کو کیوں دوش دیں؟"

چائے کی پیالیوں، میٹھے بسکٹوں اور دیر رات پراٹھے کبابوں پر ہونے والی گفتگو کا مرکز انگریزوں کے دور میں تاریخ نویسی کا موضوع تھا۔ بہت سے نام زیر بحث آئے۔ لین پول، ڈبلیو ایچ مورلینڈ اور ونسنٹ اِسمتھ۔ بعد کو گفتگو کا رخ ترکی اور مغل عہد کے جائزے اور ہندوؤں پر جزیہ دینے کی پابندی، مندروں کی شکست و ریخت، جبری قبولِ اسلام اور سلطان محمود غزنی اور اورنگ زیب اور غیر مسلموں کے خلاف جہاد کرنے کے الزام کی طرف مڑ گیا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ پردیپ کو بہرحال یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی تھی کہ آخر محمد بن تغلق، کشمیر کے زین العابدین اور دکن کے متعدد ان حکمرانوں کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا جنھوں نے بہتر نظام چلایا۔ آرٹ اور تخلیقی ادب کی سرپرستی کی اور دوسرے لوگوں کے مذہبی عقائد و رسوم کا احترام کیا۔

"بالکل درست" جگ موہن نے نہایت خوش دلی سے اتفاق کیا، "ہمارے رنجیت سنگھ ایسے ہی تھے۔ فقیر عزیزالدین ان کے وزیراعظم تھے۔"

عزیز نے بغیر کچھ بولے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"جیسا کہ تم جانتے ہو" پردیپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "ہم کائستھ ہیں، میرے پتاجی فارسی، اردو اور ہندی پڑھتے ہیں اور امیر خسرو، ملک محمد جائسی، کبیر، رحیم اور رَس خان کا کلام سناتے ہیں۔ آخر ان سب کے بارے میں ہم اپنی تاریخ کی کتابوں میں بات کیوں نہیں کرتے؟ میں نے اُن سے معین الدین چشتی اور نظام الدین اولیا کے بارے میں سنا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب فرقہ پرستی عام ہے، ان ہی کے محبت اور انسانیت کے پیغام کو وسیع پیمانے پر پھیلانا چاہیے۔"

جگ موہن نے سر ہلایا، "صرف اِسی وقت کیوں؟ ایک ہمارے جیسے وسیع اور متنوع سماج میں، ہمیں فرقوں کی باہمی ہم آہنگی کے تذکروں کو چھیڑنے کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ جینیوں اور بدھ متیوں کے خلاف برہمنوں کی جارحیت یا مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں ہونے والی مندروں کی شکست و ریخت کی کہانیوں کو دہرانے سے کیا حاصل؟ Syncretism اور Pluralism جیسے بھاری بھرکم الفاظ میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔" مگر میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ تنوع میں اتحاد و یک رنگی واحد نصب العین ہے جو ہماری عوامی زندگی میں ہمیشہ ہمارا رہنما ہونا چاہیے۔ بصورت دیگر مجھے ڈر ہے کہ ہم ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے گر پڑیں گے۔"

"تکلف بر طرف، سچ تو یہ ہے کہ مجھے متعصب تاریخ دانوں کی تحریروں اور لکھنؤ میں مسلم لیگیوں کے بیانات میں کوئی فرق نہیں دکھائی دیتا۔ دونوں ہی متعصب بھی ہیں اور تنگ نظر بھی۔" عزیز نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

"یار، شکر ہے کہ تم بولے تو۔ آج کل تم عموماً خاموش رہتے ہو۔" پردیپ نے ٹنڈے کا چوتھا کباب ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ارے جگ، تم نے اس کشمیری چائے کا کیا حشر کردیا؟"، عزیز خوش مذاقی سے بولا۔

"تم اتنے ذہین ہو" پردیپ نے اضافہ کیا، "اپنے خیالات و نظریات میں اتنے متوازن ہو، تمھاری معلومات بھی ہم سے زیادہ ہے، مزید یہ کہ تمھارا شمار

صفِ اوّل کے تاریخ دانوں میں ہوتا ہے پھر آخر اپنے خیالات سے ہمیں آگاہ کیوں نہیں کرتے، ان میں ہمیں شامل کیوں نہیں کرتے ہو؟"

عزیز نے شرماتے ہوئے اپنا چشمہ اتار لیا اور بولا۔

"ہاں، ٹھیک ہے، میرا خیال ہے کہ شاید دو تین برس ہوئے، فرانسیسی تاریخ داں Fernand Braudel نے سوال کیا تھا کہ کیا اپنے فرائض اور اپنے بے پناہ اثر و رسوخ کا شعور رکھنے والے الوالعزم مورخین کے بغیر تاریخ کا کوئی مطالعہ ہو سکتا ہے۔ ایڈمانڈ فارال (Edmond Faral) کے تاثرات کا حوالہ دیتے ہوئے Braudel نے مزید اضافہ کیا ہے کہ عظیم تاریخ کا یہ خوف کہ یہ پھر اپنے کو دُہرا نہ دے، ہی تھا جس نے عظیم تاریخ کا قتل کیا۔"

گفتگو میں جب بھی کوئی نام آیا، جگ موہن کی آنکھیں انتہائی متوجہ ہونے کی وجہ سے نیم وا رہ گئیں۔

"مجھے اب جانا چاہیے" عزیز نے اچانک کہا۔ اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور جلدی سے ناک پر چشمے کو درست کیا، "ہاں ننّے بھائی (سجاد ظہیر) کل لکھنؤ آرہے ہیں۔ ہمارے شعلہ بیان مقرر کمیونسٹ نیتا شفیق نقوی اور ان کے پرجوش پیرو انور جمال قدوائی نے ان کے لیے ایک جلسے کا اہتمام کیا ہے۔ پولیس اور سی آئی ڈی والوں سے بات کرنا ہے۔ یہ حضرات بہرحال پرانے پاپی ہیں اور ہر حکومت کے لیے، وہ چاہے بدیسی ہو یا دیسی، آنکھ کا تنکا ہیں۔ کیا تم نے نہرو کے اپنے سوشلسٹ اور کمیونسٹ سابق ساتھیوں کے بارے میں حقارت آمیز اور ناقابل قبول کلمات نہیں پڑھے؟ بہرحال کیا تم اپنے تاریخ کے مطالعے کا سلسلہ بدستور چلا رہے ہو؟ یہ کتابیں جو تم نے خریدی ہیں ان میں تو کافی پیسے لگ گئے ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ یہ اُس قسم کی کتابیں نہیں ہیں جن پر اکبر الٰہ آبادی نے پابندی عائد کردی ہوتی۔ یعنی

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

پردیپ نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔

"پیسے کا معاملہ نہیں ہے"، اس نے بڑے مہذب انداز سے کہا، "مسئلہ ہے ہمارے خوفناک جہل اور ناواقفیت کا۔ دہلی کے سفر کے بعد احساس ہوا کہ خود اپنے وجود کے قیام اور اپنی اقدار کے تحفظ کے لیے ماضی سے رابطہ رکھنا کتنا اہم تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے اگر ہم میں سے ایک انجینئر ہے، یا ایک ڈاکٹر۔ ہمیں بھی اپنے لیے جگہ پیدا کرنی ہوگی اور اس کے لیے ہمیں خود اپنی تاریخ سے متعارف ہونا ہوگا۔ ادھر کچھ دنوں سے میں سنجیدہ کتابیں پڑھ رہا ہوں، جن میں برٹرانڈ رسل کی Sceptical Essays بھی شامل ہے۔ کل میں نے امین آباد میں پرانی کتابوں کی ایک دوکان سے ٹوائن بی کی کتاب 'اے اسٹڈی آف ہسٹری' کا پہلا اڈیشن خریدا ہے۔

شام کے ڈھلنے کے ساتھ اور دوست آنے لگے، ان میں ہمایوں بھی تھا۔

"حضرات حسن اتفاق دیکھیے"، ہمایوں نے جو اپنی والدہ کو لکھنؤ میں کسی ڈاکٹر کو دکھانے لایا تھا، اعلان کیا، "کہ میں نے بھی Braudel کی کتاب خریدی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ساحل پر ریسرچ کرنے والے سمندر اور اس کی پیچیدگیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے"۔ "اکثر مصنفین" اس کے کہنے کے مطابق چند شہزادوں، چند امراء کے قول و فعل اور ماضی کے غیر اہم اور سطحی واقعات ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہ ساحل کی زندگی کی عظیم تحریکوں کو نظرانداز کرتے ہیں۔ Braudel کی خود اپنی دلچسپی تاریخ کی آہستہ خرام اور توانا پیش رفت کو منکشف کرنے میں ہے۔"

"عزیز بھائی، آؤ ہم تاریخ کی آہستہ خرام اور توانا پیش رفت کی کیفیت کو محسوس کریں۔ آؤ آؤ، رات جوان ہے۔ تم بھی اپنی موقر و مستند رائے دو"۔ پردیپ نے اصرار کیا، "گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے۔"

عزیز مسکرایا اور اس سے پہلے کہ جانے کے لیے اٹھے، جگ موہن نے اس کے ہاتھ میں چائے کی ایک اور پیالی تھما دی۔

شکریہ، عزیز نے زیر لب کہا۔

"ایک منٹ" یہ کہتے ہوئے پردیپ سامنے سے گزرتے ہوئے اپنے دوست کو ہیلو کہنے کے لیے اٹھ گیا۔ واپسی پر چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی، "تم نے جو مصرعہ پڑھا وہ فیض احمد فیض کا ہے۔ ہے نا؟ میں نے انھیں ایک دفعہ سنا ہے، ان کے ساتھ جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور مجاز بھی تھے۔ جوش نے جو اشعار سنائے تھے وہ مجھے آج بھی یاد ہیں۔

پھولوں کی اگر ہوس ہے خاروں کو نہ دیکھ
عشرت کی ہے دُھن تو سوگواروں کو نہ دیکھ
تعمیر حیات ہے پیش نظر
مڑکر بھی مٹتے ہوئے مزاروں کو نہ دیکھ

جس مشاعرے میں اس نے یہ اشعار سنے تھے، اس کے سحر میں ایک بار پھر گھر کر اس نے بڑے جذباتی انداز میں اردو ادب کو انقلاب اور آزادی کا ادب قرار دیا اور بتایا کہ کس طرح ہندستان اس حیات بخش چشمے سے سیراب ہوتا رہا ہے۔ اردو کے، جارحانہ ہندی پرستی کا شکار ہونے پر اسے طیش تھا، اُس نے اس بات پر بھی دُکھ کا اظہار کیا کہ میر، غالب اور اقبال کی زبان آج کس طرح صرف مسلمان بستیوں کے گلی کوچوں میں سسک سسک کر زندہ ہے۔

ہمایوں نے سگریٹ سلگائی، ایک لمبا کش لیا، نتھنوں سے دھواں نکالا اور بولا، "خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے"۔

"واہ واہ"، کسی قدر افسردہ لہجے میں جگ موہن نے تعریف کی۔ "بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ایسی متمول ادبی وراثت والی ایک خوبصورت دیسی زبان کس طرح خود ہمارے صوبے میں بغض و عداوت کا شکار ہوئی ہے۔ اردو بولنے میں کائستھوں، کشمیری پنڈتوں اور پنجابیوں کی روانی دیکھو۔ تو پھر آخر اردو پر صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کا الزام کیوں؟ ہم مشترکہ تہذیب کی، کمپوزٹ کلچر کی بات کرتے ہیں، مگر پھر بھی یہ کھدر دھاری دائیں بازو کے کانگریسی اس کی زہر آلود مخالفت کرتے ہیں۔ کیا

ہوا گر اردو بولنے والوں کے کسی حلقے نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت کردی؟ بہت سے پنجابی اور بنگالی بولنے والوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا، تو پھر صرف اردو ہی کیوں ہدف بنے؟ کیا یہ ہمارے ثقافتی ورثے کا حصہ نہیں؟"

"حضور"، ہمایوں نے بڑے فخریہ انداز میں وضاحت کی، "آپ عوام کے دلائل کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور ماچس کی تیلیوں سے بنے ہوئے محل کی طرح مسمار کردیتے ہیں۔

اپنی ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے پردیپ بولا، "You're on"

"کیوں؟" عزیز نے سوال کیا، "کیا ہم غالبؔ کو بھول گئے ہیں؟ اس نے تو مسلمان سامعین یا اردو جاننے والے قارئین کے لیے نہیں لکھا۔ ایسی تفریق اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ مذہبی اصولوں اور عقیدوں اور روایت پرستی کی پابندیوں سے اپنے آپ کو آزاد رکھنے پر انھیں فخر تھا۔ اور اسلام کے ظاہری آداب و رسوم کے لیے ان کے دل میں کم ہی جگہ تھی۔ بنارس میں ہولی کے جشن دیکھ کر وہ مسرور ہوگئے تھے اور ہندوؤں کے اس مقدس شہر کو ہندستان کا مکہ قرار دے دیا تھا۔

"تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو"، ہمایوں نے اعلان کیا، "ان کی اس وسیع النظری کا ثبوت منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام ان کا وہ خط ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ وہ ساری نوع انسانی کو اپنا رشتہ دار اور تمام مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں کو اپنا بھائی گردانتے ہیں۔ انھوں نے نہ تو فرقہ بندی کا کوئی طعنہ لگایا اور نہ ہی فرقہ پرستی کا کوئی انداز اپنایا۔ 15/ فروری 1869 میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے جنازے میں بے شمار ہندوؤں، مسلمانوں، شیعوں اور سنیوں نے شرکت کی"۔

"اپنے موضوع پر دوبارہ لوٹتے ہوئے" کچھ سہمے سہمے تبسم کے ساتھ عزیز نے کہا، "میرا خیال ہے کہ یہ بات صاف کردینا چاہیے کہ غالبؔ ہی کی طرح میں بھی کسی شیعہ یا سنی حربے کی پیروی نہیں کرتا ہوں۔ مجھے بھی مسلم دانش ور یا مسلم تاریخ داں کہلانا بالکل پسند نہیں ہے۔

ہمایوں نے ایک اور سگریٹ سلگائی، "اس کا کیا مطلب ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"ایک دفعہ مرزا غالبؔ آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بکھرے ہوئے تاروں میں ایک صریح انتشار اور بے ترتیبی دیکھ کر انھیں بڑی حیرت ہوئی، اس وقت انھوں نے کہا، "خود مختار کے کسی کام میں نہ تو کوئی جواز ہے اور نہ ہی کوئی سبب، ستاروں ہی کو دیکھو سراسر بدنظمی — نہ کوئی تناسب نہ کوئی نظم نہ کوئی معنی نہ کوئی مفہوم نہ ہی کوئی مرتب شکل۔ ان کا حکمراں، بہرحال، اقتدارِ مطلق رکھتا ہے اور کوئی اس کے خلاف ایک حرف زبان سے نہیں نکال سکتا۔" جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟

عزیز ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا، "کیا تم نے الہٰ آباد میں آر پی ترپاٹھی کا نام سنا ہے؟ کیا انھیں کوئی 'ہندو مورخ' کہتا ہے؟ تو پھر علی گڑھ کے محمد حبیب کو ایک مسلمان تاریخ داں کی حیثیت سے کیوں دیکھا جائے۔ اگرچہ ان کے بہت سے اعزاء بشمول خلیق الزماں پاکستان چلے گئے ہیں مگر ان کے والد محمد نسیم لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ حبیب صاحب کے بھائی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد مجیب ہیں۔ وہ دہلی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پڑھاتے ہیں۔ جامعہ وہ ادارہ ہے جسے علی برادران، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری نے قائم کیا۔ ایک زمانے میں محمد علی اور شوکت علی کے نام زبانوں پر چڑھے ہوئے تھے۔ ان کے دماغ نئے نئے خیالات اور نادر تجویزوں سے بھرے رہتے تھے، اگرچہ ان میں سے خاصی ناقابلِ عمل بھی ہوتی تھیں۔ تحریک خلافت کے زمانے میں یہ دونوں گاندھی جی کے دوست تھے۔ اس زمانے کا مقبول گانا تھا۔

بولی اماں محمد علی کی — جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔

عزیز نے اپنی بات ایک طویل وقفے کے بعد شروع کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو مولانا آزاد کے ایک نیشنلسٹ مسلمان کہے جانے پر بھی اعتراض ہے۔ کیا آپ

پنڈت نہرو کو ایک نیشلسٹ ہندو کہیں گے؟

چائے کی پیالیوں کی کھڑکھڑاہٹ میں قہقہوں کی آواز بھی شامل ہوگئی۔ ہمایوں نے ایک لمبا کش لیا، سگریٹ کی راکھ اپنے پیروں کے پاس جھاڑ دی۔

عزیز کچھ سوچنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس غوروفکر کے بعد اس نے mindset کی بات کی، ان تعصبات کا تذکرہ کیا جو اس کے طالب علموں نے اپنے والدین سے ورثے میں پائے تھے اور عہد وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کی اس مسخ شدہ تصویر کا ذکر کیا جو ان کے ذہنوں میں بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے اپنے نظریاتی میلانات کے مطابق طرح طرح کی دیواریں کھڑی کرنے اور ہندستان کی تاریخ کو ہندو، مسلم اور برٹش (کرسچن نہیں) ادوار میں تقسیم کرنے کا الزام تاریخ دانوں پر لگایا۔ اس کا کہنا تھا کہ تاریخ کی اس طرح کی ادوار بندی الجھاؤ پیدا کرتی ہے۔ اس انداز فکر نے ان الگ الگ مذہبی فرقوں کے خیال کو تقویت پہنچائی جنھیں سیاسی، سماجی اور قانونی مقاصد کی خاطر ہندستانی سماج کی الگ الگ اکائیوں کی طرح پیش کیا گیا۔ ہندو اور مسلمان کی عام اصطلاح کا استعمال بھی غلط تھا۔ اس کا خیال تھا کہ واقعات کا تجزیہ محض ہندو یا مسلمان کے نام سے پہچانے جانے والے گروہوں کے باہمی تفاعل کی بنیاد پر کرنا صحیح نہ ہوگا۔

مختصراً اس کا کہنا یہ تھا کہ ہمیں مذہبی فرقوں کی آہنی حدود میں محصور ہوکر نہیں سوچنا چاہیے۔

"مجھے بتاؤ" عزیز نے پوچھا، "کیا میں اور تم دو مختلف قوموں کی نمائندگی کرتے ہیں؟ جناح کو خود اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ تجربے سے یہ بات جاننا چاہیے تھی کہ لوگوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے میں ذات، مذہب سے بھی زیادہ موثر ہتھیار ہے۔ انھیں یہ بھی جاننا چاہیے تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی باہمی اشتراک و تعاون کی ایک طویل تاریخ کے وارث رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو مختلف قومیں کیسے بن گئے؟ خود مسلمان کب ایک ہم آہنگ کُل رہے ہیں؟ اُس شیعہ و سنّی فسادات کے

بارے میں کیا خیال ہے جس نے خود ہمارے شہر کو کتنی بار ہلا کر رکھ دیا ہے؟ ایک اسلامی ریاست کی وکالت کرنے والے کیا مسلمانوں کو تقسیم کرنے والے علاقائی، لسانی اور ثقافتی گہرے اختلافات سے واقف نہیں ہیں؟ ہمیں طبقاتی فرق کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ یہ ایسا کیسے ہے کہ رودولی میں ایک تعلقہ دار خاندان کے رکن امّن بھائی اور پاس کی گلی میں رہنے والے قصائی عبدالمنان قریشی ایک ہی مسلمان قوم کا حصہ ہو جاتے ہیں؟

آج ہم جماعت اسلامی کی ان کوششوں کا بڑا چرچا سنتے ہیں جو وہ مسلمانوں کو ہم آہنگ و یک رنگ اور اسلامی بنانے کے سلسلے میں کررہی ہے۔ آخر کس لیے؟

عزیز اپنے یونیورسٹی کے تجربات کی بنیاد پر ابھی مسائل کی وضاحت ہی کررہا تھا کہ ویٹر نے اطلاع دی کہ ہمایوں کے والد صاحب کا ٹیلیفون آیا ہے۔ ہمایوں ٹیلیفون پر بات کرنے کے بعد آیا اور کہا کہ اسے چار باغ ریلوے اسٹیشن جانا ہے۔ ہر شادی اور غم کے موقع پر اپنے والدین کی نمائندگی کرنے والے فرمانبردار بیٹے کو اس کے باپ نے فرخ آباد میں ایک دور کے عزیز کے یہاں ختنے کی ایک تقریب میں شرکت کرنے کا حکم دیا تھا۔ فرخ آباد بہترین عطر بنانے اور کپڑے پر چھپائی کے لیے مشہور ہے۔ اس کی برقع پوش ماں، اپنے بازوؤں پر آدھا درجن کے قریب امام ضامن باندھے، اپنی دو لونڈیوں کے ساتھ سست رفتار پسنجر ٹرین سے ہردوئی کے لیے روانہ ہوگئیں۔

"اس موضوع پر نہرو نے ضرور تقریر کی ہوگی"، جگ موہن نے کہا۔

عزیز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگرچہ نہرو نے کہا تھا کہ اگر قومیت کی بنیاد مذہب ہوتا تو ہندستان میں ایک نہیں متعدد قومیں ہوتیں۔ دو بھائیوں میں ایک ہندو اور دوسرا مسلمان ہوتا، ان کا تعلق دو مختلف قوموں سے ہوتا۔ یہ دونوں قومیں ہمارے اکثر گاؤں میں، مختلف تناسب کے ساتھ موجود رہی ہیں۔ یہ قومیں تھیں بلا سرحدوں کے، ایک دوسرے پر منطبق۔ ایک بنگالی مسلمان اور ایک بنگالی ہندو ساتھ ساتھ رہتے

ہوئے، ایک ہی زبان بولتے ہوئے، تقریباً ایک ہی جیسی رسوم و رواج کو برتتے ہوئے الگ الگ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اگر ایسا تھا تو پھر 'نام نہاد مسلم عہد' سے ممتاز کرنے کے لیے 'ہندو عہد' کی اصطلاح میں کیوں بات کی جائے؟ پھر بھی استعماریت سے قبل کے ہندستان اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندستان کے مابین تسلسل کے جو رشتے ہیں ان کا اعتراف کرنا چاہیے۔ دیہی معیشت کی تنظیم ایک ایسی ہی جہت ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ علم و دانش کے موجود گروہ، مدلل مباحثوں کے اسٹائل اور باہمی رابطوں کے انداز ہی آج معلومات کی نشرو تقسیم اور تلاش و بازیافت کے جدید طریقوں اور شکلوں کا تعین کرتے ہیں۔

تاریخ داں اس بحث میں الجھتے ہیں کہ آیا انگریزی حکومت کی وجہ سے ہندستان میں کوئی اساسی تبدیلی تھی یا نہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مُغل نظام کے پہلو بہ پہلو ابتدائی برطانوی نظام میں خاصی مماثلتیں اور تسلسل نظر آتا ہے۔ سترہویں صدی کے ساتھ یہ مماثلتیں خاصی واضح اور مضبوط تھیں کیونکہ مراٹھوں اور مغرب میں سکھوں کے برعکس بنگالیوں نے صوبائی حکومت کے اعلیٰ ترین عہدوں سے مغلوں کو ہٹایا نہیں تھا۔ انتظامیہ کی طرف دیکھیے تو گورنر اور لفٹنٹ گورنر (حیثیت میں) صوبیداروں کے برابر تھے۔ اکبر کے منصب داری نظام اور سول سروس میں بھی کارنوالس (گورنر جنرل 93-1786 اور 1805) کے زمانے سے بڑی حیرت انگیز مماثلتیں ملتی ہیں۔ اونچی تنخواہیں اور وہی نظم و ضبط۔ ہاں، ادائیگی کے طریقے اور تنظیم کے انداز مختلف تھے۔ لیکن اصول میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔ سیاسی اور عسکری خدمات کے بدلے میں جاگیریں اور انعام کے طور پر زمین عطا کرنے کی مُغل روایت بھی جاری رہی، ایسے عطیات کے پانے والوں کو 03-1802 کی مراٹھا جنگ تک اطمینان سے رہنے دیا گیا۔

Ceded and Conquered Pronvices کے برطانوی حکام نے عموماً فردی لگان کے مُغل ماہرین کی پیروی کی۔ بندوبست استمراری کی اساس سترہویں صدی کی مغل حکومت کے طور طریقوں پر ہی تھی۔ تھامس منرو کا رعیت داری نظام

(Ryotwari) مغلوں کے اس ضبط کے نظام ہی کی ایک واضح شکل تھی جو اس نے میسور سے چھینے ہوئے علاقوں میں رائج دیکھا تھا۔

"تسلسل، تسلسل، تسلسل" پردیپ نے اپنے لہجے میں اپنے بس بھر جھنجھلاہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا، "مغلوں کے موجود ڈھانچوں پر سلطنت کی، برطانیہ کی بنیادسازی کے بارے میں سرشاریٔ و مسرت آخر کیوں؟ ہم نے اپنے پچھلے آقاؤں سے ورثے میں جو کچھ پایا جیسے سول سروس وغیرہ، اسے مسترد تو نہیں کردیا، نہیں کیا نا؟ پھر بھی میں اس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ مغلوں سے کلونیل پاور میں تبدیلی کا عمل اتنا ہی آسان اور ہموار ہوسکتا تھا جتنا کہ آپ اور آپ کے قبیلے کے لوگ پیش کرتے ہیں۔

عزیز نے گردن ذرا سی خم کی، لمبی سانس لی اور کسی قدر شعوری انداز میں چاروں طرف نظر ڈالی۔

"معاف کیجیے گا"، پردیپ بھڑ کر بولا، "اگر حکومت برطانیہ اتنی ہی شفیق و مہربان تھی اور اس نے محض چند ہی بڑی تبدیلیاں کی تھیں تو پھر ہمارے لیڈروں اور مصلحوں کو ان کی موجودگی پر ناراضگی کیوں؟ مجھے بتایئے، میں جاننا چاہتا ہوں کہ تلک، گوکھلے، گاندھی جی اور شہید بھگت سنگھ کس چیز کے لیے لڑ رہے تھے؟ غدر پارٹی اور ریشمی رومال والی سازش کاہے کے لیے تھی؟ چمپارن، جلیاں والا باغ، چوری چورا، باردولی اور نمک ستیہ گرہ کس بات کی علامتیں تھیں؟ محض ایک واقعہ، ایک یاد یا محض ایک کنایہ اور استعارہ! آخر کیوں، دیہی اور شہری علاقوں کے ہزاروں عوام نے گاندھی جی کی "ہندستان چھوڑدو" تحریک پر لبیک کہا؟ آخر کیوں؟ اگر وہ آبادکاروں سے مطمئن تھے تو انھیں اس اپیل کو نظرانداز کردینا چاہیے تھا۔

"میں اتفاق کرتا ہوں"، جگ موہن نے اقرار کیا، "اگرچہ عزیز بھائی اٹھارہویں صدی کے بارے میں بات کررہے تھے نہ کہ ان تبدیلیوں کے بارے میں جو قومیت کے عروج کے زیراثر ہورہی تھیں۔ پھر بھی، استعماریت کی تاریخ کو، اس کے

وکیلوں اور اس کے نکتہ چینوں کی خواہشات کے مطابق خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ مزید یہ کہ اپنے آپ کو کسی مخصوص صدی تک محدود کرلینے میں بھی کوئی عقلمندی نظر نہیں آتی۔ ایک طویل المدتی تناظر ہم جیسے لوگوں کے لیے کہیں زیادہ سودمند ہے۔ وقائع نگاری اور تاریخ نویسی ایک مسلسل عمل ہے جو ضروری نہیں ہے کہ کسی اجتماعی فیصلے پر پہنچادے لیکن یہ مختلف تناظر کی روشنی میں ماضی کو سمجھنے میں ہماری بہت مدد کرتا ہے۔"

یہ لوگ دیر رات گئے تک بات کرتے رہے۔

اپنی گھڑی دیکھنے کے بعد عزیز کو احساس ہوا کہ بہتر یہ ہے کہ وہ جاکر شیعہ کالج کے یوم تاسیس کے موقع پر دی جانے والی اپنی تقریر کی تیاری کرلے۔

"تم لوگ اگر مجھے معاف کرو........ اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اعلان کیا، مجھے بہت کام ہے، اپنی تقریر کو تیار کرنے میں مجھے کئی گھنٹے لگیں گے۔ اگر تمھارے سامنے کوئی اور کام ایسا آئے جس میں کہ تم سمجھتے ہو کہ میں تمھاری کچھ مدد کرسکتا ہوں تو مجھے بتا دینا"۔ اس نے پردیپ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

ضرورت پڑنے پر اسے بتانے کا یقین دلاتے ہوئے پردیپ نے کہا، "خدا حافظ" گو یہاں آنے سے پہلے کے مقابلے میں اب وہ زیادہ باخبر تھا مگر ابہام، الجھن اور پریشانی میں کمی نہیں آئی۔

پردیپ اور جگ موہن اپنے گھر گئے اور عزیز اپنے گھر وہ رات گئے تک جاگتا رہا۔

دوسرے دن شیعہ کالج میں اس کی تقریر اچھی رہی۔ جب پردیپ اور جگ موہن یونیورسٹی آئے تو صبح بڑی روشن اور دھوپ بڑی تیکھی تھی۔

عزیز کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے کہ کہیں وہ اپنا خیال بدل نہ دے، جگ موہن نے جلدی سے پوچھ لیا، "ہم کہاں بیٹھ کر باتیں کرسکتے ہیں؟"

عزیز مسکرا دیا۔ وہ اس وقت بے تکلفی اور یارباشی کے موڈ میں تھا، "اوپر،

میرا خیال ہے۔ اوپر میرا آفس ہے۔ چھوٹا سا آفس"۔

عزیز نے سگریٹ بجھائی اور اسے گھاس پر پھینک دیا۔ اور اپنے ہاتھ اپنی نیالی نیلی پتلون کی جیبوں میں ڈال لیے۔ سارے دوست اس کے پیچھے پیچھے زینے پر چڑھ کر اس کے نام کی تختی لگے ہوئے کمرے میں داخل ہوگئے۔ کئی طالب علم دیوار سے ٹیک لگائے اور کئی کمرے سے باہر زمین پر بیٹھے تھے۔ کمرے میں فرنیچر برائے نام تھا۔ اس میں پلائی ووڈ کی ایک میز اور لوہے کی تین فولڈنگ کرسیاں پڑی تھیں۔ عزیز خود میز پر رکھے ہوئے اخباروں کے ایک ڈھیر کے پاس بیٹھ گیا اور اپنے دوستوں کو کرسیوں پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے اور خرافات کا لین دین کرتے رہے۔ پردیپ نے، جو پلتھی مارے بیٹھا ہوا تھا، اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور مشتاق نگاہوں سے عزیز کی طرف مڑا۔

"اچھا تو نئے ہندستان کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے؟" عزیز کی آواز گونجی۔

"میرے بعض ساتھیوں کاخیال ہے کہ اٹھارہویں صدی سے شروع کرنا کچھ بہت مناسب نہیں ہے کہ اٹھارہویں صدی کا زمانہ خود ایک غیر ذمہ دارانہ، جھنجھلاہٹ، طوائف الملوکی اور غلبے اور تسلط کا زمانہ تھا۔ انھیں انحطاط کی کہانی پیچیدہ اور غیرواضح معلوم ہوتی ہے۔"

"کیوں؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اٹھارہویں صدی کا سماج" عزیز نے جواب دیا۔ "انحطاط اور طوائف الملوکی کے اس رسمی stereotype سے کہیں زیادہ متنوع تھا جس کو شروع کے چند انگریز تاریخ دانوں اور کچھ ہندستانی مورخوں نے دوام بخشا تھا۔ پہلی بات تو یہی کہ صوبے علاقائی بنیادوں پر بنی ہوئی اکائیاں تھے جن میں مختلف طاقت ور گروہوں نے اپنے آپ کو مستحکم کرلیا تھا اور محنت (کام گاروں) اور پیداوار پر اپنے اختیار کی پکڑ مضبوط کرلی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ سیاسی لامرکزیت نے شاہی راجدھانیوں سے دور کے علاقوں میں اقتصادی توانائی پیدا کردی اور درباروں (courts) اور حیدرآباد، پونا، ناگپور، گوالیار

اور حیدر علی کے میسور کے امراء و رؤسا کی چھاؤنیوں (camps) کے اطراف بڑے بڑے زرعی اور تجارتی کاروبار کے جزائر سے وجود میں آگئے۔ ٹھیک ہے کہ تبدیلی کے جلو میں اقتصادی اتھل پتھل، کسانوں کی بغاوت، سیاسی تغیر اور بیرونی جارحیت بھی آئی۔ لیکن پھر بھی، سلطنت کے انحطاط اور استعمار کی آمد جیسے سیدھے سادھے خیال کے محدود دائرے سے باہر بھی بہت کچھ ہورہا تھا"۔

عزیز کے ہونٹ بھنچ گئے۔ وہ رنگ پر آرہا تھا۔ "اودھ، بنگال، پنجاب اور وسیع مراٹھا عمل داری سے متعلق مطالعات وسائل کے انحطاط سے زیادہ ان کی از سر نو تقسیم کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ یہ اسٹڈیز اودھ میں مرکزی اور جنوب کے ان اضلاع کے انتظامیہ اور وہاں کی سیاست میں استحکام اور اقتصادی ترقی کا انکشاف بھی کرتی ہیں جو آگرہ اور الہٰ آباد کے صوبوں میں گنگا کے جنوبی کناروں کے قصبات سے منسلک تھے۔ دوسری طرف، ان مقامات میں جاٹوں کی بستیوں کے بسنے کے نتیجے کے طور پر، پنجاب میں زرعی خوشحالی تھی جہاں بیک وقت باقاعدہ بارش، وسیع و عریض دریاگزار علاقے اور زرخیز زمینیں تھیں۔ دوسرے الفاظ میں مغل سماجی نظام کی شکست و ریخت کرنے کے بجائے، اٹھارہویں صدی کے بہت سے حکمرانوں نے، ترقی، احیاء اور حیات نو کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا۔"

عزیز نے چاروں طرف ایک نظر ڈالی، اس کا چہرہ تاثرات سے یکسر عاری تھا۔

پردیپ اور جگ موہن نے اگر عزیز سے ان لوگوں کے بارے میں سوال کیا ہوتا، جنھیں مذکورہ سلسلے میں فائدہ پہنچا تو اس نے انھیں یقیناً یہ بتایا ہوتا کہ زراعتی پیداوار اور تجارت کی ترقی اور وسعت اور لگان کی نسبتاً زیادہ علاقوں میں وصولی نے تاجروں، سرکاری ملازموں اور زمین داروں کو فائدہ پہنچایا۔ اسی کے ساتھ اُس نے اٹھارویں صدی کے سیاسی نظام اور سماج کے اس منظرنامے پر تاریخ دانوں میں اختلاف رائے کی طرف بھی اشارہ کیا ہوتا۔ اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ محض لڑائیوں کی تاریخ کی بنیاد پر ہونے والی روایتی دوشاخی تقسیم رسمی اور ضابطے کی کارروائی تھی تو وہ اتفاق

کرتا۔ مگر اُس نے اسے تسلسل و ترقی کے نظریات کے مقابلے میں، ہندستان کی سماجی اور اقتصادی تاریخ کے حقائق سے معروضی طور پر زیادہ قریب قرار دیا ہوتا۔

ایک ایسے عہد کے مطالعے کے لیے، جب شاہی اختیار کمزور اور غیر محفوظ ہونے کے باوجود، ان سرداروں اور فرمانرواؤں کے لیے اتحاد و معاونت کے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جو اپنے اپنے علاقوں میں اپنے کس بَل کی نمائش کررہے تھے۔ اُسے ایک دہلی مرکز زاویۂ نگاہ سے اختلاف نہ ہوتا۔ پھر بھی یقیناً ایک ایسے سماج کے اقتصادی اور سماجی اسرار کو کھولنے کے لیے جو مختلف طاقتوں (عوامل) کے زیرِاثر بدل رہا تھا، اگرچہ تبدیلی بتدریج تھی، علاقائی مطالعات کی اہمیت کو اس نے اچھی طرح جتا دیا ہوتا۔ اس نے اپنے دوستوں کو یہ بھی بتایا ہوتا کہ یہ وہ کچھ ہے جس کی چند تاریخ داں تفتیش شروع کررہے تھے۔ مثال کے طور پر، یہ لوگ شمال مشرقی پنجاب میں تشکیلِ ریاست کے عوامل کو سمجھنے کی کوشش کررہے تھے جہاں جفاکش اور تندرست جاٹوں کو ذات کی درجہ بندی میں شودروں کی جگہ پہنچا دیا گیا تھا اور وہ اپنی پہچان کو بچانے اور قائم رکھنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔ ایسی تحقیق و تفتیش اس موجودہ بحث میں مدد کرتی ہے کہ آیا یہ رجحانات دہلی میں مغل اختیار و اقتدار کی چالوں سے بے نیاز اور آزاد رہ کر فروغ پارہے تھے یا پھر ان کے پیچھے ذات پات، رشتہ داری اور کلچر کی طاقت ور دیسی روائتیں بھی تھیں۔

'بہر حال فی الوقت' عزیز نے قطعیت کے ساتھ کہا، "یہ کہا جاسکتا ہے کہ انحطاط و خوش حالی کی کوئی ایک تاریخ یا کوئی ایک قسم تمام علاقوں پر منطبق کی جانے والی نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

پردیپ اپنی نوٹ بک کے اوراق کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک دم بولا، "تم کیا کہہ رہے تھے؟، ہندستان کے بارے میں کسی کلیے کا اُس فرضی کہانی کے ہاتھی کی طرح ہونا ضروری ہے جس میں پانچ نابینا آدمی جانور کے جسم کے الگ الگ حصوں کو چھو چھو کر ٹٹول کر ہم نوا ہوگئے تھے"۔

عزیز نے متحیر ہوکر ایک طویل نگاہ پردیپ پر ڈالی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جگ موہن "لائف" میگزین سے پھاڑی ہوئی ایک تصویر کو دیکھ رہا ہے جس میں کاسابلانکا کانفرنس کے موقع پر دھوپ سے روشن ایک باغ میں روزولٹ اور ونسٹن چرچل ایک دوسرے کے قریب بیٹھے ہوئے ہیں۔

"محترم دوست، اس سے پہلے کہ میں آگے بڑھوں، میں آپ سے درخواست کروں گا کہ میری بات کو غور سے سنیے۔

جگ موہن کچھ شرما سا گیا۔

"حضور، معافی چاہتا ہوں"، اس نے دبے دبے کہا۔

عزیز نے اپنے دونوں ہاتھوں کو پھیلایا، شانوں کو جنبش دی، "انگریز فلسفی برٹرانڈ رسل لکھتا ہے کہ تاریخ کو قابل دست رس ہونا چاہیے اور دریافتیں موضوعی رسائل، علمی جریدوں اور غیر مطبوعہ مقالوں میں بند نہیں رہنا چاہئیں۔ اس کا کہنا ہے کہ تاریخ دانوں کے لیے اگر انھیں اپنی سماجی ذمہ داریاں پوری کرنا ہے تو ترکیب و امتزاج کا عمل بہت ضروری ہے اور میں یہی کرنے نکلا ہوں۔"

جگ موہن کچھ بڑبڑایا جس کا مطلب ہم اپنے دوست کے اس جذبے اور لگن پر اس کا حیرت و استعجاب قرار دے سکتے ہیں۔

"کیا تمھارے لیے کوئی معتبر و مستند اور جامع ہندستانی موضوع کام کرنے کے لائق نہیں ہے؟" اس نے بے جھجک پوچھ لیا۔

"نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتا"۔ عزیز نے اپنے خصوصی متوازن انداز میں کہا، "میں استعمار کی توسیع اور اس کے عواقب کے کچھ پہلوؤں کو، ایک گورکھ دھندے کی طرح، انتہائی محنت سے جوڑنے اور بٹھانے کی کوشش کروں گا، میں کسی انوکھی یا نئی پیش کش کا دعویٰ نہیں کرتا ہوں کیونکہ میں تم سے جو کچھ کہتا ہوں وہ زیادہ تر مستند اور مستحکم تاریخ دانوں کی تحریروں پر مبنی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام ختم کرنے کے بعد میں مطالعے کی کتابوں کی فہرست منسلک کردوں۔ یہ میرے طالب علموں کے لیے

بھی مفید ہوگی۔

ایک فاضل مورخ سے تاریخ پڑھنے کے امکانات پر پردیپ کچھ بڑا مشتاق و مضطرب سا لگا۔ "اُو کے۔ یہ بڑا زبردست آئیڈیا ہے۔"

"ٹھیک ہے"، عزیز نے کسی قدر تغافل کے ساتھ دہرایا۔

"کبھی کبھی میرا انداز پیغمبرانہ ہوسکتا ہے کیونکہ میں مستقبل کے تاریخی رجحانات کا ادراک اور ان کی شناخت ان تحریروں کی بنیاد پر کرتا ہوں جو آج لکھی جارہی ہے۔ مثلاً تم ہی دیکھتے ہو کہ سوشل سائنٹسٹ کس طرح استعماریت اور قومیت سے متعلق اپنے نظریات اور اپنی تاویلوں پر نظرثانی کرنے کا آغاز کرتے ہیں۔ پچھلی چند صدیوں میں ہونے والے ہمارے تجربات کی تاویلِ نو کے لیے نئے مدرسہ ہائے فکر وجود میں آئیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم لوگ، انیسویں صدی اور اپنی حالیہ لفظیات و اصطلاحات سے آگے جائیں گے۔ قصہ مختصر میرے عزیز، کمپنی کے زمانے سے لے کر آزادی کی صبح تک کے واقعات کا میرا بیان، واقف قارئین کی بھوک کو تو شاید نہ مٹا سکے، مگر تم، جس نے ابھی کچھ بہت تاریخ نہیں پڑھی ہے شاید .... میں اپنا جملہ پورا نہ کروں گا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی دن میں وہ سب ضبطِ تحریر میں لاؤں جو میں تم سے کہتا ہوں، تم سے سنتا ہوں۔ یہ خیال میرے ذہن میں پک رہا ہے۔ لکھوں گا اور پھر دنیا کے سامنے اعلان کروں گا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

عزیز کو میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کا حوالہ دینے میں بہت لطف آتا۔ سید احمد خاں، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، آزاد، غفار خاں اور رفیع احمد قدوائی کا ذکر کرنا اسے اتنا ہی اچھا لگتا تھا جتنا کہ بنگال کے لوگ بنکم چٹرجی، آربندوگھوش، سوامی وویکانند اور ٹیگور کے تذکرے سے اور کچھ پنجابی دیانند سرسوتی، لاجپت رائے اور سوامی شردھانند کے ذکر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی اپنے کسی خیال یا اپنی کسی بات

کو موثر بنانے کے لیے کربلا اور شہادتِ امام حسین کے واقعات کو بھی استعمال کرتا۔ کیوں؟ اس کے بعض ساتھیوں کی سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ وہ خود ثقافت اور دانش وری کی کچھ مخصوص روایات کا پروردہ ہے اور ان سے نسبتاً زیادہ مانوس۔ دنیا کی تاریخ سے اس کی واقفیت اچھی تھی، مگر تاریخ اسلام سے اس کی واقفیت کچھ اور بہتر تھی۔ اس کا دنیا کا تصور بدرالدین طیب جی، اجمل خاں، انصاری، غفار خاں اور رفیع صاحب کے تصور سے مختلف نہیں تھا۔

"پھر وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہ آوازیں نہیں سنی جائیں گی۔" وہ کبھی کبھی اپنی بیوی طلعت سے پوچھتا۔ "ان کو اگر وہ اپنے بیانیہ میں نہ لائے تو اور کون لائے گا؟"

کچھ برسوں سے علی گڑھ اور جامعہ کے مسلمان دانش ور اپنے روشن خیال (لبرل) ورثے کے بارے میں کچھ مدافعتی ہوگئے ہیں۔ عزیز ان حضرات سے الگ تھا۔ دو قومی نظریے کے ثقافتی اور نظریاتی بوجھ کو اٹھانے کا اس کے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ اس کے والد نے ہندستان میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا اس کے خسر ایک کٹر کمیونسٹ تھے اور قوم پرست تھے۔ خود اختیاری (self determination) کے اصول پر پاکستان کی تحریک کی جب ان کی پارٹی نے حمایت کی تو انھوں نے پارٹی سے اتفاق نہیں کیا۔

عزیز کو لکھنؤ، علی گڑھ یا جامعہ ملیہ میں جب کبھی کسی سالانہ تقریری مقابلوں میں جج کے فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تو اس نے ایسے موقعوں پر ہمیشہ مولانا آزاد کی رام گڑھ کانگریس سیشن (1940) والی تقریر کا حوالہ ضرور دیا۔ اپنے سیاسی عقیدے کے اظہار کا یہ اُس کا اپنا طریقہ تھا۔

"میں مسلمان ہوں" مولانا نے اعلان کیا۔

"اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روائتیں میرے ورثے میں آئی ہیں، میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے

چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔

بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک حصہ ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دستبردار نہیں ہوسکتا..............."۔

عزیز عموماً طالب علموں سے اپنی گفتگو کو ختم کرتے ہوئے انھیں وسیع النظر ہونے اور دوسروں کو برداشت کرنے کی تلقین کرتا تھا۔ اس کا تاثر بہرحال یہ تھا کہ لوگوں کے رویّوں میں تبدیلی کی رفتار منظر کی تبدیلی کے مقابلے میں کہیں ست ہے۔

"کاش میں وہاں ہوتا"، پردیپ نے جگ موہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، "مولانا کو داد دینے کے لیے۔ ویسے عزیز بھائی خود بھی اتنی ہی زوردار تقریر کرسکتے تھے۔"

"مجھے اتنا اعتماد نہیں ہے۔ بہرحال دسمبر میں محرم کے لیے میں علی گڑھ کے ضلعے میں اپنے موروثی گاؤں جلالی جارہا ہوں۔ میری غیرموجودگی میں میرے خسر اقبال مہدی، اس کہانی کو پورا کردیں گے۔ وہ ترقی پسند کہلاتے ہیں، اور انھیں نیشلسٹ

جدوجہد کے نشیب و فراز سے بڑی دلچسپی ہے۔ انھوں نے آر سی دت کی اقتصادی تاریخ ہند (Economic History of India) پڑھی ہے اور پرانے کانگریسی قوم پرستوں کی پیش کی ہوئی Drain Theory پر تقریر کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ رجنی پام دت کی تحریروں کے معترف ہیں۔ اقبال مہدی صاحب علی گڑھ میں خواجہ احمد عباس کے ہم عصروں میں تھے۔ ترقی پسند مصنفین سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ منشی پریم چند، سجاد ظہیر اور ملک راج آنند جیسے تحریک کے موسسین سے بھی ملے ہیں۔ نوجوان شعرا علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی سے بھی ان کی واقفیت ہے۔ تمھیں پتہ ہے؟ 1936 میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس ہمارے ہی شہر میں ہوئی تھی۔ پریم چند نے اس کی صدارت کی تھی۔ (رودولی کے چودھری محمد علی اس کی ریسپشن کمیٹی میں تھے) افسوس آپ لوگ ان چیزوں کے بارے میں بات نہیں کرتے۔ مجھے ڈر ہے کہ ادب کی اس ترقی پسند تحریک کی تاریخ آہستہ آہستہ عوامی حافظے سے محو ہوجائے گی۔

یہ معقول اور معتدل باتیں کرکے عزیز چلے گئے۔

تقریباً دو ہفتے گزرنے کے بعد تینوں دوست پھر ملے، اس دوران قتل، آتش زنی اور زنا کی کہانیاں زبان زدعام تھیں۔ فطری طور پر، لکھنؤ کے لوگ جو زندگی کے نشیب و فراز اور اس کی نیرنگیوں سے مانوس تھے، پُر سکون رہے۔ زندگی حسب معمول چلتی رہی۔ اکثر لوگ اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور سیاست دانوں کی تقریروں سے اپنے مضبوط ذہنی اور ثقافتی رشتوں کو کمزور بنانے پر تیار نہیں تھے۔

بارہ دری سے، جو اب ایک ویران جگہ ہے، ایک تنہا تنہا سی آواز اقبال کی یہ نظم پڑھتے ہوئے سنائی دی۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہوگئے پُرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آکے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھادیں
بچھڑوں کو پھر ملادیں نقشِ دوئی مٹا دیں

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملادیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلادیں

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

نفرت، انتقام اور الزام تراشیوں کی فضا میں ایسا لگتا تھا جیسے یہ اشعار عہد رفتہ سے آتی ہوئی کوئی آواز ہو۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تیسرا باب

انگلستان نے ہندستانی سماج کا سارا ڈھانچہ توڑ دیا ہے۔ اس کی تعمیر کے کوئی آثار ابھی تک تو ظاہر ہوئے نہیں ہیں۔ اس کی قدیم دنیا کے زیاں اور نئی کے عدم امکان نے ہندو کے موجودہ مصائب میں ایک مخصوص قسم کے اندوہ کا اضافہ کردیا ہے اور برطانیہ کے زیر نگیں ہندستان کو اس کی قدیم روایات اور اس کی ساری قدیم تاریخ سے الگ کردیا ہے۔

(کارل مارکس، 1853)

برطانوی دانش وری کا سب سے بڑا کارنامہ یعنی برطانوی سلطنتِ ہند کا قیام سب سے حیرت انگیز ہے .... مٹھی بھر، محض مٹھی بھر انگریزوں کے اس قصے کا کسی بھی تخیلی کہانی سے موازنہ نہیں ہو سکتا۔ انگریز جنھوں نے ابتدا تاجروں کی طرح کی مگر صرف دو صدیوں کے اندر ہی ایک ایسے شاہی نظام کا ڈھانچہ کھڑا کردیا کہ جس کے تحت خود اپنی وسعت کے اظہار سے ایک براعظم میں رہنے والے مختلف نسلوں اور مختلف ذاتوں کے تین سو ملین باشندوں کے لیے امن و چین، قانون اور ضابطے اور اچھی حکومت کی ضمانت ہوگئی۔

(ایل.ایس.ایمرے — سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا، 21 نومبر 1940)

وہی پرانا سوال بار بار پوچھا جاتا ہے۔ سوال اہم ہے، مگر اگر آپ کو بار بار اس کا جواب دینا پڑے تو اس کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ذرا سوچیے کہ آپ مسافروں سے کھچاکھچ بھرے ہوئے ٹرین کے ایک ڈبے میں سفر کررہے ہیں اور وہاں ضلع کچہری کا ایک وکیل آپ سے پوچھتا ہے، "نئے ہندستان کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟"، "کیا اس کا آغاز 1739 میں نادرشاہ کے حملے سے ہوا؟" اپنے بچے کو سلاتی ہوئی اس کی بیوی پوچھ لیتی ہے، "ارے یہ کیا وہی ہے جو تخت طاؤس اٹھا لے گیا تھا؟" وکیل گورنمنٹ کالج جھانسی میں دو سال میں حاصل کی ہوئی تاریخی معلومات کے اظہار کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے دینے والا آدمی نہیں تھا۔ "بھائی صاحب"، اس نے بھاری آواز میں پوچھا، " 1750 اور 1760 کے افغان حملوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنا تیسرا مگر آخری نہیں، سوال داغ دیا، "اور پھر 1757 کی جنگ پلاسی؟"

اس نے میری طرف کوئی توجہ نہیں کی، جب میں نے اسے یہ بتانے کی کوشش کی کہ 1765 ایک پختہ علامت تھی جب بنگال، بہار اور اڑیسہ کے مغل اقتدار کو باقاعدہ طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کیا گیا تھا۔

"بھائی صاحب"، اس نے اپنے بکھرے ہوئے سامان کو جمع کرتے ہوئے اور ایک ٹوٹے بکس میں رکھتے ہوئے کہا، "کیا آپ 1784 کو ایک سنگ میل سمجھتے ہیں؟ یہی وہ وقت تھا جب مغل بادشاہ نے مراٹھا سردار مہاداجی سندھیا کی سرپرستی اور تحفظ حاصل کرنے کے لیے بڑی بزدلی کے ساتھ اس کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ اگر ایسا نہیں تھا تو 14 جنوری 1761 کی زبردست لڑائی کے میدان پانی پت میں مراٹھوں کی شکست یا 1803 میں دہلی پر لارڈ لیک کے قبضے کے بارے میں کیا خیال ہے؟

"توبہ ہے، اسے جھانسی میں یہ سب آخر کیوں پڑھایا گیا تھا؟" اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے سوچا۔ اس آدمی کی بات ٹھیک ہے، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ جھانسی وہ مقام نہیں تھا جہاں آپ سنجیدہ تاریخ پڑھتے ہیں۔ جب میں کانپور میں ٹرین سے اترا تو مجھے لگا کہ وکیل سے ہونے والی گفتگو کا ایک اچھا پہلو بھی تھا اور وہ

یہ کہ اس نے یا اس کی بیوی نے مجھ سے میری تنخواہ نہیں پوچھی، میرے خاندان میں افراد کی تعداد بھی نہیں معلوم کی اور نہ ہی یہ جاننا چاہا کہ میں نے آج صبح ناشتے میں کیا کھایا تھا۔ مجھ سے یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں ہوئی کہ آیا میری لڑکی جوان ہوگئی ہے یا ابھی بچی ہے۔ مچھلی بازار محلے کے لیے روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایسی مہربانیوں اور عنایتوں پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

مچھلی بازار مسجد، جہاں 1913 میں صوبائی سرکار اور مسلمانوں کے درمیان فساد ہوا تھا، پہنچنے سے پہلے خیال آیا کہ وکیل کی معلومات حیرت ناک تھی۔ اگر وہ اتنا برخود غلط نہ ہوتا تو میں اسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بارے میں بتاتا جو John Company بلکہ 'جان کمپنی' کے نام سے جانی جاتی تھی اور جس نے 51-1650 میں سب سے پہلے بنگال میں ایک فیکٹری لگائی تھی۔ وہ اگر اپنی بیوی اور پانچ بچوں کے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں نے اسے دو باتیں ضرور بتائی ہوتیں۔ پہلی یہ کہ ہندستان کے ساحل پر 1675 تک، کمپنی تیس تجارتی جگہوں پر قابض تھی، مدراس اور بمبئی میں چھوٹے چھوٹے علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرچکی تھی اور موجودہ کلکتے کی جگہ پر تین گاؤں کو 1698 میں زمین داری حقوق عطا کردیے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ لندن میں کمپنی کے ڈائریکٹرز نے، طویل مسافت، گرم علاقوں کی بیماریوں اور اکثر ہندستانی ریاستوں کی پالیسیوں، طاقت اور اختیارات کے پیش نظر علاقوں کو فتح کرنے اور نوآبادیاں قائم کرنے کو ناپسند کیا۔ یہ بات الگ ہے کہ یہ مصلحتیں ان کے نمائندوں کو ساحلی علاقوں پر وسیع و عریض قطعات کو فتح کرنے اور ان پر اپنا تسلط قائم کرنے سے روک نہ سکیں۔

اور وکیل نے اگر کسی قدر مزید تجسس کا اظہار کیا ہوتا تو شاید میں اسے یہ بھی بتاتا کہ 23/ جون 1757 کو اگر وہ یا اس کا خاندان پلاسی میں رہ رہا ہوتا تو انھیں یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ کون کس سے لڑ رہا ہے اور شاید اس کا یہ سوال کرنے کا بھی جی چاہتا کہ "کیا سارے سپاہی ایک ہی جیسے لگتے تھے؟" اور میں جواب دیتا کہ "ہاں، وہ ایک ہی جیسے لگتے تھے۔"

کلائیو نے بڑی احتیاط اور نہایت ہوشیاری کے ساتھ چنیدہ سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا، انھیں انگریزی لباس کے نمونے پر کپڑے پہنائے مگر افسروں کے گورے رنگ، ان کی بے داغ وردیوں اونچے ہیٹوں اور سینے کی پٹیوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ پہلی بنگال نیٹیو رجمنٹ بہت دنوں تک اپنی وردیوں کے رنگ کی وجہ سے لال پلٹن کے نام سے مشہور رہی۔ مگر بعد کو اپنے کمانڈر کیپٹن پرم روزگیلیز کی مناسبت سے اس کا نام گلی پلٹن پڑ گیا۔ گیلیز نے کئی برس اس کی قیادت کی۔ اتفاق یہ ہے کہ 1857 میں کانپور میں بغاوت کرنے والی پہلی بنگال نیٹیو انفنٹری ہی تھی مگر بہرحال یہ اُس قسم کی نہیں تھی جس قسم کی فوج سے وکیل کے اجداد نے مقابلہ کیا ہوتا۔

لطف اللہ (1874-1803) نے، جو اپنے لندن کے سفرنامے کی وجہ سے جانے جاتے ہیں، اپنے شہر مالوہ میں کوئی گورا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ سب سے پہلا چہرہ انھوں نے بڑودہ میں دیکھا۔ چار انگریز دو گھوڑوں پر اور دو ان کے ساتھ ساتھ پیدل چلتے ہوئے۔ ان کا رنگ ویسا ہی تھا جیسا اس نے سُن رکھا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کررہے تھے۔ ان کی بولی اسے پھوہڑ اور سخت سی معلوم ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ ان کا لباس چست اور ان کے جسم سے چپکاہوا تھا۔ "جسم کے ان حصوں کو ڈھاپنے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا کہ جنھیں شرم و حیا کے تقاضے چھپانے کی تلقین کرتے ہیں۔" اس نے انھیں ٹوکنا چاہا مگر ایک اجنبی شہر میں نہ ٹوکنا ہی بہتر لگا۔ اس کے بجائے اس نے السلام علیکم کہے بغیر دوستی کی علامت کی حیثیت سے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ انھوں نے بھی اس کے سلام کا جواب دیا اور اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کا سارا دن ہی کامیاب گزرا۔

جس وقت پلاسی میں، سراج الدولہ کی تذلیل کرنے کے لیے برطانوی فوجیں بڑھیں، کمپنی نئے نئے علاقوں میں اپنے اقتدار کو قائم کرنے کی مہم میں بڑی بے دردی سے مصروف تھی۔

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دیوانہ مرگیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزاری

شاہانہ مقدّر کا پرچم لہراتے اور محبِ جاہ کی آگ میں تپتے ہوئے رابرٹ کلائیو نے متعدد علاقوں میں برطانوی جھنڈا گاڑ دیا۔ مخالفین کو مطیع بنانے کا اسے کچھ عجیب سلیقہ تھا۔ وہ یہ سب کیسے کرتا تھا، سازشیں بُننے اور فریب سازی کی اس کی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ زیادہ جاننے کے لیے، ہاؤس آف کامنس کے نام خود اس کے لکھے ہوئے خطوط اور دستاویزات کا مطالعہ بہترین طریقہ ہوگا۔ آپ اسے کہتے ہوئے سنیں گے کہ اس کی زندگی کا بہترین لمحہ وہ تھا جب پلاسی کی فیصلہ کن جنگ سے کافی پہلے اس نے ستمبر 1751 میں Arcot کا محاصرہ کیا اور اسے فتح کیا۔ اس کے اس کارنامے کا نتیجہ چندرناگور (1731-41) کے فرانسیسی گورنر اور واپس بلائے جانے سے قبل اُس وقت (1741-54) کے گورنر جنرل ڈوپلے کی تباہی اور ہندستان میں اپنے کٹر انگریز دشمن پر سبقت لے جانے کے اس کے خواب کی مکمل شکست و ریخت کی شکل میں سامنے آیا۔

پلاسی سے بکسر تک کا سفر جو بچی کھچی ہندستانی ریاستوں کی آخری رسوم کو ادا کرنے کے لیے تھا، ایک تکلیف دہ اور تھکا دینے والا سفر تھا۔ لیکن جوکھم اور پرخطر بہت نہیں تھا۔ میر جعفر، جس نے پلاسی کی جنگ کے بعد سازشوں میں کمپنی کے ساز پر راگ الاپے تھے، اب پریشان تھا، اکتوبر 1760 میں اسے تخت و تاج چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ اس کے جانشین میر قاسم نے کمپنی سے کیے گئے بہت سے معاہدوں کو پورا کیا۔ مگر، بہرحال، مونگیر کو پایہ تخت بنا کے ایک امریکی افسر کی ماتحتی میں ایک منظم فوج جمع کرکے اور اندرون بنگال دور دور تک برطانوی تجارتی رسائی میں مزاحمت کرکے اس نے فاش غلطی کردی۔ اس کی دوسری تباہ کن غلطی اپنی اتھارٹی پر اس کا اصرار تھا۔ کمپنی اب طاقت اور اقتدار کا مزہ چکھنے کے بعد ایسی سرکشی اور نافرمانیوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والی جدوجہد کا نتیجہ جس میں چار لڑائیوں میں تین شکستیں اور قاسم کا بھاگ کر اودھ جانا شامل تھا، 23 اکتوبر 1764 میں بکسر کی لڑائی کی شکل میں نکلا۔ آخر میں 'بکسر' نوابان بنگال کی آخری آرام گاہ ثابت ہوا۔ میجر منرو نے شجاع الدولہ اور قاسم کی مشترکہ فوجوں کو پست

کردیا۔ یعنی اس نے اُس واحد قوت کو ناقابل تلافی طور پر تباہ کردیا جو کمپنی کو چیلنج کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

تھامس رو (Thomas Roe) سترھویں صدی کے اوائل میں جہاں گیر کے پرشکوہ دربار میں آنے والے ایک متکبر مزاج دادخواہ سفیر نے اپنے آقا کی قسمت میں اتنی تیز رفتار اور قطعی تبدیلی کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اسے ان سے یہ امید بھی نہ ہوگی کہ یہ ایک ایسی کریہہ اور بھیانک صورت حال پیدا کرنے کا الزام لگوائیں گے جو، اگرچہ خود برطانیہ کی تائیدیافتہ تھی، ریاست کی سرحدوں کو تاراج کردے گی۔ 1813 تک، کہ جب تک اس کی تجارتی جاگیرداری (ملکیت) ختم نہیں ہوئی تھی، ہندستان کی حکومت کمپنی کی حکومت تھی، فوج کمپنی کی فوج تھی، قرضوں کے آئینی اجراء (Legal Re-inscription) کی کوششیں فوج کی تھیں۔

افق پر جب سورج نے اوپر آنا شروع کیا تو ہوا میں کچھ کچھ خنکی تھی۔

"تم جو کہہ رہے ہو"، پردیپ نے اپنے سیدھے سادے ڈھنگ سے اعادہ کیا، "وہ یہ ہے کہ بنگال کی کسی خودمختار حکومت کا وجود حقیقتاً ختم ہوچکا تھا اور اختیار کی انگریزوں کو منتقلی کی رسوم 12/ اگست 1765 کو الہٰ آباد میں ادا کردی گئیں تھیں۔

"برسبیل تذکرہ"، عزیز نے کہا، "کیا تم یہ جانتے ہو کہ اقبال نے میر جعفر اور میر صادق کو نوع انسان کے لیے، مذہب کے لیے اور خود اس ملک کے لیے کلنک کہا تھا۔

اس وسیع و عریض ملک میں صرف برطانوی شیر کیوں دہاڑا، اس کے بارے میں عزیز اور اس کے ساتھی مؤرخین کچھ بہت یقینی نہیں تھے۔ انھیں اگر کسی بات کا یقین تھا، تو وہ یہ تھی کہ مرالٹھا للکار میں برطانوی مزاحمت کے اسباب اور واجد علی شاہ کی ذلت آمیز اطاعت و فرمانبرداری کے اسباب مختلف تھے۔ تغیر، عدم استحکام اور پُرشکوہ غیر یقینی کی صدی میں، تمام علاقوں کے بارے میں کوئی ایک مجموعی رائے قائم کرلینا صحیح نہیں تھا۔

"سیر المتاخرین" کے مصنف غلام حسین خاں طباطبائی نے 1707 سے 1781 تک کی ہندستان کی عام تاریخ لکھتے ہوئے انگریزوں کے راج کو ہندستانی حکمران طبقات کے گناہوں کی پاداش میں "عذاب الٰہی" قرار دیا۔ لطف اللہ کے نزدیک یہ خدائے بزرگ و برتر کی مرضی تھی کہ ایک چھوٹا سا جزیرہ دنیا کے بڑے حصے پر حکمرانی کرے اور باقی ماندہ کو مبہوت اور بدحواس رکھے۔ خود اس کی جسامت کرۂ ارض پر اتنی تھی جتنی کہ آدمی کے جسم پر ایک تل کی ہوتی ہے۔

مرزا ابوطالب (1806-1752) نے فرانس پر برطانیہ کی جیت کا سہرا اس کی بہتر بحری فوج کے سر باندھا۔ اپنی کتاب "Travels" میں جو پہلی بار انگریزی میں 1810 میں شائع ہوئی تھی، انھوں نے کوپن ہیگن کے مقام پر ہونے والی جنگ میں انگریزوں کے اپنے دشمنوں کا تختہ پلٹنے اور مصر اور دوسری نوآبادیات میں ان کی فتوحات کا سبب ساحل اور سمندر دونوں میں اِن کی ناقابلِ تسخیر صلاحیتوں کو گردانا۔ انھوں نے اپنی بحری فوج کو کارکردگی کے جس اعلیٰ مقام تک پہنچا دیا تھا، وہ ہی ان کی خوشحالی اور ان کے تمول کا اصل اور اہم ذریعہ تھا۔

لکھنؤ کے ممتاز قصہ گو عبدالحلیم شرر نے جن کا انتقال 1926 میں ہوا، دو عوامل کو برطانوی فتح و نصرت کا سبب بتایا۔ "پہلا، ہندستان کے لوگوں کی حماقت اور لاپروائی، اور دوسرا، ہندستانیوں کی جہالت اور فناپسندی کے مقابلے میں برطانوی حکومت کی طاقت اور برطانوی لوگوں کی دور اندیشی، کارکردگی اور صبر و برداشت"۔ صنعتی تمدن اور اس کا طرز زندگی، ساری قوموں سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا مگر "ہندستان میں اس آواز کو کسی نے نہیں سنا اور ہر چیز تباہ و برباد ہوگئی"۔

"کیا تمھارا خیال ہے کہ فرنگی راج کے قیام میں مجہول اور انحطاط پذیر اشرافیہ نے تعاون کیا؟ میرا خیال ہے کہ تم نے کہا تھا کہ فسانۂ آزاد کے مصنف رتن ناتھ سرشار (1903-1845) نے بھی یہی بات کہی ہے"۔ تفصیلات میں جاتے ہوئے پردیپ نے اصرار کیا۔

"نہیں"، عزیز نے کہا۔ اپنی سگریٹ کے فلٹر کو انگوٹھے کے ناخن پر ٹھوکتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی، "اکثر درسی کتابیں کہتی ہیں کہ ہندستانی سماج کو برطانیہ نے مفتوح یا ماتحت نہیں بنایا بلکہ ہم نے ہندستان کو اپنی کمزوریوں اور باہمی اختلاف کے ذریعے انھیں سیاسی قوت کی اعلیٰ ترین سطحوں میں در آنے کی اجازت دی۔ مجھے تعجب ہے کہ لوگ ایسے نتائج کیسے نکال لیتے ہیں؛ بہرحال کچھ لکھنے والے مغرب کی ٹکنالوجیکل اور سائنٹفک للکار پر توجہ نہ دینے میں حکمران طبقے کی ثقافتی ناکامیوں (جس میں سارے عالم اسلام کے ساتھ وہ خود بھی شامل ہیں) کی بات کرتے ہیں۔ یہی ثقافتی ناکامیاں تھیں جنھوں نے ترازو کے پلڑے کو یورپ کے حق میں جھکا دیا، یہی ثقافتی ناکامیاں تھیں جنھوں نے اقتصادی بحران سے نپٹنے کی صلاحیتوں سے حکومتوں کو محروم کردیا۔ یہ دو اقتصادی عواقب سیاسی اور عسکری زوال کا سبب بنے، لیکن خود عسکری کمزوریاں، مشرقی دنیا میں انٹلکچوئل جمود سے پیدا ہوئیں۔"

اس دلیل کو سمجھنے اور ہضم کرنے کے دوران سکوت رہا۔

"توسیع پسندی کی تحریک کو کس چیز نے زندہ رکھا؟" پردیپ نے سوال کیا۔

نہ جانے کیوں مگر عزیز سن نہیں رہا تھا، ""What was that?""

"ارے کچھ نہیں"۔

"کہو کہو، میں سننا چاہتا ہوں"۔

پردیپ نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ کیا تھا جس نے توسیع پسندی کی تحریک کو زندہ رکھا؟" "برطانوی اداروں کی قوت و توانائی اور اس کے ساتھ قاعدے اور قانون کی حکمرانی کا کمپنی کا تصور اور مختلف جگہوں پر اس کا نفاذ" عزیز نے مسکراکر جواب دیا مگر مسکراہٹ میں افسوس کا پرتو بھی تھا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا، "اس کے خادموں کی توانائی، جذبہ اور ان کا کمٹمنٹ بھی کم اہمیت نہیں رکھتا۔ انھوں نے ایک ایسی قلمرو کے قیام کے منصوبے کو زندہ رکھا کہ جہاں سورج کبھی غروب نہیں ہوگا۔ ان کا یہ مقصد یقیناً

پورا ہوا فوج کی مدد سے۔ کمپنی کے راج کے کم از کم ابتدائی اسی برسوں میں فوج نے بہت سے علاقوں میں سماجی اور سیاسی استحکام کی ضمانت لی۔ ان علاقوں میں وادیٔ گنگا کے دور دراز علاقے، ترائی کے جنگلات اور نیپال کی سرحد کے محکوم اور مفتوح علاقے شامل تھے۔"

تین دن بعد، 29ر نومبر اتوار کی صبح عزیز نے برطانوی فتح کے راز کو ایک موڑ اور دیا۔

سازگار ماحول اور خوش گوار اتفاقات نے یقیناً انگریزوں کی مدد کی۔ مگر آخر میں ہندستانی تاجروں اور کاروباری سرمایہ داروں کی ملی بھگت سے علاقائی ریاستوں کی بیخ کنی ہوئی۔ یہی لوگ تھے جنھوں نے سراج الدولہ کے زوال اور اس کی ہزیمت میں کلائیو کی مدد کی تھی۔ اُس گروہ میں جو گماشتے کہلاتے تھے، جگت سیٹھ اور اوی چند جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ جنوب مشرق میں کورومنڈل کے ساحل اور جنوب مغرب میں مدراس کے ساحل پر کمپنی کے مفروضہ تسلط کی بنیاد انگریزوں اور ہندستانی تاجروں کے درمیان ایک مفاہمت تھی۔ فوج میں بھرتی کے سلسلے میں بھی یہی عمل کارفرما تھا۔ یعنی اختیارات و انتظام کے ڈھانچے میں زمین د'.وں کو شامل کرنا اور اودھ اور بہار میں عسکری امداد کے بارے میں ان پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرنا۔ زمین داروں کے لیے کمپنی کو مستحکم کرنے کا یہ موقع فیضان الٰہی تھا۔ اس صورت حال نے وقتی فائدوں کے علاوہ دیہی علاقوں میں ان کی حیثیت اور ان کے وقار کو بھی بہت بڑھا دیا۔

بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی بخشش نے علاقائی توسیع کو مہمیز لگائی۔ اگرچہ برطانوی حکومت اور لندن میں کورٹ آف ڈائریکٹرز مہنگے عسکری کاروبار اور جارحانہ ذیلی حکومتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ہندستان میں ان کے نمائندے ایک تجارتی تنظیم کو ایک کاروباری جمہوریہ میں تبدیل کرنے کے لیے سرحدی علاقوں سے مرکزی علاقوں کی طرف بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ قدم بڑھاتے رہے۔

جس شخص نے بھی کیپٹل اسٹاک میں حصص خریدے اسے پروپرائٹر قرار دیا

گیا اور جنرل کورٹ آف پروپرائٹرز کے جلسوں میں انھیں شریک ہونے کی اجازت ملی۔ پانچ سو پاؤنڈ کے حصے رکھنے والے شخص کو ہاتھ اٹھاکر ووٹ دینے کا حق تھا، دس ہزار پاؤنڈ کے حصے دار بیلٹ کے ذریعے ووٹنگ میں شریک ہوسکتے تھے، تین ہزار پاؤنڈ کے حصص کا مالک دو ووٹ، چھ ہزار پاؤنڈ والا تین ووٹ اور دس ہزار یا اس سے زیادہ والا شخص انتہائی یعنی چار ووٹ دینے کا حق دار تھا۔ ایک ہم عصر مصنف نے بدنیتی کے ساتھ جنرل کورٹ کو عوامی قانون ساز اسمبلی (Senate) لکھا تھا (جہاں) شہریت کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ انگریز، فرانسیسی، امریکن — مذہب کی کوئی تفریق نہیں تھی۔ یہودی، تُرک اور غیر اہل کتاب، جنس بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

لطف اللہ لیڈی ہال اسٹریٹ میں ایسٹ انڈیا ہاؤس گئے تھے۔ انھوں نے اس کا تذکرہ ایک محل کی طرح کیا ہے جس میں بہترین فرنیچر سے بھرے ہوئے لاتعداد کمرے اور ہال تھے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں ان کے پیارے وطن کا مقدر اُن چوبیس آدمیوں کے ہاتھ میں تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے معزز ڈائریکٹرز کہلاتے تھے اور حکومت ہند کی کٹھ پتلیوں کی ڈوریوں کے اصلی ہلانے والے تھے۔ انھوں نے چیرمین کیپٹن جان شیپرڈ اور ان کے نائب ہنری ویلوک سے ملاقات کی۔ کمپنی کے میوزیم میں، جو ایک بڑی عمارت میں تھا، وہ ہندستانی ڈکشنری، کے مرتب جان شیکسپیئر، ایک مشرقی اسکالر پروفیسر ولسن اور کرنل ڈبلیو ایچ اسکیز (Sykes) سے ملے۔ شیکسپیئر سے ان کی واقفیت اس کی شہرت کی وجہ سے تھی اور اسی بنیاد پر انھوں نے اس سے خود اُسی کی زبان میں گفتگو کی۔ مگر انھیں بہت مایوسی ہوئی جب انھیں اندازہ ہوا کہ شیکسپیئر وہ زبان بولتا نہیں جس میں اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔

ایک صاحب بصیرت قاری لطف اللہ کے بیان میں طنز اور ناراضگی کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔ طنز اور ناراضگی کی ایسی اور اتنی ہی جھلک غلام حسین کے تجزیے میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے مترجم کو ان کی تحریروں میں قومی ناراضگی کی ایک زیریں لہر نظر آئی۔ اس کا کہنا ہے کہ غلام حسین جگہ جگہ پر اپنا غبار نکالتا ہے جس میں بسا اوقات انگریز کی مدح سرائی بھی ہوتی ہے جسے وہ نہ تو چھپاسکتا ہے اور نہ ہی کم کرسکتا

سڑک پر سے آنے والی باجوں کی آواز اعصاب پر سوار ہو رہی تھی۔

"پردیپ موسیقی تمھیں پسند ہے؟"

"میرے والد اپنے زمانے کے بعض کمپوزرس کو جانتے تھے۔ میں نے ایک دفعہ ستار سیکھنے کی کوشش کی تھی مگر ایک تو یہ بہت مشکل ساز ہے اور دوسرے جب آپ سیکھ رہے ہو ہوں تو آس پاس کے لوگوں کے لیے بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے میں نے طبلہ سیکھنا شروع کیا۔ اب بھی کبھی کبھی بجاتا ہوں"۔

"بہرحال" عزیز نے پھر سنجیدگی کے ساتھ بات شروع کی، "کمپنی کے محاصل بتدریج بڑھے اور حصے داروں کی خوشیوں میں اضافہ ہوا۔ اس عمل میں بنگال کا جو بظاہر کبھی نہ ختم ہونے والی دولت کی کان تھا، خون قطرہ قطرہ چوس لیا گیا۔ ملک کو کسی بھی مراٹھا حملے نے اتنا تباہ نہیں کیا تھا جتنا کہ کمپنی اور اس کے ملازموں کی بنگال کی لوٹ نے۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ 1770 کے بنگال کے عظیم قحط میں وہاں کی ایک تہائی آبادی نیست و نابود ہوگئی۔ جب ایک طرف لنکاشائر کے کارخانے زیادہ سے زیادہ کپڑا ہندستان برآمد کرنے میں لگے ہوئے تھے، تو دوسری طرف بنگال کی تسخیر کے تقریباً اسی سال بعد روئی کاتنے اور بننے والے ہندستان کے میدانی علاقوں کا خون چوسنے میں مصروف تھے۔

"اچھا کہا"، پردیپ بولا، "شروع شروع میں آنے والے برطانوی تاجر شکاری پرند بھی تھے اور ہری چک بھی۔ وہ صرف ذہن دولت کے درختوں کو جھورنے آئے تھے"۔

عزیز کوئی جواب دینے کے بجائے کاظم اینڈ سنز حضرت گنج کی دوکان سے بہن کی خریدی ہوئی اپنی گھڑی کو دیکھتا رہا۔

عزیز میں کچھ جھنجلاہٹ پیدا ہوتی جارہی تھی، اور اس کا سگریٹ سے مسلسل کھیلنا جگ موہن کے اعصاب پر بوجھ بنتا جارہا تھا۔

"تم نے رابرٹ کلائیو کا کچھ ذکر کیا تھا؟ کیا تھا نا؟"

"نہیں جیک، صرف یہ کہ وہ محض ایک معمولی وکیل تھا اور ہندستان آنے سے پہلے کوئی امتیازی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر جب مانچسٹر واپس گیا ہے تو وہ ایک کروڑ پتی بن چکا تھا۔ یہ یاد رکھو کہ ایسا کرنے والا وہ نہ تو پہلا مَن چلا تھا اور نہ ہی آخری۔ سپاہیوں اور بھاڑے کے ملازموں، مزارعوں، وکیلوں، استادوں اور مشنریوں کے ساتھ ایسے لاتعداد اور مَن چلوں کو برطانوی بندرگاہوں سے ہندستانی بندرگاہوں پر لانے والے جہازوں کا تصور کرو۔ ہندستانی شہروں سے الگ مگر ان سے قریب شہری مقامات پر ان کی طرز زندگی پر غور کرو۔

پیہانی کے خودساختہ نواب ہمارے دوست ہمایوں ظفر زیدی کو یہ بہت اچھا لگا ہوتا۔ ان پہاڑی مقامات پر غور کرو جو اُن اہم کوششوں کا مظہر تھے جو بہتر تہذیب کے ایجنٹ کی ان کی حیثیت کی ان حدود کی تعیین اور دفاع کے لیے کی جارہی تھیں۔ ان مقامات پر انھوں نے اپنی پسند کے ماحول میں جو ایک بہتر تہذیب کے ایجنٹ کی ان کی حیثیت کی ضامن تھیں، خالص اپنی سی برادریاں قائم کرلی تھیں۔ یہیں پر انھوں نے سیاسی ہیڈکوارٹرز اور فوجی چھاؤنیاں اقتدار کے مراکز قائم کیے جہاں سے نمودونمائش کے ایک پُرتمکنت جذبے کے ساتھ انھوں نے احکامات جاری کیے اور ان کا نفاذ کیا۔ مصنف میلکم میگرِج (Malcolm Muggeridge) نے، جو بعد کو 'پنچ' کا اڈیٹر بھی ہوا، تیسری دہائی میں لکھا تھا کہ کبھی ہندستان کی موسم گرما کی راجدھانی رہنے والا شملہ ایک مستند اور خالص برطانوی پیداوار تھا، کسی دوسرے حوالے یہاں تک کے مہاراجاؤں سے بھی یکسر بے تعلق، صاحبوں کا سوچا ہوا اور صاحبوں کے لیے۔

"اس کے علاوہ، پیارے" جیسا کہ میرے دوست سدھیر چندر نے کہا تھا، "فوجی افسروں اور سپاہیوں کو فراہم کی جانے والی یکسوئی شاندار اور منظم ماحول کا ذرا تصور کرو۔ پریشان کن ہندستانی زندگی کے رابطوں سے محفوظ، قحبہ خانوں اور چکلوں میں جانا ممنوع، دن میں ہر وقت ٹوپی یا ہلمٹ پہننا ضروری، کنٹونمنٹ سے باہر پانی پینے پر پابندی کہ اس پانی میں ٹائفائڈ، ڈِپتھیریا اور ہندستان میں پھیلنے والے دوسرے امراض

کے جراثیم ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد سول لائنز تھیں۔ عام طور پر وسیع اور کشادہ بستیاں، جن میں کلب، بار، دو ایک چرچ اور جیل ہوتے تھے۔ دہلی کا سول لائنز تمھیں یاد ہے، یاد ہے نا؟ مبلغین اور ایشیا اور افریقہ کے بارے میں ان کے حماقت آمیز خیالات کے بارے میں کیا کہوں؟ سارے ہندستان کو عیسائی بنا دینے کے ایک بے محل اور نامناسب یقین کے ساتھ وہ جہاز پر سوار ہوئے تھے۔ سدھیر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تاریخ پڑھاتے ہیں۔ ان کی بیوی کسم نیک خاتون ہیں۔ غالبًا دونوں کی ملاقات طالب علمی کے زمانے میں ہوئی تھی۔ سدھیر مین پوری کے رہنے والے ہیں۔"

ہندستان بہتات کی سرزمین تھی۔ من چلوں اور مہم جو افراد کو یہ پتا چلانے میں دیر نہیں لگی۔ آب و ہوا اور بیماریوں کی تباہ کاری پر اپنی لامتناہی شکایتوں اور کبھی نہ ختم ہونے والے تاسف کے باوجود افسر اور سپاہی سلیقے کے ماحول، باغوں سے گھرے، چوڑی اور سیدھی سڑکوں سے ایک دوسرے سے ملے ہوئے کشادہ مکانوں میں رہے۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ لوگ خود اپنی محنت اور لگن سے بلند حیثیتوں تک پہنچے مگر اکثر ایسے تھے جن کے پاس دمڑی نہیں تھی مگر بعد کو رئیسوں میں شمار ہوئے۔ طاقت اور دولت کے نشے میں سرشار خاصے ایسے لوگ تھے جنھوں نے مغل امراء کی نقل میں اپنی راتیں رنگ رلیوں میں بتائیں اور سورج نکلنے پر لڑکھڑاتے ہوئے اپنی اپنی پالکیوں میں سوار ہوئے۔ بنگال میں حضرات و خواتین شان سے بھی رہے اور خوشگوار ڈھنگ سے بھی رہے۔ انھوں نے اپنی سہ پہر کو کاروباری مسائل کے لیے وقف کیا اور رات کے کھانے کے بعد آرام فرمایا۔ شام کو اپنی پالکیوں یا بگھیوں میں بیٹھ کر کھیتوں اور باغوں کی سیر کی یا پھر بگھیوں میں سوار ہوکر دریاؤں اور جھیلوں کا لطف اٹھایا۔ دریاؤں اور جھیلوں پر مچھلی پکڑنے یا مرغابیوں کے شکار کا شوق بھی پورا کرلیا۔

مصنف Dennis Kincaid نے 3/ نومبر 1775 کو ہونے والی ایک پارٹی کا تذکرہ کیا ہے جس میں تمام خواتین، چیری برانڈی پی پی کر دھت ہوگئی تھیں اور ایک دوسرے کو روٹی کے ٹکڑے پھینک پھینک کر مار رہی تھیں۔ انھوں نے کوئی نئی کتابیں نہیں پڑھیں گھر کی سیاست میں انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہر چیز ہوتے ہوتے

بالآخر خاص دیسی ہو کر رہ گئی تھی۔ نئے آنے والے ستھرے اور خوش مزاج ہونے کے بجائے غیر مہذب اور بدتمیز تھے۔ کھانے کے بعد جام صحت روایتی شکوے "Alas and a Lack a Day" کو بدل کر "A Lass and a Lakh a Day" پر پیا جانے لگا۔ مردوں کی ایک فطری خواہش جن کے نزدیک ایک لاکھ روپے کی تمنا کرنا ایک مناسب مقصد تھا اور ایک بی بی یا ہندستانی داشتہ ایک موزوں ساتھی۔

"ایک سوال"، جگ موہن نے کہا۔

"پوچھو"

"تو فرنگیوں اور ان کی میم صاحباؤں نے اچھا وقت گزارا"

"ہاں"

پردیپ نے جگ موہن کو گھورا، مطلب یہ تھا کہ جذبات پر قابو رکھو۔ وہ چپ ہو گیا۔

1785 میں وارن ہیسٹنگز کے جانے تک پچھلی دہائی کے حسب معمول موجود شبہات اور بے یقینیوں کی جگہ برطانوی استعمار کے ایک محفوظ اور روشن مستقبل کے حقیقی امکانات نے لے لی تھی۔ اس دوران کمپنی نے اراضی پر بھاری لگان، انتہائی مہنگا ایڈمنسٹریشن اور گھروں کو روپے بھجوانے کے ذریعے مہیا وسائل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا جاری رکھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی لوٹ نے برطانیہ میں معاصر صنعتی انقلاب کے لیے بنیادی سرمایہ فراہم کیا۔ سرکش حاکموں کو ان کی اصل حیثیت بتانے اور دوسرے لوگوں کو مطیع بنانے، پھر طاقت کے بل پر انھیں قابو میں کر لینے کے بعد اور بھی صلے اور انعامات خزانے میں تھے۔ غیر مطمئن گروہوں کی خاطر مدارت کی گئی اور ان کی مجروح انا کو تسکین دینے کے لیے رعایتوں کی پیش کش ہوئی۔ دل جوئی کے علامتی انداز سکۂ رائج الوقت تھے۔ وارن ہیسٹنگز پہلا گورنر جنرل تھا جو کمپنی کے دعووں اور مطالبات کی پشت پناہی کے لیے ڈنڈے کے استعمال کی انتہائی صلاحیت رکھتا تھا۔"

صنعتی انقلاب کے بارے میں بات بہت سیدھی سادی تھی۔ ایک وقت یورپ کی بحری توسیع و ترقی نے صنعتی انقلاب کے لیے راہ ہموار کی اور دوسری طرف صنعتی انقلاب نے یوروپین توسیع و ترقی کو مہمیز لگائی۔ اس نے خود یوروپین لوگوں کی حقیقی تعداد میں بھی اضافہ کیا اور غیریوروپی لوگوں کی آبادی کے مقابلے میں ان کے تناسب کو بھی کئی گنا بڑھا دیا۔ اس صورت حال نے انھیں فطرت کی ضرر رساں اور مخالف قوتوں پر قابو پانے کے لیے بہتر ہتھیار اور زیادہ کارگر طریقے فراہم کردیے۔ اس نے صنعتی یورپ کے لیے غیر صنعتی اقتصادیات کو آزاد تجارت اور دوہری معاشیات کی فتین حکمت عملی کے ذریعے مطیع و دست نگر بنانے کا موقع فراہم کردیا۔ ایڈم اسمتھ کے نقطۂ نظر کے مطابق "پرانے زمانے میں مفلس اور وحشی قوموں سے اپنا دفاع کرنا معقول اور مہذب قوتوں کو مشکل لگتا تھا، اس کے برعکس نئے زمانے میں مفلس اور وحشی، دولت مند اور مہذب قوموں سے اپنا تحفظ دشوار دیکھتے ہیں"۔

برطانوی توسیع میں ایک اہم کڑی وارن ہسٹنگز تھا۔ جس نے settlers سے زیادہ دوسروں پر مشتمل کلونیل سماج کے کاروبار کو اچھی طرح چلانے کے برطانوی نظریات کو قانونی شکل دینے کے لیے بہت سی اہم عدالتی اور آئینی اصلاحات کی نیو بھی ڈالی۔ ہندستانی علوم اور کلاسیکی زبانوں کے مطالعے کا شوق اسے عملی مصلحتوں اور علمی اسباب کی بنا پر ہوا۔ احکامات جاری کرنے، ٹیکسوں کی وصولی، قانون اور نظم و ضبط کی عملداری اور دیسی باشندوں سے متعلق دوسری متنوع معلومات حاصل کرنے کے لیے زبانوں کا سیکھنا ایک اہم اثاثہ تھا۔ ولیم جونس کا کمپنی کے ملازموں کے لیے فارسی کی ایک قواعد کا شائع کرنا، سولھویں صدی کے مورخ ابوالفضل کی آئین اکبری کا فرانسس گلیڈون کا انگریزی ترجمہ، گورنر جنرل کے اصرار پر مسلمانوں کے لیے کمپنی کے عدلیہ کے نظام کی اساس 'ہدایہ' کا چارلس ہیملٹن کا ترجمہ وغیرہ، یہ سارے کام بے سبب نہیں تھے۔

عزیز نے پائپ کا ایک کش لیا اور خلاء میں گھورا۔ وہ ہمیشہ خاصا لیا دیا رہتا تھا اور اپنی حیثیت اور اس سے متعلق اپنی شبیہہ کا اسے ہمہ وقت احساس رہتا تھا۔

ایسی تمام سرگرمیاں اس نے بتایا، ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے اہتمام میں ہوتی تھیں۔ یہ سوسائٹی 1784 میں قائم کی گئی تھی اور ولیم جونس اس کا پہلا صدر تھا۔ ان کاموں کے ساتھ ساتھ فرانسس بُش نان (Buchanan) اور نقشہ نگار کولن میکنزی کے کیے ہوئے تفصیلی سروے تھے۔ یہ سارے کام تسلط و اختیار کے کلونیل منصوبے کا ایک اہم حصہ تھے۔ اسی طرح مردم شماری کی کارروائی نے بھی ہندستانیوں کے درمیان سماجی، ثقافتی اور لسانی امتیازات کا تعین کرنے میں بڑی مدد کی۔ جو ہمہ بصری تصویر انگریز تشکیل دے رہے تھے اس نے ایک ایسے ہندستانی سماج کی تجسیم کی جس میں کشاکش اور تضادات، حکمرانوں کے خیال میں، صرف اُن کی سخت گیری ہی سے قابو میں رکھے جاسکتے تھے۔ مردم شماری (پہلی کل ہند مردم شماری 1871 میں ہوئی تھی) کا غالباً سب سے بنیادی اثر وہ تھا جو مذہب، کمیونٹی اور خود اپنی تصویرگری یا تشکل اور ان سب کے ریاست سے رشتوں کی تعیین پر پڑا۔ مردم شماری نے خیال کے متن کو عددی اور بیانیہ معلومات کی شکل عطا کی۔ تنظیمی ڈھانچے میں خیال کی categories مہیا کیں اور ان categories کے معنی اور مطلب بروئے کار لائی جانے والی تعریفوں کے وسیلے سے بتائے گئے،

"یا اللہ"۔

عزیز نے اپنا سر ہلایا۔ "جک مجھے اس طرح مت گھورو۔ میں جانتا ہوں ان میں سے بعض دلائل کو سمجھنا آسان نہیں ہے مگر مسائل کو میں ہمیشہ تو آسان اور سادہ کرکے نہیں پیش کرسکتا۔ ایک بات کا یقین ضرور ہے۔ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی دن، ایشیا، افریقہ یا مغربی ایشیا کا کوئی اسکالر مشرق کے علم اور کلونیل پاور کے استعمال کے مابین رشتے کو ثابت کردے گا۔ اس اسکالر کو پڑھنے والے بہت ہوں گے مگر اسے سنجیدگی سے صرف ان ہی ممالک میں لیا جائے گا جو کلونیل پاور کے جوئے تلے آئے ہیں۔ دوسری طرف ہر اسکالر اگر فلسطینی ہوا تو قدامت پرست اینگلو امریکن تو تمیں صیہونی حلقوں سے مل کر اس کے پیچھے پڑ جائیں گی"۔

عزیز سامنے کی دیوار پر بنے نقش و نگار کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے ذرا

دیر خاموش رہا پھر بولا، "مجھے امید ہے کہ کبھی نہ کبھی دن کلونیل حکومت کی اُن تشویشوں کے بارے میں ہمارا علم زیادہ ہوگا جو مختلف طریقوں سے عوام کی درجہ بندی کرنے کی شاہی کوششوں سے مترشح تھیں۔ اور یہی وہ وقت ہوگا جب ہم کلونیل ڈھیٹر کی اصل ماہیت کو، مارکسی علم وادراک کی معاونت سے، آشکار کرنے کی توقع کر سکیں گے"۔

اب متفق ہونے کی باری جگ موہن کی تھی۔

"آخری تجزیے میں" عزیز نے کسی قدر زور دے کر کہا، "محض نظریہ کافی نہیں ہوتا۔ اور خصوصاً ان نوجوان تاریخ دانوں کے لیے جو سستی اور کاہلی کی عادتیں ڈال لیتے ہیں اور فرضی اور خیالی نظریات میں پناہ ڈھونڈھتے ہیں۔ وہ آرکائیوز میں، وہاں کے رسائل اور ماخذوں سے رہنمائی حاصل کرنے نہیں بلکہ اپنے ان دلائل کی تصدیق کے لیے جاتے ہیں جو انھوں نے اپنی تحقیق سے قبل ہی طے کر لیے تھے۔

آج اِن سب چکروں سے نکلنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تاریخ لکھیے یا پھر لکھی ہوئی تاریخ پر نظرثانی کیجیے۔ اور اسے 'نئی' تاریخ کہیے۔ اس شہر میں بہت کم لوگ ہیں جو امیرالدولہ لائبریری یا سکریٹریٹ کی عمارت میں واقع آرکائیوز کو استعمال کرتے ہیں۔ کتابوں اور دستاویزات پر دھول جم رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے جو الہٰ آباد کے اسکالروں نے ہم پر سبقت حاصل کر لی ہے۔

"میں نے الہٰ آباد اور لکھنؤ کے درمیان ثقافتی کشمکش تو سنی ہے مگر ان دونوں کی باہمی علمی رقابت کے بارے میں کچھ نہیں سنا"، پردیپ نے کہا۔

"کلونیل علوم کی بات کرتے ہوئے"، جگ موہن نے مداخلت کی، "کل میری نظر ہندستانی تعلیم کے بارے میں لارڈ میکالے کی رپورٹ پر پڑی"۔

"مگر تم نے اسے پڑھا کہاں؟" پردیپ نے کسی قدر حیرت زدہ ہوکر پوچھا۔

"پانیر میں .... سنو میکالے نے کیا لکھا تھا"

"تمھارا تلفظ ٹھیک نہیں ہے"۔

"کیا؟"

"میکالے؟" چلو چھوڑو، تم پڑھو"۔

"اسے دیکھو" جگ موہن نے اپنی جیب سے پانیر کا سنڈے ایڈیشن نکالا اور بڑے فخریہ انداز میں پردیپ کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ "میکالے نے مستشرقین کو اپنی اس بات سے اتفاق رائے کرتے ہوئے پایا کہ اچھے یوروپین ادب کی ایک الماری ہندستان اور عرب کے سارے دیسی ادب کے برابر ہے۔ انھوں نے اس خیال کی بھی تصدیق کی کہ عربی اور سنسکرت شاعری کا یورپی زبانوں میں کی جانے والی شاعری سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے اس نے نتیجہ نکالا کہ سارے سنسکرت لٹریچر سے ملنے والی معلومات، ابتدائی انگریزی مدرسوں میں استعمال ہونے والی حقیرترین چھوٹی چھوٹی کتابوں سے حاصل ہونے والی معلومات کے مقابلے میں کہیں کم مفید تھی۔ انگلستان کا ادب، اس کے خیال میں، متقدمین کے ادب سے کہیں زیادہ سودمند اور موثر تھا۔ اسے تو سنسکرت ادب کے اپنے سیکسن (Sexon) اور نارمن (Norman) اجداد کے ادب سے بہتر ہونے میں بھی شبہ تھا۔ کتنا حماقت آمیز نقطۂ نظر تھا یہ!"

"ایک عجیب سوال ذہن میں آتا ہے" پردیپ نے اچانک کہا، "تمھاری جیبوں میں اور کیا ہے؟"

جگ موہن ہنس پڑا۔ "لوگوں سے گستاخی کرو اور وہ تمام باتیں کرو جو میں اب نہیں کرسکتا۔"

پردیپ کی باچھیں کھل گئیں۔

"ہمارے ملک کی ثقافتی روایات کی طرف ایک انتہائی بے رحمانہ تحقیر آمیز رویہ رکھتے ہوئے" جگ موہن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "میکالے نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایک ایسے ادب کے مطالعے کی ہمت افزائی نہ کرے جو عقل و دانش اور اخلاقیات سے شاذ ہی کوئی تعلق رکھتا ہو۔

"شاباش!" عزیز نے کہا، "لارڈ ایکلن کا خیال تھا کہ یہ ہندستان کی بدقسمتی

تھی کہ برطانوی نظامِ تعلیم کی ابتدا ایک ایسے شخص کے ہاتھوں ہوئی جو سترھویں صدی سے قبل ہونے والے واقعات کے بارے میں، بدیسی تاریخ، مذہب، فلسفہ، سائنس یا آرٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ بہر حال، اب ہمیں اپنے پچھلے چند دنوں کے تبادلہ خیال پر ایک مجموعی نظر ڈال لینا چاہیے۔"

"مگر .... بھائی صاحب .... اقتباسات اور نہیں ہوں گے"۔ پردیپ نے عزیز سے درخواست کی، "میکالے کا یہ اقتباس طویل بھی تھا اور تھکا دینے والا بھی۔"

"اس میں میری کوئی غلطی نہیں ہے، اگر میں اس طرح حوالے نہ دوں"۔ عزیز نے اپنی عادت کے مطابق اونچی آواز اور تکبر اور تحکم والے لہجے میں کہا، "تو تقریباً دو صدیوں کی تاریخ کے ذکر میں زمانے گزر جائیں گے۔ میں جو کہہ رہا تھا وہ یہ تھا۔ اٹھارھویں صدی کی آخری دہائیوں میں، مشرقی استبداد اور اس کے ساتھ ماضی میں عظیم اور آج شکست خوردہ اور مایوس ہندستان کی صداقت کے اعتراف کی روشنی میں انگریزوں نے اس سر زمین کے بارے میں اپنے پرانے تصورات کو مرکوز کرنا شروع کیا۔ انھوں نے تجزیے کی بنیادی categories کا تعین کیا، ایک تقابلی لسانیات کی تشکیل کی اور ہندو اور مسلمان آئین و ضوابط کا ایک دیرپا ڈھانچہ قائم کیا۔ مگر انگریز ابھی تک مبہم اور نامکمل طور پر سمجھے ہوئے متفرق اور منتشر ٹکڑوں کے ساتھ کام کررہے تھے۔ اور انھیں انھوں نے ہندستان کے ایک مثالی (idealised) تصور کے چوکھٹے میں لگا رکھا تھا جس نے اس کے حال کو ایک اور ماضی بنا دیا تھا۔ 19 ویں صدی میں برصغیر کی فتح اور وکٹورین عہد کے سائنٹفک ساز و سامان کی تخلیق کے ساتھ، ہیسٹنگز اور جونس کے عہد کے منتشر اور بکھرے ہوئے ادراک کو انھوں نے ایک آئیڈیالوجی میں مربوط کیا جس نے ہندستان کے پرانے اختلاف اور یورپ سے اس کے رشتے کی وضاحت کی کوشش کی۔

"یہ امیر حمزہ کی داستان نہیں ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک مناسب موقع ہے"۔ عزیز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، "ہیسٹنگز کی طرف مراجعت

کرنے کا کہ جس نے ضمنی اتحادی نظام (اس نظام کی بنیاد پر ایک ہندستانی ریاست کچھ شرائط کے ساتھ خود اپنے تحفظ کے لیے برطانوی فوجوں کو کچھ مالی امداد دیتی تھی) کے ذریعے ہندستانی ریاستوں کو نوآبادی میں تبدیل کیا۔ ہماری تاریخی یادداشت میں، اُس نے نندکمار کو پھانسی پر لٹکایا، اودھ کی بیگمات کو پریشان کیا اور بنارس کے راجہ جیت سنگھ کو اذیتیں دیں۔ ابھی ہیسٹنگز زندہ تھا اور اثر و رسوخ میں اپنے عروج پر تھا، (1773 کے ریگولیٹنگ ایکٹ کے تحت قائم کی ہوئی) کونسل نے اس کی پالیسیوں پر حملے کیے خصوصاً روہیلہ جنگ۔ اس کی جارجیت اور ناعاقبت اندیشیاں کچھ اتنی زیادہ تھیں کہ ایڈمنڈ برک، چارلس فاکس اور برنسلے شیریڈن نے پارلیمنٹ میں اس پر شدید نکتہ چینی کی۔ برک نے ہیسٹنگز پر محض بنگال میں مالیے کے غلط استعمال سے لے کر بنارس اور اودھ کے حکمرانوں سے جبریہ چندے وصول کرنے تک کے نہ صرف خصوصی الزام بلکہ ناشنیدہ ظلموں اور بے نظیر تباہ کاریوں کے عام الزامات بھی لگائے۔ اس نے گورنر جنرل کو طوطا چشم کائیاں اور سور فروش کہا اور ہر چہار طرف پھیلی ہوئی بدعنوانیوں میں سر سے پیر تک ملوث قرار دیا۔

جگ موہن نے عزیز کی طرف ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے چینی سے پوچھا، "تم یہ سب باتیں بیچ میں کیوں لا رہے ہو؟"

"تمھیں یہ بتانے کے لیے"، اس کی طرف بغیر دیکھے ہوئے عزیز نے کہا، "کہ ہیسٹنگز کا مقدمہ، ایک فرد کا مواخذہ نہیں بلکہ استبداد کی تشویشوں کا دستاویزی ثبوت تھا جہاں قیدی اور مستغیث دونوں استعمار کے جرم کے عدم اثبات میں یکساں ملوث تھے۔ برک کی باتوں کو اگر ان کے منطقی انجام تک لے جایا جاتا تو مقدمہ صرف اس کے مواخذے پر نہ ختم ہوکر خود کمپنی کی حکومت کی منسوخی پر ختم ہوتا۔ مگر اس بات کی توقع کے لیے نہ تو برک ہی تیار تھا اور نہ ہی برطانوی عوام۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے کہ ہیسٹنگز رہا ہوگیا اور رچرڈ کولے اور اَرل آف مِرنگ ٹن (بعد کو مارکوئز ویلزلی) بھی۔

عزیز سانس لینے کے لیے رُکا۔ اس کے ہونٹ کانپے اور عینک کے شیشے

دھندلا گئے۔ مقدمہ سات برسوں (1788-1795) پر پھیلے ہوئے 142 دن چلا۔ اہم بات یہ ہے کہ ہیسٹنگز کے جانشینوں کی جنھوں نے 1857 تک کمپنی کے معاملات کی سربراہی کی، رہنمائی ہیسٹنگز کی وراثت ہی نے کی۔ مثال کے طور پر، ویلزلی (گورنر جنرل 1797-1805) مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ اختلاف کی جڑیں کھود کر پھینک دیں اور ان علاقوں میں کمپنی کے مفادات کو محفوظ کردیا جہاں انگریز فرانس اور ان کے اتحادیوں کے حملوں کے ہدف تھے۔ یہاں تک کہ دسمبر 1789 میں انقلاب فرانس کے سال میں اس کو بتایا گیا کہ تیمور کا قلعہ، تیمور، چھوہارے جیسا سوکھا بوڑھا، جسے مارکس نے طنزاً مردہ ماضی کی علامت کہا تھا، ایسا مسمار ہوچکا ہے کہ اب پھر کبھی نہ بن سکے گا۔

ویلزلی نے مدافعت کے گڑھ میسور کے راج کو تباہ کیا، نظام کی فرانس کی تربیت یافتہ بٹالین کی شکست و ریخت کی، سورت کے نواب کو 1799 میں پنشن پر بھیج دیا گیا۔ کمپنی نے شیواجی کے باپ شاہ جی کی قائم کی ہوئی ریاست تنجور پر قبضہ حاصل کیا اور 1801 میں کرناٹک کو بھی اپنے تسلط میں لیا۔ مورخ پی.ای. رابرٹس نے لکھا ہے کہ تنجور اور سورت کو بڑا فائدہ ہوا۔ دونوں جگہوں پر برطانیہ نے بہت عرصے تک حقیقی طاقت و حکمرانی کا تسلط رکھا۔ دونوں میں حکمران خاندانوں کے جذبات و احساسات کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔ شہزادوں کو ان کی جانشینی کے وقت شرائط و ضوابط سے آگاہ کردیا جاتا تھا۔

کچھ غور کرتے ہوئے پردیپ کی پیشانی پر بل آئے۔ "اسے کہتے ہیں ناقابل حمایت کی حمایت کرنا"۔

عزیز نے 1802 کے معاہدۂ واسی (Bassesin) کا تذکرہ شروع کیا۔ یہ معاہدہ ایک ناکارہ اور نکمے شخص پیشوا کے ساتھ ہوا تھا جس نے برطانیہ کو دکن پر وہی فوقیت عطا کردی جیسی انھیں جنوب میں سرنگاپٹنم نے دلائی تھی۔ اس نے 17 دسمبر 1803 میں برار کے بھونسلے راجا کے ساتھ دیوگاؤں اور 30 دسمبر کو دولت راؤ سندھیا کے ساتھ سُرجی- ارجن گاؤں کے ان معاہدوں کا حوالہ دیا جو ویلزلی کی کامرانیوں کے

عروج کی علامت تھے۔ بہت پہلے، متعدد سیاسی آندھیوں کا مرکز اودھ، اپنی قیمتی اور کار آمد شمال مغربی ریاستیں اپنے ہاتھوں سے کھو چکا تھا۔ 1775 میں نواب نے بنارس کا علاقہ اور غازی پور کا مالیہ بھی عطا کردیا۔ 1799 میں برطانیہ نے الہٰ آباد اور اس کے قُرب و جوار کے علاقے ہتھیا لیے۔ پھر 1801 میں گورنر جنرل کے بھائی ہنری ویلزلی نے نواب کو اپنے علاقوں میں سے نصف کو (دو آبہ گنگ و جمن) کمپنی کے حوالے کر دینے پر مجبور کردیا۔

ویلزلی اپنے منصوبوں کے اس سے زیادہ کامیاب اور خوشگوار اختتام کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے چیف سکریٹری نے 1805 کے اوائل میں، حق بجانب اور ضروری لڑائیوں کے ذریعے اور کیے ہوئے معاہدوں کے تحت ملنے والے مثبت حقوق کی روشنی میں، برطانوی علاقوں میں ہونے والے اضافوں کا تحریری اعتراف کیا۔ وہ یقیناً برطانوی قوم پرستی کے ایک نئے احساس سے سرشار اور اتنی کم مدت اور ناموافق حالات میں برطانیہ کی کامرانیوں پر مفتخر نسل کی ایک ممتاز اور موثر علامت تھا۔ پھر بھی برطانوی پالیسی ساز، ویلزلی سے، اس کے آئینی اصولوں کو نظرانداز کرنے کے طریقوں سے ناخوش تھے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے حکم عدولی کی بہت سی مثالیں بیان کیں جن میں عمل داری کے حلقے کو بڑھانے کی اسکیموں کا حوالہ بھی تھا اور یشونت راؤ ہولکر سے جنگ میں ابتدائی ہزیموں پر نکتہ چینی بھی۔

ان کا یہ رویہ نتیجہ تھا ان پرانے اختلافات کا جو لندن اور ہندستان میں کمپنی کے ملازموں کے مابین چلے آرہے تھے۔ اور جس کا انجام ریگولیٹنگ ایکٹ کی شکل میں سامنے آیا تھا۔ ایکٹ میں فراہم کی گئی گنجائشوں نے اگرچہ ناکافی تھیں، کمپنی کے معاملات میں پارلیمانی کنٹرول کو نسبتاً زیادہ کردیا۔ گورنر بنگال، بدل کر گورنر جنرل آف بنگال ہوگیا اور چار افراد پر مشتمل ایک کاؤنسل، اکثریت کی بنیاد پر دیے گئے مشوروں سے اس کی مدد کرنے لگی۔

"نوجوان Pitt کے 1784 کے انڈیا ایکٹ نے"، عزیز نے رک کر جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے وضاحت کی، "ریگولیٹنگ ایکٹ کی جگہ لی۔ اپنے اختیار پر اصرار کرنے

کے لیے پارلیمنٹ نے وزیروں اور پریوی کاؤنسلرز (Privy Councellors) پر مشتمل ایک بورڈ آف کمشنرس قائم کیا۔ وزیروں میں ایک کو پریسیڈنٹ کا نام دیا گیا جو بعد کو سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کہلایا۔ اس ایکٹ کے تحت بنایا جانے والا پہلا گورنر جنرل کارنوالس تھا۔ کارنوالس کے بعد جارج بارلو (07-1805) پھر گلبرٹ ایلیٹ، ارل آف منٹو (13-1807) اس عہدے پر فائز ہوئے۔

واقعات کے تسلسل، ان کی سرعت اور تاریخوں میں جگ موہن جیسے الجھ کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں تو بہت سے سوالات تھے مگر اس وقت وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا کمپنی ویلزلی کے جانشینوں کو قابو میں رکھنے میں کامیاب ہوئی یا نہیں؟

"کچھ بہت نہیں"، عزیز نے کسی قدر تندی کے ساتھ کہا، "نہیں تو انگریز نیپال کی جنگ (18-1814)، پنڈاری کی لڑائی (19-1817)، تیسری مراٹھا جنگ (19-1817) اور پہلی جنگ برما (28-1824) : لڑے ہوتے۔ اسی طرح ولیم بینٹک (گورنر جنرل 35-1828) نے شمال مشرق میں کچار پر قبضہ نہ کیا ہوتا، اودھ کے حکمرانوں کو غصب کرنے کی دھمکی نہ دی ہوتی، انتظامیہ کو انگریزوں کے ہاتھ میں دینے کے لیے میسور کے حکمرانوں کو ہٹایا نہ ہوتا (1831)۔ جان میلکم، جس نے 'دی پولیٹکل ہسٹری آف انڈیا' لکھی تھی، الحاق اور قبضوں کو اس بنیاد پر حق بجانب قرار دیتا ہے کہ کمپنی کے علاقوں اور اس کی افواج میں اضافہ ذاتی سلامتی کی شرط بن گیا تھا۔ اس نے اُن فوائد کی بات کی جو برطانیہ عظمیٰ نے اپنے ہندستانی مقبوضات سے حاصل کیے تھے اور چاہا کہ لندن اُن خطرات پر بھی غور کرے جو ان مقبوضات کے ہاتھ سے نکل جانے کی صورت میں پیش آسکتے تھے۔"

"یہ تمھیں اتنی جگہوں کے نام اور تاریخیں یاد کیسے رہتی ہیں؟" پردیپ نے آہستہ سے پوچھا۔

کچھ دن ہوئے چارس لیمب کے مضامین کی ایک کاپی تمھارے گھر سے میرے ہاتھ لگی تھی۔ غالباً تمھاری بیٹی سُنیتا اسے پڑھ رہی تھی۔ کتاب میں مجھے اس کی

ظاہر کی ہوئی یہ رائے نظر آئی کہ آج کے اسکول ماسٹر سے توقع یہ کی جاتی ہے کہ وہ ہر چیز کے بارے میں تھوڑا تھوڑا ضرور جانے گا کیونکہ اس کے شاگردوں کو ہر چیز سے پورے طور پر واقف ہونا چاہیے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ استاد کے لیے ہر فن مولا ہونا ضروری تھا۔

"میں گھر جاکر اس کی تصدیق کروں گا"، پردیپ نے کہا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے حکمران اپنی گدّیوں پر بیٹھے انگریزوں کو اقتدار چھیننے کی اجازت دیتے رہے — یا اللہ۔ سکھوں، جاٹوں اور راجپوتوں کی اُن عسکری نسلوں کو کیا ہوا جنھوں نے مل کر مغل شہنشاہیت کو مسمار کردیا تھا۔ انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان کا غرور کہاں گیا، ان کے بانک پن اور ان کی جوانمردی کو کیا ہوا؟

"تم کچھ جھنجھلائے ہوئے اور غصے میں لگتے ہو۔ مرچنٹ آف وینس کی یہ لائنیں تمھارے اعصاب کو شاید کچھ سکون دیں۔

To buy his favour I extend this friendship

If he will take it, so; if not adieu;

And, for my love, I pray you wrong me not.

ایسا لگتا تھا کہ پردیپ پر متعدد مختلف اور متضاد جذبات کچھ اس طرح مسلط ہوگئے تھے کہ وہ اس پوری بحث کے دوران ایک حرف نہ بولا۔

ایسا نہیں ہے کہ مغل خاندان کے طویل جھٹپٹے میں نمودار ہونے والے ہندستانی جنرل اور ان کے آقاؤں نے بغیر کسی مزاحمت کے ہتھیار ڈال دیے، اطاعت قبول کرلی۔ انھوں نے مقابلہ کیا مگر خودساختہ قوم پرست تاریخ دانوں کے بتائے ہوئے وطن دوستی کے اسباب کے لیے ہرگز نہیں۔ کچھ عرصے کے لیے مراٹھوں نے انگریزوں کو چیلنج کیا، ڈیڑھ سو سال سے اوپر کی مدت میں انھوں نے ہندستان کے سیاسی اور ثقافتی جغرافیہ کو بدل کر مہاراشٹر سے بہت دور پرے تک اپنی عسکری اور سیاسی قوت کو مستحکم کرلیا مگر 14ر جنوری 1761 کو احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں پانی پت کے مقام پر ان کی شکست فاش نے ان کے مقدر پر مہر لگادی۔ پلاسی نے اگر ہندستان

میں برطانوی تفوق کے بیج بوئے تو پانی پت نے انھیں جڑیں پکڑنے اور مستحکم ہونے کے لیے وقت فراہم کیا۔ 1803 کے موسم برسات میں ویلزلی کی مہموں نے ان کے کفن میں آخری کیل ٹھونک دی۔ فروری 1818 کے برطانوی اعلان نے پیشوا کو باقاعدہ طور پر معزول کردیا اور مراٹھا مملکت ختم ہوگئی۔

مراٹھا اتحاد ختم اس لیے ہوا کہ ان کی باہمی ہم آہنگی، مصنوعی اور اتفاقی تھی اور اس لیے غیراختیاری تھی۔ اسی لیے ان کی مملکت کی تیز رفتار توسیع نے دراڑیں پیدا کیں جن سے یوروپین حکومت اور فوج دونوں نے مسلسل فائدہ اٹھایا۔ دوسرے یہ کہ مراٹھا مملکت ان بنیادی ریتوں اور رواجوں کی تشکیل میں بھی ناکام رہی جو کسی سلطنت کی تعمیر کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ جیسا کہ 1761 میں مورخ آزاد بلگرامی نے اشارہ کیا تھا۔ ان کے لیڈروں نے اکثر حکمرانوں کے بجائے زمینداروں کے طور طریقے اپنائے۔ انگریزوں نے اس وقت بھی جب وہ ٹیپو سلطان کے خلاف سہ فریقی اتحاد کے ایک رکن تھے، انھیں وحشی، سرکش، ناقابل اعتبار، بدتربیت اور توہم پرست بنا کر پیش کیا تھا۔ آخری بات یہ کہ انگریزوں کے خلاف اپنے وسائل کو یکجا و متحد کرنے کے لیے مراٹھا لیڈر بہت کمزور اور بٹے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بھی اپنے آپ کو متحد اور منضبط نہیں کرسکے جب کہ خود ان کا وجود داؤں پر لگا ہوا تھا۔ 1801 کی ساری مدت میں شندے اور ہولکر، جنوبی مالوہ میں خوں ریز لڑائیاں لڑتے رہے۔ اُجین کے اطراف میں بھی لوٹ اور غارتگری عام تھی۔

اُسی وقت جگ موہن کو اپنے گھر کے کسی کام سے دہلی بھاگنا پڑا۔ اس کے ماموں سیالکوٹ کے ایک بڑے تاجر کو مجبوراً اپنا سارا کاروبار امرتسر آنے والی آخری ٹرین میں بیٹھنے سے پہلے سستے داموں بیچنا پڑا تھا۔ وہ اپنے آخری پڑاؤ دہلی میں، دیوالیہ ہونے کے خوف سے حیران و پریشان زبردست مایوسی کے عالم میں تھے۔ ہر چیز کھو دینے کے بعد اپنے کاروبار کو پھر سے شروع کرنے کے لیے، پناہ گزینوں کو الاٹ کی جانے والی زمینوں کے ایک ٹکڑے کو حاصل کرنے کے لیے وہ در در کی خاک چھان رہے تھے۔ بے شمار سفارشی خطوط لیے ہوئے، جگ موہن نے راجدھانی میں متعدد

سیاست دانوں اور سرکاری حکام سے ملاقات کی ابتدا میں اسے صرف ناکامی ہاتھ آئی۔ بعد کو ارونا آصف علی، بر دولا سارا بھائی، رفیع صاحب اور جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملاقات کا فائدہ ہوا۔ اس کے ماموں کو جنگ پورہ میں ایک قطعہ زمین الاٹ ہوگئی۔ قدوائی صاحب نے پانچ ہزار روپے کے قرض کا بھی انتظام کردیا۔ رفیع صاحب، کہ وہ اسی نام سے زیادہ جانے جاتے تھے، ضرورت مند پناہ گزینوں کی خاطر اپنی جیب میں ہاتھ ڈالنے کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ان کے جوش و خروش اور دنیاوی ظاہر کے پیچھے، ان کے اندر ایک بڑی ہی غیر متوقع جذباتیت تھی۔

جگ موہن کی عدم موجودگی میں عزیز اپنی گفتگو میں کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ اس نے پردیپ کو بتایا کہ حیدر علی اور اس کا بیٹا ٹیپو، انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے ہر اول کے دو مقبول ترین اور دل رُبا افراد تھے۔ حیدر علی نے جو فوج کے عام سپاہی سے ترقی کرکے نمایاں مرتبوں تک پہنچا تھا، درباری سازشوں کا توڑ کیا، اپنے مخالفین کو نیچا دکھایا اور ایک سپاہی جنرل کی حیثیت سے شاندار خدمات انجام دیں۔ اس کی فوجی کامرانیوں کے ذکر کو مختصر کرتے ہوئے عزیز نے اینگلو میسور جنگ (1761-69) کا ذکر کیا جو انگریز-مراٹھا اور نظام کے اتحاد کو توڑنے کا سبب بنی تھی۔ اس نے مراٹھا - میسور جنگ (1769-72) سے حیدر علی کی کامیاب واپسی اور پچھلے معرکوں میں ہاتھ سے نکل جانے والے علاقوں کی بازیافت کی بات کی۔ آخر میں اس نے 1780 میں انگریز فوجوں کے ہتھیار ڈالنے کی تفصیلی تصویر کشی کی جو ہندستان میں انگریزوں کو لگنے والا سب سے بڑا دھکا تھا۔ اس نے حیدر علی کی موت سے چند ماہ قبل 6/ دسمبر 1782 کو تنجور میں Braithwaite کی شکست کا بیان بھی کیا۔

انگریز مورخ G.B.Malleson نے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ میسور کا حکمراں وہ واحد شخص تھا جو میدان جنگ میں انگریزوں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ یہ حیدر علی تھا جس نے انگریزوں کو امن کا حکم دیا۔ یہ حیدر علی ہی تھا جس نے پلاسی ۔کے میدان میں اُس جنرل کا کڑا مقابلہ کیا جو کلائیو کا دایاں ہاتھ سمجھا جاتا تھا اگرچہ اس جنگ میں حیدر کی موت ہوگئی مگر اس کے بیٹے نے جہاد کو جاری رکھا۔ سترہ سالہ فتح علی (بعد

کو جس کا نام صوفی ٹیپو سلطان اولیاء کی نسبت سے ٹیپو پڑا) نے 1777 میں اینگلو-میسور جنگ میں پہلی بار کمان کی ذمہ داری سنبھالی۔ ٹیپو کو جو علاقہ ورثے میں ملا تھا وہ شمال میں دریائے کرشنا اور دھارواڑ سے لے کر جنوب میں ڈنڈی گل سے پرے تک پھیلا ہوا تھا۔ مغرب میں کرناٹک کے میدانوں کے گھاٹ اور مشرق میں بحیرۂ عرب نے اس علاقے کی حدبندی کی تھی۔ یہ اور ان کے ساتھ مغربی گھاٹوں نے، میسور کے پلیٹو پر مستقبل کے حملہ کرنے والوں کے لیے ایک قدرتی روکاوٹ بنا دی تھی۔ سلطنت کے اہم شہری مراکز میں دریائے کاویری کے کنارے راجدھانی سرنگاپٹم اور مزید شمال میں بنگلور کا شہر تھا۔ ان جگہوں پر مشرقی اور مغربی ساحلوں سے اور شمال میں حیدر آباد سے سامان آتا تھا۔ یہاں سے لکڑی، اناج اور کپڑے کی برآمد ہوتی تھی۔

1797 میں سرنگاپٹم ایک ترقی کرتا ہوا اور خوشحال شہر تھا۔ مختلف جگہوں پر وافر مقدار میں غلّے کا ذخیرہ تھا اور اسٹاک میں اتنا مزید فاضل غلّہ موجود رہتا تھا جو اگلے تین برسوں تک کام آسکتا تھا۔ بحیثیت مجموعی ساری قلمرو میں زیرکاشت علاقے میں معتدبہ اضافہ کیا گیا تھا۔ گنّے، گیہوں اور جَو کی کاشت میں اچھا خاصہ اضافہ اور بہتری کا اہتمام ہوا تھا۔ پان، اناس، کیکر، ساگوان، آم، چھالیا اور صندل کے درختوں کی پیداوار میں توسیع اور اضافے کی کوششیں ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوسکا تھا کہ ٹیپو نے مالیاتی نظام میں اصطلاحات کی تھیں، کاشتکاروں کے مفادات کا تحفظ کیا تھا، انھیں تقاوی قرضے ملنے کی آسانی فراہم کی تھی اور ریوینیو کلکٹر اور جاگیردار کے کارندوں کے ظالمانہ اور من مانے طریقہ کار پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ اسی وجہ سے لفٹننٹ مور کو ملک آباد، زراعت اچھی نظر آئی اور وہاں کے جفاکش باشندے خوش اور مطمئن ملے۔ نئے قائم کیے ہوئے شہر اور قصبے بھی اسے ترقی کی راہ پر گامزن لگے۔

جگ موہن لکھنؤ واپس آیا۔ دہلی کے چاندنی چوک کی ایک مشہور مٹھائی کی دوکان کی مٹھائیوں سے لدا پھندا، سکریٹریٹ کے قریب بنے ہوئے چھوٹے سے چرچ کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں اس گیت کی آواز آئی۔

"The Kingdom stands and grows for ever.

Till all thy creatures own thy sway."

دیکھنے میں بہت خوش اور مطمئن اس نے دہلی میں بڑے بڑے لوگوں سے اپنی ملاقاتوں کا حال سنایا۔ اسی وقت ہمایوں اندر داخل ہوا۔ اس کا پیٹ حسب معمول بڑھا ہوا اور بیلٹ کے اوپر نکلا ہوا تھا۔ اس نے آدھی آستین کی قمیص پہن رکھی تھی گلا کھلا ہوا اور شانوں کے پاس قمیص پر شکنیں۔ وہ کنارے کی میز پر بیٹھ گیا۔ اہم مسائل پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے اس نے دولت، سیاست کو کس طرح خراب کررہی ہے، اخباروں کے اداریوں پر اشتہارات کا کیا اثر ہورہا ہے، جیسے اپنے خیال میں معمولی موضوعات پر کچھ بات کی۔ "پیپانی کے نواب صاحب کو آداب عرض کرتا ہوں"۔ پردیپ نے ہمایوں کا استقبال کیا۔

کسی قدر جھیپا جھیپا ہمایوں ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور منتظر رہا کہ عزیز اپنی بات شروع کرے۔ اس نے اپنے گروپ سے ملنے کا ہفتوں انتظار کیا تھا۔

"جس عرصے میں جگ موہن غیر حاضر تھا ہم نے بات کی کہ میسور کے حکمران کو کس طرح اس کی اصل حیثیت پر پہنچایا گیا۔ ٹیپو کو اپنے نصف علاقے کو چھوڑنے اور تقریباً تیس لاکھ پاؤنڈ تاوان دینے پر مجبور کیا گیا۔ سب سے زیادہ بے عزتی کی بات یہ کہ اس نے اپنے دو چھوٹے چھوٹے بیٹوں کو یرغمال کی حیثیت سے دے دیا۔ آٹھ سال کا عبدالخالق، اور پانچ برس کا معزالدین۔ سرنگاپٹم کے معاہدے نے اس کے مقدر پر مہر لگادی۔ اس کا حوصلہ پست تھا۔ چوتھی اینگلو میسور جنگ میں اس کی فوج لنگڑی لولی اور بے دست و پا ہوچکی تھی۔ نظام اور مراٹھوں نے خود اپنے سامنے آنے والے خطرات سے بے خبر کمپنی کے سب سے زیادہ مستقل مزاج مخالف کے زوال میں مدد کی۔ اپنے قول کو صحیح ثابت کرتے ہوئے کہ شیر کی طرح ایک دن زندہ رہنا، بھیڑ کی لمبی عمر سے کہیں بہتر ہے، میسور کا یہ شیر لڑتے ہوئے مارا گیا۔

"اوہ"، ہمایوں نے پلک جھپکائے بغیر کہا، "اتنے بہادر اور جری آدمی کی شکست کا سبب کیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ میں اس سوال کا جواب دوں مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ حیدر اور ٹیپو کا کارنامہ بھی کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ انھوں نے ایک چھوٹی سی قلمرو کو ایک اہم سلطنت کے درجے تک پہنچا دیا اور اسے باہر کی عظیم دنیا کے رابطے میں لے آئے۔ ایسے افراد کسی بیرونی طاقت کے سیاسی اقتدار کے سامنے کیسے جھک سکتے تھے؟ نہیں وہ ایسا نہیں کرسکتے تھے۔ اینگلو میسور تعلقات میں جو اہم عنصر کارفرما تھا وہ تھا مرکزی اتھارٹی کے ختم ہوجانے سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنا۔ کمپنی نے حیدر علی کے زمانے میں غیر محسوس طریقے پر ایک تابع اتحاد کا نظام قائم کیا جس کی رو سے ایک ہندستانی ریاست کو یا تو کمپنی کے اقتدار کو تسلیم کرنا ہوتا تھا یا پھر اپنے کٹرپن اور اپنی انتہاپسندی کی قیمت ادا کرنی ہوتی تھی۔ جب تک حیدر علی اور ٹیپو نے حکومت کی اس وقت تک فوقیت جڑیں نہیں پکڑ پائی اور اسی لیے اُن سے کمپنی کے تعلقات کشیدہ ہی رہے۔

"جہاں تک ٹیپو کی شکست کا معاملہ ہے، اس کے متعدد اسباب اور وضاحتیں آج بھی موجود ہیں۔ جیمس مِل کا خیال ہے کہ حیدر علی کا مقابلہ اگر صرف برٹش کمپنی سے تھا تو ٹیپو کو حکومت اور کمپنی دونوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان دونوں کے مشترکہ وسائل جنگ میں ان کے معاون و مددگار ہوئے۔ دوسرے مصنفین ہیں جو ویلزلی کے ہاتھوں بالآخر ٹیپو کی شکست میں نظام اور مراٹھوں کے اتحاد کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ حسن اتفاق سے یہ بات اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ اُس وقت مذہبی رشتوں سے صَرف نظر کرتے ہوئے کس طرح سیاسی رشتے قائم ہوتے تھے۔ اور یہ کہ اٹھارھویں صدی کے راجاؤں اور نوابوں نے کس طرح اسلام یا ہندوازم کے محافظ کے بجائے محض آزاد و خودمختار حاکموں کی طرح حکمرانی کی۔ یہ بات پچھلی صدی کے لیے بھی صحیح ہے۔ راجپوتوں اور مغلوں کے درمیان ہونے والی کشمکش کوئی کمیونل تنازعہ نہیں تھی بلکہ وہ ایک محدود اور مقامی سیاسی نظام اور ایک توسیع پسند سلطنت کی باہمی چپقلش تھی۔ راجپوت اپنے مذہب کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ اپنے فرقے کی سرداری کے تحت چلنے والے ایک سیاسی ڈھانچے کو بچانے کے لیے لڑے۔"

"مجھے ایسا لگتا ہے"، ہمایوں بولا، "تم خود اس کی نوکر شاہی کی غداری کو بہت اہمیت نہیں دیتے ہو، نوکر شاہی جس کا سربراہ اس کا اہم وزیر اور معتمد میر صادق تھا۔ میر صادق وہی تو تھا جس کے بارے میں اقبال نے کہا تھا، "ننگِ آدم، ننگِ دین، ننگِ وطن"۔

"میں تو یہ کہوں گا"، عزیز کسی قدر بدمزگی کے ساتھ بولا، "کہ علاقائی ریاستیں، فضول خرچ عدالتوں اور نوکرشاہی پر انحصار کی وجہ سے دبی ہوئی تھیں۔ اٹھارھویں صدی کے بحران کا اصل سبب سماج اور حکومت کا باہمی رشتہ تھا۔ اس نے بڑے سنجیدہ مسائل پیدا کیے اور بالآخر سماجی ترقی اور اقتصادی نشوونما کے امکانات کو تباہ کردیا"۔

"لیکن"، پردیپ نے عزیز کو یاد دلایا، "تم نے یہ نہیں کہا تھا کہ ٹیپو اس بات سے واقف تھا کہ برطانیہ کی طاقت کی بنیاد تجارتی خوشحالی ہے اور یہ کہ ہندستانی حکمرانوں میں وہ واحد آدمی تھا جس نے تجارت اور صنعت کو ترقی دینے کی اہمیت کو سمجھا تھا"۔

"ہاں، میں نے کہا تھا۔ اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس نے ایک مستحکم مالیہ (ریوینیو) اور ایک مستحکم تجارتی اور صنعتی نظام کی بنیاد بھی رکھی۔ اسی کے ساتھ خود اس کے مقاصد، ایک سول سوسائٹی کی تشکیل کے کام اور یورپ میں جاگیرداری نظام سے سرمایہ داری نظام کی طرف پیش قدمی سے متعلق جائداد اور سماجی و اقتصادی تبدیلی کی تخصیص (Individualisation) کا سارا ڈھانچہ مناسب توانائیوں اور تناظر کی عدم موجودگی کی وجہ سے فاسق ہوگئے۔ وہ چاہے زراعت سے منسلک ہوں یا چاہے صنعت یا تجارت کے بارے میں۔ ٹیپو کی ہر پہل آئین جہاں داری اور سیاست اور نوکر شاہی کی بالادستی کی جوڑ توڑ کی نذر ہوگئی۔

"جائداد کی تخصیص یا Individualisation کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کافی عرصے تک خاموش رہنے کے بعد جگ موہن نے پوچھا۔ ایش ٹرے میں ہمایوں کی

سگریٹ بدستور سلگ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے سب ہی خاموش ہوگئے۔

"میں سمجھتا ہوں"، عزیز نے جواب دیا، "کہ اس کا مطلب کسی بڑی اکائی کے برعکس جائداد کو کسی ایک شخص کے حوالے کردینا ہے"۔

اب سوال کرنے کی باری پردیپ کی تھی۔ "اور سرمایہ داری کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اور جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف پیش قدمی کا ذکر جو تم نے کیا ہے؟

"کیپٹل ازم"، عزیز نے جواب دیتے ہوئے کہا، "پیداوار کے ایک طریقے کو ظاہر کرتا ہے جس میں سرمایہ اپنی مختلف شکلوں میں، پیداوار کا اصول ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا کے سراغ مختلف جگہوں پر ملتے ہیں۔ کہیں تجارتی سرمایہ اور بیرونی تجارت کی ترقی میں یا جاگیرداری نظام میں، فیوڈل رینٹ اور خدمات کے تبادلے کے واسطے سے زر کے لین دین کے فروغ میں اس کا سراغ پایا جاسکتا ہے۔ اس بحث کا تعلق جاگیرداری نظام سے سرمایہ داری نظام کی طرف پیش قدمی سے ہے اور یہ زیادہ تر مغربی یورپ سے وابستہ ہے کہ جہاں کیپٹل ازم پہلی بار ظاہر ہوا۔ جہاں تک جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف آنے کا سوال ہے میں جاگیرداری نظام کے انحطاط، تجارتی نظریۂ زر اور صنعتی انقلاب سے متعلق ایک بڑی عالمانہ کتاب کی سفارش کروں گا۔ اسے کیمبرج میں مقیم ماہر اقتصادیات مارس ڈاب نے لکھا ہے۔ کتاب کا نام ہے "اسٹڈیز اِن دی ڈیولپمنٹ آف کیپٹل ازم"۔

عزیز نے اپنی پنسل بنائی اور چھپے ہوئے صفحات پر جھک گیا۔

"جہاں سے ہم نے چھوڑا تھا اس سے آگے"، اس نے اپنی بات شروع کی، "فرانس پر، جہاں ٹیپو نے اپنا ایک سفیر بھیجا تھا اور پانچ سے دس ہزار تک فرانسیسی سپاہیوں اور پچیس سے تیس ہزار تک افریقی سپاہیوں کا مطالبہ کیا تھا، بھروسہ کرنا ٹیپو کے لیے نقصان دہ رہا۔ اسے یورپ میں ہونے والے واقعات کا کوئی اندازہ نہیں تھا

اور نہ ہی اُن مشکلات کا جو فرانس کو یورپ میں لڑائی کرنے میں پیش آ رہی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلاب فرانس نے اس کے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی اور اسی لیے 1797 میں جمہوریہ فرانس کے قیام کے پانچ سال پورے ہونے کے موقعے پر، سرنگاپٹم میں فرانسیسی سپاہیوں کے قائم کیے ہوئے جیکوبن کلب کے لیے اس کے اندر اتنا جوش و خروش تھا۔ اسی فورم کو اس نے یہ اعلان کرتے ہوئے منتخب کیا کہ وہ اُن کے ملک کے جھنڈے کو تسلیم کرتا ہے۔ ملک جو اسے پیارا بھی ہے اور جس سے اس کا اتحاد بھی ہے۔ بہت سے لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوئی تھی کہ انقلاب فرانس، جو ایک زبردست تغیر تھا اور جس نے شاہی تختوں کو اچھالا اور جس کے تیروں کے خصوصی ہدف بادشاہ تھے، اسے پہلا ہمدرد سرنگاپٹم کے حکمران کی صورت میں ملا۔

ہمایوں عموماً ایک خاموش سامع تھا، لیکن اس موقع پر اس نے چاہا کہ عزیز برطانیہ کے ردِّعمل پر کچھ اور روشنی ڈالے۔

عزیز نے سب لوگوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اور مسکرایا۔ "انگریز"، اس نے وضاحت کی، "اپنے علاقائی دعووں کے ہر امکانی خطرے کو ختم کرنے کے لیے بے چین تھے، انھیں فرانس کے ساتھ ٹیپو کو پینگیں بڑھاتا دیکھ کر اسے ختم کرنے کے لیے جنگ کرنے کا جواز مل گیا۔ اس کی قلمرو میں فرانسیسی فوج کی آمد نے آخری تنکے کا کام کیا"۔

"اب ہم یہ جان گئے"، پردیپ نے خیال ظاہر کیا، "کہ انگریزوں نے ٹیپو کو ایک بدنفس آدمی کے روپ میں کیوں پیش کیا؟"

"تم بالکل صحیح سمجھے۔ 1788 میں "Gentleman's Magazine" نے ٹیپو کے فرمانوں کو انگریزی زبان میں شائع کیا اور تمہید میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ فرمان ٹیپو کی وحشی اور ظالم شبیہہ کے ناقابلِ تردید ثبوت ہیں۔ مئی 1799 میں اس کی شکست اور موت کے بعد انگریزوں نے اس کی یاد کو مشرقی شقاوت اور بے رحمی کے نمونے اور

ایک ایسی دہشت کا آسیب قرار دیا جو یورپ پر صدیوں منڈلاتا رہا تھا۔ برصغیر کی دیومالائی اور تاریخی تاویلات میں ٹیپو یقیناً کلیدی کرداروں میں سے ایک تھا۔ کچھ جوشیلے مسلمان ہمدردانہ طور پر اسے ہندوؤں کو قتل کرنے والے متعصب کے بجائے ایک سیکولر حکمراں کہتے ہیں۔ اور یہیں سے ان دو گروہوں کے درمیان لڑائی ٹھن جاتی ہے جن میں ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ٹیپو شیر میسور ملک کی آزادی کے لیے لڑنے والا شہید تھا اور دوسرے کا خیال ہے کہ ٹیپو ایک ظالم اور متعصب مسلمان تھا"۔

ٹیپو کی شخصیت سے مسحور پردیپ اس کے بارے میں کوئی اچھی کتاب پڑھنا چاہتا تھا۔ عزیز نے لکھنؤ کرسچن کالج اور لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ محب الحسن کا حوالہ دیا جنھوں نے ٹیپو پر ایک رسالہ لکھا ہے۔

تکلف بر طرف "میں" مسلمان حکمرانوں کو آسیب قرار دینے والی تحریروں پر کسی رائے زنی کو ضروری نہیں سمجھتا مگر اُس وقت مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی ہے جب مجھ سے مندروں کی شکست و ریخت اور جبری تبدیل مذہب کا ذکر کرنے کی فرمائش کی جاتی ہے۔ اس کی آخر کیا وجہ ہے کہ اسی ملک میں پیدا ہونے والے یہیں پلنے بڑھنے والے مسلمانوں کو چند غیر رواداور اور متعصب حکمرانوں کے اعمال کی روشنی میں دیکھا جائے، پرکھا جائے؟ چائے کی اس دوکان کے منے میاں اور محمد صادق کرخندار کو جس سے ہم جامعہ ملیہ میں ملے تھے، محمود غزنوی کے سومناتھ پر حملے کا ذمہ دار بتایا جائے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ ان لوگوں کو محض اس لیے نشانہ نہیں بنایا جانا چاہیے کہ کسی احمق مغل بادشاہ نے سکھوں کے معزز اور محترم گروؤں کو تہہِ تیغ کردیا، یا پرجوش بُت شکن اورنگ زیب نے ہندو مندروں کو مسمار کردیا۔ میں نے کہیں پڑھا ہے کہ سومناتھ مندر کو دوبارہ تعمیر کروانے کا کوئی منصوبہ کے ایم منشی کے سامنے ہے اور ہمارے صدر بابو راجندر پرشاد منشی کی اس پہل کی تائید کررہے ہیں۔ شاید پنڈت جی اس حماقت کو روک سکیں۔ ہمارے اس عہد میں پنڈت جی، حماقتوں، بیہودگیوں اور جہالت کے صحرا میں ایک نخلستان ہیں۔ دوسروں کے برعکس وہ عام لوگوں میں کچھ صحت مند احساس اور سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"تم بالکل کسی عاشقِ نہرو کی طرح بات کر رہے ہو"، جگ موہن نے کسی قدر خوش طبعی سے کہا۔

"بالکل نہیں، اس کے برعکس ان کے بارے میں میرے بہت سے ذہنی محفوظات ہیں"، عزیز نے جواب دیا۔ کبھی کبھی میرا بھی یہ تاثر ہوتا ہے کہ وہ تھالی کے بینگن کے کھیل کو جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ مگر پھر بھی نئے ہندستان کی تعمیر میں ان کے حصے سے میں انکار نہیں کرسکتا۔

"کیا تھا ان کا حصہ؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"اس پر میں نے کچھ بعد کو بات کی ہوتی، مگر چلو ابھی کیے لیتے ہیں"۔

"بہت اچھا ہوگا"، جگ موہن نے کہا۔ اس نے ابھی حال ہی میں نہرو کی خودنوشت سوانح عمری، مہاتما گاندھی کی "His own story" اور ان کی دس ستمبر 1947 سے 30 جنوری 1948 تک کی "Delhi Diary" ختم کی ہے۔ "یہ ایک مشکل کام ہے"۔ عزیز نے اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا، "کسی سیاسی لیڈر یا اسٹیٹسمین کا کسی تاریخ کے معیّنہ لمحے میں تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مثال کے طور پر، جنگ کے دو ہیرو، لائڈ جارج اور ونسٹن چرچل سے متعلق کسی حتمی فیصلے (اگر کوئی ہوسکتا ہے) کے ہم آج بھی منتظر ہیں۔ فرانس کے انقلابی Robespierre کا تجزیہ فرانس میں آج بھی بڑی شدت کے ساتھ جاری ہے۔ نہرو کا تجزیہ خصوصیت کے ساتھ بڑا ہمت شکن کام ہے۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ قومیت کے متعدد متنازعہ نظریات اور اسے حاصل کرنے کے متعدد اور متنوع لائحہ عمل تھے لیکن گاندھی کے قدرتی جانشین نہرو آزادی اور ملک کی تقسیم کی لائی ہوئی تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے بہتر حیثیت میں تھے اور زیادہ مناسب تھے۔ میں ان کی بہت سی کمیوں کی نشاندہی کرسکتا ہوں مگر اس کے باوجود وہ اپنے ہم عصروں میں، ایک کٹے پھٹے ملک کے مستقبل کا ایک تصور رکھنے والے واحد آدمی تھے جس نے ملک کی رہنمائی کے لیے اپنی دانش ورانہ توانائیوں کی پرداخت کی۔ میں اس بات سے متفق ہوں کہ انھوں نے خود اپنے بہت سے خیالات و

نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کچھ بہت نہیں کیا۔ میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں، جیسا کہ میرے مارکسسٹ دوست مجھے بتاتے ہیں کہ اپنے بعض نظریاتی مخالفین کا مقابلہ کرنے میں وہ کانپ کانپ جاتے ہیں۔ میرے یہ دوست جو بات نہیں کہتے وہ یہ ہے کہ اس سب کے باوجود نہرو نے ہمارے جمہوری اور سیکولر تانے بانے کو صحیح سلامت رکھا، دنیا میں ہمارے ملک کے نام کو روشن کیا اور اس کے وقار میں اضافہ کیا۔ انھوں نے ہمیں ایک جدید لبرل، معقول اور ٹکنالوجی میں ایک ترقی یافتہ ہندستان کا خاکہ دیا"۔

"کیا تم"، پردیپ نے پوچھا، "انھیں قومی تحریک کے سیکولر ترکے کا وارث سمجھتے ہو؟"

"ہاں بالکل"، عزیز نے کسی قدر جوش و خروش کے ساتھ کہا، "معاملات کی باگ ڈور سردار پٹیل کے ہاتھ میں ہو، مجھے طمانیت حاصل نہیں ہوگی۔ صحیح ہے کہ وزیر داخلہ جذبے، لچک اور جرأت سے عاری نہیں ہیں پھر یہ کہ انھوں نے راجوں مہاراجوں کی ریاستوں کو انڈین یونین میں مدغم کرنے کے سلسلے میں بہت کچھ کیا ہے مگر وہ اپنے خیالات و نظریات میں بہت کٹر ہیں اور دائیں بازو والوں سے انتہائی قریب۔ یہ لوگ انھیں "مرد آہن" اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ مگر خیر میں ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ہوں"۔

"میں نے سنا ہے"، پردیپ بولا، "کہ پٹیل، نہرو مخالف گروہ کی قیادت کرتے ہیں"۔

"ہاں، یقیناً۔ پارٹی کے اونچے حلقوں میں، نہرو کے مخالفین، ہندو سماج کے تانے بانے کو تبدیل کرنے کے سلسلے میں ان کی ٹھونک پیٹ کی کوششوں کو، پاکستان کی طرف ان کے نرم رویے کو، مسلمانوں سے ان کی ہمدردی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ لیکن نہرو اپنے اوپر ہونے والی ایسی تنقید کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان کی طرف سے بھڑکانے والی باتیں، وہاں کے ہندوؤں کی تحقیر اور وہاں ان پر ہونے

والے مظالم جو بھی ہوں، ہندستان کو اپنی اقلیتوں کے ساتھ بہرحال مہذب رویہ رکھنا چاہیے۔ دوسری صورت میں، ہم ایک ایسا ناسور پیدا کرلیں گے جو سارے نظام کو نہ صرف منسوخ کردے گا بلکہ بالآخر تباہ و برباد کردے گا۔ وہ سیکولرازم کی بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے کانگریس کے پچھلے ریکارڈ کی دہائی دیتے ہیں اور مذہبی نفرت و تعصب کی آگ کو بجھانے میں مہاتما گاندھی کی بے مثال جرأت کا حوالہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ اس بات کو طے کرانا چاہتے ہیں کہ آیا حکومت اور پارٹی فرقہ پرستی سے متعلق روایتی کانگریسی اصولوں کی پابند رہے گی یا ملک ان اصولوں کو ترک کرکے بہک جائے گا"۔

"نہرو کی پائیدار اور مستقل دین کیا ہے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"قومی اتحاد کی ان کی لگن اور ان کا عزم مصمم۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہبی تفریق اور ذات پات کی کشمکش کے خلاف لڑائی کو مسلسل جاری رکھنا چاہیے۔ بغیر یہ سوچے ہوئے کہ ہمیں اس کی کیا قیمت چکانا ہوگی یا یہ کہ مخالفت کتنی ہمت شکن ہے"۔

ہمایوں نے یہ خبر سنائی کہ ڈاکٹر عابد حسین نے نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" کا اردو ترجمہ پورا کرلیا ہے اور وہ اب ان کی خودنوشت سوانح عمری کا ترجمہ شروع کرنے والے ہیں۔

"پردیپ نے ہمیں بھٹکا دیا۔ یہ بھی نہرو کے چاہنے والوں میں سے لگتا ہے"

"کوئی بات نہیں جگ۔ ہماری گفتگو کے دوران ایسی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اور پھر میں بہرحال کلاس روم میں تو لکچر نہیں دے رہا ہوں کہ اسے سختی کے ساتھ نصاب کے مطابق ہونا چاہیے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ تاریخ کے مطالعے کو فرد کے اندر، ذہن کی ایک مخصوص پختگی، معاصر واقعات اور ماضی اور مستقبل سے ان واقعات کے رشتوں کے بارے میں ایک مخصوص سوچ اور احساس پیدا کرنا چاہیے۔

در حقیقت ہم خرافات کو پالتے ہیں، نظریاتی رجحانات کے مطابق بت تراشتے ہیں، راجاؤں اور سلطانوں کے گن گاتے ہیں اور اس طرح عہد زریں کی ایک دیومالائی شبیہ تخلیق کردیتے ہیں۔ اس سب کا نتیجہ نکلتا ہے ماضی کا ایک مسخ شدہ تصور۔

ہندستان کے ماضی کی تحقیق و تفتیش میں ایک اہم تضاد یہ ہے کہ یہ تحقیق و تفتیش عموماً پچھلے سو سال کی تاریخ کی تاویلات پر منحصر ہوتی ہے۔ مسئلے کا ایک حصہ ہمارا وہ علم بھی ہے جو ہمیں ہنری ایلیٹ جیسے استعماری مورخین سے حاصل ہوا ہے۔

اس نے "دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریینس" کے نام سے بارہ جلدوں پر مشتمل تاریخ کی ایک کتاب مرتب کی۔ مقصد تھا کلکتے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے اِس خیال کو باطل ٹھہرانا کہ مغلوں کا عہد انگریزوں کے عہد کے مقابلے میں بہتر رہا تھا۔ اس کے مطابق مطلق العنان، متعصب اور ظالم مسلمانوں کے مقابلے میں، انگریزوں نے یہاں کے عوام کے لیے کہیں زیادہ کام کیا۔ اس نے مسلمانوں سے اختلاف کرنے والے ہندوؤں کے قتل کی، جلسوں جلوسوں اور عبادت پر عائد عام پابندیوں کی، مسخ کی ہوئی مورتیوں کی، مسمار شدہ مندروں کی، جبریہ تبدیل مذہب اور زبردستی کی شادیوں کی کہانیاں سنائیں، جھلکیاں دکھائیں۔ اس کا مقصد ہندستانیوں کو برطانوی راج کے فوائد سے آگاہ کرانا تھا۔ یہی عظیم سرکاری منصوبہ تھا اور اس کے پیچھے صرف اس سے مطابقت رکھنے والے حقائق کو منتخب کرنے کا یہی رجحان تھا جس کی وجہ سے وہ اس عام الزام کا سزاوار ٹھہرا کہ اس نے بہت سی ان شہادتوں کو نظرانداز کیا ہے جو اس کے خاکے میں فِٹ نہیں بیٹھتی تھیں۔ S.H.Hodivala نے اُسے اور اس کے جانشین پروفیسر جان ڈاؤسن کو خاصی غلطیوں کو پھیلانے اور بہت سی جھوٹی اور مسخ شدہ تاریخ کو رواج دینے اور بہت سے نئے مورخین کو بھٹکانے کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ انھوں نے یہ بات ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریئنس" کی اشاعت کے ساٹھ سے زیادہ سال گزرنے کے بعد کہی تھی"۔

" تو اب ہم جان گئے"، پردیپ نے کہا، "کہ عہدِ وسطیٰ کا ہندستان اتنے

خراب انداز میں لیسے اور کیوں پیش کیا گیا ہے"۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ چارلس ڈارون"، جگ موہن نے کہا، "اپنے پاس بے تکے حقائق لکھنے کے لیے ایک الگ نوٹ بک رکھتا تھا— ویسے اسے خود یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ انھیں بھول جانا چاہتا تھا"۔

"Oh yes، وہ سائنسی دیانت داری کا نمونہ تھا"۔ عزیز نے رائے ظاہر کی۔ "قابلِ غور نکتہ یہ ہے کہ لاکھ سوچنے کے بعد بھی کسی مورخ کے اورنگ زیب یا ٹیپو کی وکالت کرنے یا ان کے جرائم کو معاف کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی ہے۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے جو محمد بن تغلق یا اکبر کے بجائے محمود غزنوی اور بلبن کی پرستش کرتے ہیں یا ترائن (1192) اور پانی پت (1526) میں مسلمانوں کی فتح پر فخر کا اظہار کرتے ہیں۔ میں اس تاریخ کو بھی پسند نہیں کرتا جو پاکستان میں لکھی جا رہی ہے۔ اور پھر کلونیل پیریڈ سے قبل ایک عہد زریں، اختلافات اور تنازعات سے مبرا ایک ہم آہنگ سماج کی موجودگی کے خیال کو بھی میں محض رومانیت اور خرافات سمجھتا ہوں۔"۔

"تم"، تم پر زور دیتے ہوئے ہمایوں نے سوال کیا، "اپنے طالب علموں سے کیا سیکھنے اور سمجھنے کی توقع کرتے ہو؟"

"میں چاہوں گا کہ میرے طالب علم یہ جانیں کہ ٹیپو نے مندروں اور مسجدوں کے لیے کرائے کے بغیر زمینوں کے تحفے دیے اور اس نے مقامات زیارت کی سرپرستی کی۔ میں چاہوں گا کہ میرے طالب علم یہ یاد رکھیں کہ SIBI کے عظیم مندر کی تعمیر میں اس کا مدد دینا اس خیال کو جھوٹا ثابت کرتا ہے کہ ہندو صرف اس وجہ سے کہ وہ ہندو تھے، اس کے ہاتھوں امتیازی سلوک اور عقوبت کے شکار ہوئے۔ اگر اس نے کروگ اور نائروں کی بیخ کنی کی تو اس نے مسلمان مُلاؤں کو بھی نہیں بخشا۔ اس نے جس طرح مراٹھوں اور ٹراونکور کے راجہ کے خلاف جنگ کی اسی طرح اس نے ساونور، کرنول، اڈونی، حیدرآباد اور کرناٹک کے مسلم حکمرانوں کے خلاف بھی

لڑائیاں لڑیں۔ اس نے اپنے یہاں ہندوؤں کو ملازم رکھا۔ ان میں ممتاز ترین پورنیا تھا جس نے ٹیپو کے انتقال کے بعد دیوان کا عہدہ سنبھالا۔ ایسا کرنے میں اس نے دکن اور جنوبی ہندستان کے ہندو اور مسلمان دونوں حکمرانوں کی ان پرانی روایات کے مطابق عمل کیا جن میں مختلف عقائد رکھنے والے آپس میں شادیاں کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے یہاں ملازمت کرتے تھے اور بقائے باہم پر ان کا ایمان تھا۔ اس کے بہت سے ہندو ملازموں نے، جو اینگلو - میسور لڑائی میں انگریزوں کی حراست میں آئے، انھوں نے اس کے نرم دل اور شفیق آقا ہونے کو تسلیم کیا"۔

عزیز نے محسوس کیا کہ جگ موہن کچھ بے کل اور مضطرب سا ہورہا ہے۔ نو بجنے والے تھے۔ گھر چلنے کا مطالبہ کسی وقت بھی ہونے والا تھا۔

"1800 سے قبل"، عزیز بات کو ختم کرنے پر ابھی تیار نہیں تھا، "تنہا واقعات یا مخصوص سوسائٹیوں کے خصوصی ماحول سے الگ کسی ہندو، سکھ یا مسلم تشخص کی کوئی پہچان نہیں تھی۔ ٹیپو کا رویّہ بھی اس کی تصدیق کرتا ہے۔ جنوب میں مسلم، ہندو اور کرسچن روایات میں باہمی تعلق اور آپسی لین دین کے موضوع پر ہر سنجیدہ کتاب میں تمھیں علامتیں اور خیالات و نظریات، مشترک لفظیات اور ایک دوسرے کی خصوصیتیں ایک مشترک اور مقدس منظر میں باہم پیوست ہوتی ہوئی مل جائیں گی"۔

جگ موہن سارے مباحثے سے بڑا متاثر تھا۔ "تو ٹیپو کو ہم کس جگہ رکھیں گے؟"

"رائیں مختلف ہیں اور سیاسی نظریات اور خوش فہمیوں میں آلودہ۔ میں اس کو بلکہ کسی دوسرے حکمران کو بھی صوفیوں کا اعلیٰ درجہ دینا نہیں چاہتا اور نہ ہی ان میں سے کسی کو کسی مسند پر بٹھانا چاہتا ہوں۔ ٹیپو میرے نزدیک ایک لائق، توانا پُرجوش اور انتہائی خودرائے اور آزاد حکمران سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے اس کے اتحاد کے محرک اس کے قومی جذبات سے کہیں زیادہ

اس کے علاقائی ولولے تھے۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ فراخ دل تھا، مگر یہ بات اس کو لبرل یا سیکولر نہیں بنا دیتی ہے اور خصوصاً ایک ایسے زمانے میں جب ایسی اصطلاحات نہ اس کے لیے اور نہ ہی اس کے معاصرین کے لیے کوئی معنی رکھتی تھیں، وہ ایک ایسے عہد میں رہ رہا تھا جس میں مذہب عموماً خاندانی مفادات کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ اسی لیے نظام حیدر آباد کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوششوں میں اس نے مذہب کی دہائی دیتے ہوئے یہ کہا کہ انھیں مسلمانوں کے فائدے کے لیے اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو جانا چاہیے۔ اسی طرح عثمانیہ سلطان کے مذہبی جذبات کو بیدار کرنے کے لیے اس نے مسلمانوں پر انگریزوں کے ظلم و زیادتیوں کا بڑا چرچا کیا"۔

"تمھارے سوال کے جواب میں ہمایوں، میں جنوب میں خصوصاً اور برصغیر میں عموماً اٹھارھویں صدی کے حوالے سے ٹیپو کی کارگزاریوں کے ایک معتدل اور غیر جذباتی تجزیے پر اصرار کروں گا۔ راج ترنگنی کے مصنف کلہانا سے اتفاق کرتے ہوئے میں کہوں گا کہ عظیم رائٹر وہی ہوتا ہے جس کے گزرے ہوئے واقعات کے بیانات غصے اور بدنفسی سے پاک ہوں اور اس کی بات ایسی اٹل ہو جیسی منصف سرسوتی کی۔ تم ایک بات جانتے ہو؟ لوگ تاریخ اور فلسفہ تاریخ کے فیصلوں کی بات کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ متفقہ فیصلہ کوئی نہیں ہوتا۔ صرف انفرادی فیصلے ہوتے ہیں۔ کوئی متفقہ فلسفہ نہیں ہوتا جو کچھ ہوتا ہے وہ متضاد نظریات کا ایک ملغوبہ۔ میں نہیں سمجھتا کہ انسانی مہم جوئی کے ہمارے مطالعے سے پیدا ہونے والے سوالات کے کوئی قطعی جوابات ہیں یا ہو سکتے ہیں"۔

ہمایوں نے متفق ہوتے ہوئے سر ہلایا، اور پھر وطن (national homeland) ویسا نہیں ہوتا جیسا کہ آج سمجھا جانے لگا ہے۔ وطن تو شاعر کی تکمیل شدہ تمناؤں اور آرزوؤں کا زمان و مکان ہوتا ہے اور محبت اور جوانی کی سرزمین۔ اس فردوس گم شدہ کی یاد شاعر کے دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور اسے یاد وطن کا مریض بنا دیتی ہے۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

میں نے اس سے پہلے بنکم چندر کا ذکر کیا تھا۔ کیا تھا نا؟ خیر کوئی بات نہیں، اس نے بنگال کی تاریخ لکھنے کا ایک منصوبہ، ایک لائحہ عمل تیار کیا۔ میں یہ بتانے کے لیے اس کے الفاظ میں کچھ تبدیلی کروں گا کہ ہندستان کی خود اپنی ایک تاریخ ہونا چاہیے کہ اس کے بغیر ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ اس تاریخ کو لکھے گا کون؟ بنکم نے پوچھا تھا۔ اس کا جواب تھا۔ تمھیں لکھنا ہوگی۔ مجھے لکھنا ہوگی۔ ہم میں سے ہر ایک کو لکھنا ہوگی۔ یہ ایسا کام نہیں ہے جسے کوئی ایک اکیلا شخص کر سکے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے ہم سب کو مل کر کرنا ہوگا۔ گریز کے لیے معاف کرنا۔ لیکن بعض ایسے نکات کی وضاحت کرنا چاہوں گا جو بہت سے اسکالروں کو ناگوار محسوس ہوئے ہیں"۔

ہمایوں کچھ مضطرب سا لگا۔ "اٹھارھویں صدی کے آخر میں صورت حال کیا تھی؟" اس نے کسی قدر جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارے اکثر بڑے لیڈر مر چکے تھے۔ سندھیا 1794 میں مر گیا۔ اس کے جانشین تھے دولت راؤ اور باجی راؤ دوم۔ اہلیہ بائی نے تیس سال تک حکومت کی اور اندور کو، ایک چھوٹے سے گاؤں کو ایک خوشحال شہر میں تبدیل کردیا۔ 1795 میں اس کا انتقال ہوگیا۔ تین سال بعد اس کا کمانڈر ان چیف تکوجی ہولکر مر گیا۔ اِن سب حادثات نے ہولکر ریاست کو کمزور کردیا اور اوائل انیسویں صدی کی اینگلو مراٹھا لڑائی کو مزید یک طرفہ کردیا۔ بالآخر 1799 میں ٹیپو کی شکست نے ساری ریاستوں پر برطانوی اقتدار کو مسلّم کردیا۔ یہی وہ وقت تھا جب کلکِ شاہی نے ہندستان کا نام زیادہ پُرعزم اور زیادہ قوی ہاتھوں سے دوبارہ کندہ کیا"۔

عزیز پر کچھ دیر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ علی گڑھ میں انڈر گریجویٹ کلاسوں میں پڑھی ہوئی کچھ پیچیدہ تفصیلات کا اعادہ کررہا تھا۔ اسے یہ بتایا جانا یاد آیا کہ حکومت کی ساری فہم و ذکا اور اس کا سارا اعتدال مارچ 1800 میں نانا فرنویس کے انتقال کے ساتھ ختم ہوگیا۔ ان کے ایک گروہ نے چارلس میٹکاف، تھامس منرو، جان میلکم اور مانسوارٹ ایلفنسٹن، جیسے ویلزلی کے جانشینوں کی بڑی توصیف کی اور ان

کے صفایا کرنے کی مہموں کو بھی بہت سراہا۔

ہندستان کا سیاسی نقشہ اس وقت دوبارہ بنا جب 1843 میں چارلس جیمس نیپئر نے سندھ پر قبضہ کیا۔ دو اینگلو - سکھ جنگوں کے بعد بھی برطانوی گرفت سے باہر رہنے والے سکھوں نے مارچ 1849 میں اطاعت قبول کرلی۔ اسی سال جے ڈی کنگھم نے سکھوں کے بارے میں اپنی کتاب میں لکھا:

> "سکھوں کی الگ فرمانروائی اور پنجاب کی آزادی و خودمختاری اپنے انجام کو پہنچی اور وسیع و عریض اور عظیم سرزمین ہندستان کے غیرمتنازعہ حاشیہ پر اب انگلستان کا اختیار کلی ہے۔ اب اس کی سیاسی فوقیت برہمنوں اور کشتریوں کے فرسودہ اور ازکار رفتہ طریقہ ہائے جہاں بانی کے مقابلے میں زیادہ باقاعدہ اور منظم ہے۔ اور مسلمانوں کی ناقص عمل داری کے مقابلے میں اندرونی حملوں کی ہدف کم ہے۔ کیونکہ منظم حکومت، وسیع وسائل، عمل میں اتحاد اور ذہین حکمت عملی کی وجہ سے اس کی حکومت مشرق کے تجربے کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے اور روم کے عظیم و تابناک نمونے کی مثال پیش کرتی ہے"۔

"یہ بات بالکل صاف ہے"، ہمایوں نے اظہار خیال کیا، "کہ انگریز اپنے تہذیبی کردار کے بارے میں کچھ بڑے عجیب و غریب خیالات رکھتے تھے"۔

"یقیناً"، ابتدا میں لاہور کے معاہدے نے انھیں کشمیر اور اس کے ماتحت علاقوں پر کنٹرول دلا دیا تھا۔ اس حسین وادی کو جس کا تفصیلی ذکر جہانگیر نے اپنی "تزک جہانگیری" میں کیا ہے، بعد کو ڈوگرا سردار گلاب سنگھ نے ایشیا کے سب سے بڑے پاجی ہنری ہارڈنگ کے ہاتھ محض ارسٹھ لاکھ روپوں کی حقیر رقم کے بدلے میں بیچ دیا۔

دہقان و کشت و جوئے و خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند
(اقبال)

☆

وہ مطرب اور وہ ساز وہ گانا بدل گیا
نیندیں بدل گئیں وہ فسانہ بدل گیا
رنگِ رخِ بہار کی زینت ہوئی نئی
گلشن میں بلبلوں کا ترانہ بدل گیا
فطرت کے ہر اثر میں ہوا ایک انقلاب
پانی فلک پہ کھیت میں دانہ بدل گیا

(اکبر الہٰ آبادی)

اکبر الہٰ آبادی نے پرانے نظام کی موت اور اس کی جگہ نئے نظام کی آمد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب یہ اشعار کہے تھے تو اس سے بہت پہلے سے ہندستانی ریاستیں آخری سانسیں لے رہی تھیں۔ سر بریدہ نعشوں کی طرح ان کے جسم تاریخ کی دھوپ میں گل سڑ رہے تھے کہ ڈلہوزی نے ان کی تدفین کا اہتمام کردیا۔ جانبر ریاستوں میں کیننگ نے کوئی نئی روح نہیں پھونکی۔ اس نے ان لاشوں کو محفوظ کردیا یہاں تک کہ زیادہ سلیقے سے کام کرنے والے آزاد ہندستان کے پہلے وزیر داخلہ ولبھ بھائی پٹیل نے سب کو گمنامی کے مرگھٹ پر نذر آتش کردیا۔ بھول اور سہو کا اصول جس کی رو سے ضمنی ریاستیں مَرد وارث نہ ہونے کی صورت میں کمپنی کے ہاتھ میں چلی جاتی تھیں، آخری تنکا تھا۔ ڈلہوزی (گورنر جنرل، 56-1848) نے 1835 میں جھانسی، 1848 میں ستارا اور 1854 میں ناگپور کو اپنے قبضے میں کیا۔ ان مقامات سے تقریباً پچاس لاکھ پاؤنڈ ریوینیو حاصل ہوا۔ پچاس لاکھ پاؤنڈ مزید کی ہوس نے 1856 میں اودھ جیسے رسیلے اور شیریں پھل کو باقاعدہ غصب کرنے کی کارروائی کو مکمل کردیا اور

یہ سب منصفی اور دیانت کی اِس بنیاد پر ہوا کہ انگریز کسی (مفروضہ) مستبد حکومت کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

اس سے پہلے کہ جگ موہن یا پردیپ یہ پوچھ سکتے کہ یہ دعویٰ خود اتفاقی کیوں تھا، عزیز نے ڈبلیو ڈبلیو اِرون کی کتاب 'دی گارڈن آف انڈیا' کا حوالہ دے دیا۔ کتاب کے مصنف کے مطابق، اگر ہندستانیوں کو انتخاب کا موقع دیا جاتا تو انھوں نے بدیسیوں کے طور طریقوں کو جو اِن کے اپنے طریقے نہیں تھے، اُن کے اصولوں اور اُن کے محرکات کو جو اِن کی فہم سے بالاتر تھے اور اُن کے قوانین اور قاعدوں کو جن کی انھیں کوئی پرواہ نہیں تھی، نہ چن کر ان برائیوں کا انتخاب کیا ہوتا جن سے وہ مانوس تھے۔ عزیز نے جان شور کا بھی ذکر کیا۔ اس نے ہندستان میں ایک ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے چونکہ بہت دن کام کیا تھا۔ اور دیکھا تھا کہ یہاں لوگوں نے کیسے کیسے مصائب اٹھائے اور اپنے غم و غصے کا کس کس طرح اظہار کیا۔ ان کے احتجاج کی کہانی کو عزیز نے زور دے کر کہا کہ بار بار دہرانے کی ضرورت ہے۔

پردیپ بول پڑا، "تم نے دو اور انگریز مصنفین کا ذکر کیا تھا، جنھوں نے 1893 میں کچھ یہ لکھا تھا کہ قلمرو میں سب کشل منگل تھا۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی اس گہرے سناٹے کی بات نہیں کی تھی جو ہندستان میں سلطنت برطانیہ پر ایک سائے کی طرح محیط ہو گیا تھا؟"

"ہاں ہاں، تم کیپر اور مارش مَین کا حوالہ دے رہے ہو"۔ عزیز کو یاد آیا کہ ہاں اس نے کسی سلسلے میں ان دونوں کا تذکرہ کیا تھا۔

"کوئی بات نہیں عزیز بھائی، چلیے ہم اودھ واپس چلیں"۔ ہمایوں نے تجویز پیش کی۔ وہ اس کی یادداشت کو جھنجھوڑنا چاہتا تھا۔

عزیز نے اس پر ایک محتاط نگاہ ڈالی، "میں کچھ مزید اضافہ نہیں کر سکتا، لیکن میں تمھیں وہ بتاؤں جو بنگال آرمی کے ایک افسر صوبیدار سیتارام نے کہا تھا۔ سیتارام کے مطابق، اودھ پر قبضے نے سپاہیوں میں ایک حیرانی اور اضطراب پیدا کر دیا، اور انھیں

حکومت کے خلاف سازش کرنے پر اکسا دیا۔ اودھ کے نواب کے ایجنٹوں اور مغل بادشاہ نے لوگوں کے ان جذبات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھیں یہ سمجھایا کہ کس مکاری اور فریب سے فرنگیوں نے ان کے بادشاہ کے ساتھ سلوک کیا ہے۔ سیتارام نے کہا کہ ان لوگوں نے دس ہزار جھوٹ گڑھے اور یہ وعدہ کیا کہ بادشاہ کو تخت پر دوبارہ بٹھانے کے لیے وہ سپاہیوں کو انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر مجبور کریں گے"۔

دکن کے مورخ ہارون خاں شیروانی نے علی گڑھ میں اپنی ایک آمد میں، سلطانیہ ہسٹاریکل سوسائٹی کے اراکین کو بتایا کہ ڈلہوزی کے فیصلے پر کسی کو بھی خوشی نہیں ہوئی، غالب کو بھی نہیں اور سید احمد کو بھی نہیں۔ جب کہ یہ دونوں انگریزوں کے دوست تھے۔ اودھ کے الحاق سے ان کا احساسِ تفخر مجروح ہوا تھا۔ سید احمد کا خیال تھا کہ کمپنی نے اپنے معاہدوں کی خلاف ورزی کی تھی اور اپنے وعدوں کی تحقیر کی تھی۔ مگر ان کی اس نرم تنقید نے ان کے ملک کے اکثر لوگوں کو کوئی سکون نہیں بخشا۔ انگریزی راج اگرچہ ایک حقیقت تھا مگر بہت سے حلقوں میں بے اطمینانی پھل پھول رہی تھی اور بہت دنوں سے پھل پھول رہی تھی۔ پچھلے حکمران اشرافیہ میں بہت سے حلقے، خصوصاً وہ جن کا سب کچھ چھن گیا تھا یا جنھیں بے جگہ کردیا گیا تھا، اپنے غم و غصے اور برہمی کے اظہار کے وقت کا انتظار کررہے تھے۔ زرعی بغاوتوں نے، جن کا رخ زمین داری اور ساہوکاروں کے گٹھ جوڑ کی طرف خصوصاً تھا، ملک کے دیہی علاقوں میں سماجی توازن کو اتھل پتھل کردیا تھا۔ کرسچن اشاعت مسیحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے مذہبی احیائی تحریکیں سر اٹھانے لگیں تھیں۔ ایک ایسے سماج میں، جہاں تفوق مغربی نظریات اور مغربی اداروں کو حاصل ہو، اسلام کے تاریک اور پریشان کن مستقبل کے خیال سے علما اور مشائخ کی نیندیں حرام ہو گئیں تھیں۔ مشنریوں کے تعلیمی اداروں کے متبادل مہیا کرنے کے لیے تاجروں کی سرپرستی میں 1842 میں مدارس میں Pachiyappa College قائم ہوا، ایک تیلوگو تاجر لکشمن چیٹی نے ہندوؤں کے حقوق و مراعات کے تحفظ کے لیے ایک اخبار "Crescent" شروع کیا۔ ہندوازم

اور اسلام کے خلاف مشنری پروپگنڈے کو ملک گیر پیمانے پر، مذہبی وعظوں اور روایتی وسائل سے طبع ہوئے اشتہارات کی تقسیم کے ذریعے بے اثر کرنے کی کوششیں ہوئیں۔

Indigo Commission (1860) کے سامنے گواہی دیتے ہوئے ریورنڈ جیمس لانگ نے بنگال کے ایک رواج کا حوالہ دیا تھا جس کے مطابق ایک شخص جو 'کتھک' کہلاتا تھا، کسی بڑے مجمعے کو خطاب کرتا تھا۔ اس نے خود ایک ایسے اجتماع میں شرکت کی تھی جس میں تین سو مرد اور ایک سو سے زیادہ پردہ نشین عورتوں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک ایک کتھک کا تفصیلی وعظ سنا تھا۔ بہرحال ان اجتماعات کا موضوع محض مذہبی نہیں تھا۔ وہاں سیاست پر بھی بات ہوتی تھی مثلاً نیل کی کاشت کرنے والوں کو آنریری مجسٹریٹ مقرر کرنا، عام رائے جو لانگ کے کان میں پڑی وہ یہ تھی کہ بھیڑیے کو گلے کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ اس نے نیل کے کاشتکاروں سے متعلق ایک ملامتی گیت بھی سنا جسے باقاعدہ موسیقی کے ساتھ تیار کیا گیا تھا اور جسے گانے والوں کے ایک گروپ نے Kishnaghur ضلع میں پیش کیا تھا۔

1857 کے بہت بعد، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب "دی انڈین مسلمان" میں مسلمانوں میں پکتی اُبلتی ہوئی بے اطمینانی کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ایک باغی و سرکش بستی برسوں تک برطانوی سرحد کے لیے خطرہ بنی رہی، وہاں سے وقتاً فوقتاً جنونی ہجوم کیمپوں پر حملہ کرتے، گاؤں کو جلاتے اور لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ ایسی دشمن بستی سے دور دراز علاقوں تک سازشوں کا ایک جال پھیل گیا۔

ایسے ہی بہت سے عناصر اس وقت میدان میں کود پڑے جب ہنگامہ میرٹھ سے شروع ہوکر دہلی تک پہنچ گیا۔ دہلی جو اس وقت بھی سکڑی اور سمٹی ہوئی سلطنت مغلیہ کی راجدھانی تھی۔ یہ ایک غیر متوقع واقعہ تھا، ایک بے پناہ طوفان جس نے راج کی بنیادیں ہلادیں۔ کمپنی کے لاپرواہ ملازم جو پہاڑوں، دریاؤں اور صحراؤں میں جمے ہوئے تھے، ناگہاں اس کی گرفت میں آگئے۔ اور پہلی بار وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ ان کے راج پر حملہ صرف سپاہیوں کی طرف ہی سے نہیں بلکہ دوسرے

متعدد غیر مطمئن عناصر کی طرف سے بھی ہے۔ یہ حقیقت، حلق سے اتارنے کے لیے ایک کڑوا گھونٹ تھی۔ 1857 سے پہلے والا جوش و خروش کم از کم فی الحال ختم ہو چکا تھا۔

اگر عزیز کو معلوم ہوتا تو وہ اپنی طویل اور تھکا دینے والی گفتگو کو اس مکالمے پر ختم کردیتا جو 1860 میں سورت کی ایک فوجداری عدالت کے ایک جج اور ایک پارسی اسیسر منکرجی کاؤس جی انٹی کے درمیان The great shoe question کے موضوع پر ہوا تھا۔ مکالمہ، جیسا کہ 'بامبے گزٹ (2 اپریل 1862) میں چھپا تھا، اس بات کی توضیح کرتا ہے کہ سماج میں کلونیل قوت اور حکومت کا کیا ڈھانچہ تھا۔ وہ کس طرح روزمرہ کے کاموں میں بھی اپنی موجودگی کا احساس دلاتی تھی اور یہ کہ کس طرح تمدن مدافعت اور مقابلے کا وہ میدان بنا جس میں ثقافتی قومیت نے جڑیں پکڑیں۔

منکرجی : میں بڑی انکساری کے ساتھ عرض کروں گا کہ پاؤں کا ننگا ہونا انسانی وقار کی اہانت ہے اور مقدس ضابطوں اور ہمارے مذہبی صحیفوں کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ میں کسی ایسے عہدنامے کی تحقیر برداشت نہ کرنے کا پابند ہوں، جس کا احترام صرف اس وقت تک ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ ہمارے اپنے قوانین و ضوابط میں دخل اندازی نہیں کرتا ہے۔

جج : یہاں یہ سب نہیں چلے گا۔ تم اپنے جوتے اتاردو نہیں تو پھر تمھارے لیے بہت بُرا ہوگا۔ ابھی سچین (Sucheen) کے بڑے نواب مجھ سے ملنے آئے تھے اور میں نے انھیں اپنے جوتے اتارتے ہوئے خود دیکھا۔ کیا تم ان سے زیادہ معزز ہو؟

منکرجی : میں انگریز کی ایک غریب پرجا ہوں اور بس۔

جج : پھر بھی تم ہمارے حکم کو نہیں مانتے ہو۔

ٹنکر جی : صاحب کا حکم ہمارے سر آنکھوں پر، مگر حضور مجھے کسی قانون کا حوالہ دینے کی اجازت دیں گے۔

جج : یہ قانون اور ضابطے کی بات نہیں ہے۔ یہاں قانون کی بات مت کرو۔

ٹنکر جی : میں آپ کے حکم کا انتہائی انکساری کے ساتھ احترام کرتا ہوں۔ مگر یہ سمجھ کر کہ مجھے اس طرح کا حکم دے کر آپ میری بے عزتی کررہے ہیں، میرے احساسات کو مجروح کررہے ہیں، اور مذہبی لحاظ سے ایک غلط بات کو میرے نہ ماننے میں دخل اندازی کررہے ہیں۔

جج : مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تم عدالت کی کارروائی میں رخنہ ڈال رہے ہو اور تمھارے ساتھ اسی کے مطابق سلوک ہوگا۔ تم ہمارا حکم مانتے ہو یا نہیں؟

ٹنکر جی : میں انتہائی نیازمندی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ حضور آپ جب تک میرے مذہبی عذر کو نامنظور نہیں فرماتے ہیں اور مجھے کوئی ایسا قانون نہیں دکھاتے ہیں جن کی رو سے آپ کے احکامات حق بجانب ہیں۔ اس وقت تک حضور میں انتہائی افسوس کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ میں اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف، انسانی وقار کے خلاف اور اپنے مذہب سے بین تضاد کے پیش نظر کوئی کام بھی نہیں کرسکتا۔

"پردیپ کیا تم جانتے ہو؟" اس دفعہ پردیپ کے لیے عزیز کے پاس سوال تھا۔

"کیا؟"

"عظیم صوفی خواجہ بایزید سے کسی نے پوچھا، "اللہ کی راہ کون سی ہے؟" انھوں نے جواب دیا، "سفر میں جب تم گم ہوگئے تو گویا تم خدا کے پاس آگئے"۔

باہر بارش کے تھپیڑے کھڑکی پر پڑ رہے تھے۔ بوندا باندی طوفانی بارش کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ عزیز نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ ایک لمبی سانس لی گویا پھولوں کی ساری خوشبو اپنے پھیپھڑوں میں بھر لی۔

☆☆☆☆☆

چوتھا باب

جو گزرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے
(اکبر)

میں نے کہا کہ اپنا سمجھیے مجھے غلام
بولا وہ بُت ہنس کے فرنگی نہیں ہوں میں
(اکبر)

ان لوگوں نے جنھوں نے ہندستان پر راج کیا (The men who ruled India) 1857 کی بغاوت سے پہلے کی دہائیوں کو "عہدِ زریں" سمجھتے ہیں۔ نپولین کی جنگوں کے دوران ٹوڈی ترجمانوں نے نوآبادیوں اور تجارت، بحری جہازوں، جہاز رانوں، دولت اور طاقت کے درمیان باہمی رشتوں کی بڑی مدح و ثنا کی۔ Whigs نے ان سے اتفاق کیا۔ نوآبادیاں، جارح اور مخالف پڑوسیوں کے مقابلے میں زیادہ قابل قدر منڈیاں اور فاضل آبادی اور فاضل سرمائے کے نِکاس کی بڑی مفید جگہیں تھیں۔ ان میں سٹہ کھیلا جاسکتا تھا اور نسبتاً کم خطرات کے ساتھ سرمایہ کاری ہوسکتی تھی۔ 1838 میں صرف جان رسل ہی نے اس پر اصرار نہیں کیا کہ نوآبادیوں پر قبضہ سلطنت کی خوشحالی میں مادی طور پر اضافہ کرتا ہے بلکہ ریڈیکل ناقد Villiers نے بھی اعتراف کیا کہ یہی رائے عامہ تھی۔ صدی کے اختتام پر عام احساس یہ تھا کہ اگر برطانوی راج ختم ہوتا ہے تو متاثرہ مفادات کی قیمت اتنی زیادہ ہوگی کہ اس کی کوئی بھی تلافی نہ ہوسکے گی۔

ناول نگار فلورا اینی اسٹیل نے لکھا ہے کہ نوآبادیوں میں حکمران نسل ہونے کی وجہ سے انگریز کو گھمنڈ تھا، کہ اپنی تمام کجیوں کے ساتھ، اس نے خود افسانوی وکرم دِتیہ سے کہیں بہتر حکمرانی کی تھی۔ جی۔اے۔ ہنٹی نے بچوں کی کتابوں کو اس دعوے سے بھر دیا کہ انگریز ہندستان میں امن اور خوشحالی لائے تھے۔ کپلنگ کے کم کو اس کا حق تھا کہ وہ اپنے بنگالی دوست کو اپنی پیروی کرنے کا حکم دے اور ہری چندر مکرجی کا فرض تھا کہ وہ حکم کی تعمیل کرے کیونکہ کم انگریز تھا اور اس لیے ایک فطری لیڈر۔

اعتماد اور بھروسے کی اس فضا میں متعدد مصنفین اور ایڈمنسٹریٹرز نے برطانوی پارلیمنٹ کے قانونی ضابطوں کے لبرل نظریات سے سکون و اطمینان بھی حاصل کیا اور جواز بھی۔ اور اصلاح و تبدیلی کی اُن ہواؤں کو خوش آمدید بھی کہا جو ہندستان پہنچ رہی تھیں۔ انھوں نے سول سرونٹس کی ایک پوری نسل کو جس میں گورنر جنرل ولیم بینٹنک (35-1825) بھی شامل تھا، متاثر کیا۔ ولیم بینٹک نے 1829 میں ستی کی رسم کو ختم کیا۔ ٹھگی وغیرہ کو دبایا اور انگریزی اسکولوں اور مغربی سائنس کی تعلیم کو فروغ دیا۔ اس نے حکومت اور اعلیٰ عدالتوں میں فارسی کی بجائے انگریزی کو سرکاری زبان بنایا۔ صحیح ہے کہ وہ سماجی اور تعلیمی نشاۃ ثانیہ کا سبب تھا مگر اس کے گرو انیسویں صدی کے انگریز فلاسفر جیرمی بنتھم اور جان اسٹوارٹ مِل تھے۔ تعلیم کے میدان میں اس کا عملی رہنما مورخ تھامس بیبگٹن میکالے تھا۔

ایک دوسرا قابلِ لحاظ نکتہ ہے مغربی تعلیم کے فروغ میں قدیم دیسی پہل کا۔ 1818 میں کلکتے میں ہندو کالج کا افتتاح ہوا۔ سیکولر تعلیم کی سمت میں ایک اہم اور بنیادی کارِ عظیم 1825 میں دہلی کالج کا قیام تھا۔ 1827 میں ممبئی میں "ہندو کالج کے نمونے پر الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ 15 دسمبر 1842 میں کلکتے سے ریورنڈ جیمس لانگ نے لکھا کہ اُس نے اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ لینے کے لیے ہزاروں نوجوان طالب علموں کو کلکتے آتے دیکھا اور ان نوجوانوں کے والدین پچاس پچاس یا سو سو میل دور رہنے والے تھے۔ وہ خود کم از کم پانچ یا چھ ہزار ایسے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو

جانتا تھا جو مغربی تعلیم حاصل کرنے کے آرزو مند تھے۔

"تمھاری گفتگو کا ایک حرف بھی میری سمجھ میں نہیں آتا ہے"، جگ موہن نے کہا، "اس کا مطلب آخر کیا ہے؟"

"ہائے"، پردیپ نے اپنی گردن پیچھے ڈالتے ہوئے کہا، "میں تو سمجھتا تھا کہ تم کوئی احمقانہ سوال کروگے؟"

"اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے"، عزیز بڑبڑایا۔ "میں یہ کہہ رہا تھا کہ نہ جانے کب سے ہم اصلاحی تحریکوں پر بحث کررہے ہیں۔ کچھ لوگ ان کی اساس، روشن خیالی اور مغربی تعلیم میں دیکھتے ہیں اور اس کی ابتدا کا سہرا مغربی دانش وری کے اثرات کے سر باندھتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو خود اپنی دانش ورانہ روایات میں احتجاج اور اختلافات کی طویل روایت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے اور ینگ بنگال گروپ کے اراکین کی کوششوں میں اس کی نظیر ملتی ہے۔

ٹیگور نے بہت صحیح طور پر کہا کہ ہندستان میں عہد جدید کے بانی کی حیثیت سے رام موہن نے برہمو سبھا (جو بعد میں برہمو سماج کہلائی جانے لگی) قائم کی جس نے ذات پات کی تفریق اور بت پرستی کو رد کیا اور اپنشدوں کی ابتدائی موحدانہ سچائی کی طرف لوٹنے کی بات کی۔ انھوں نے 1823 میں مغربی تعلیم کے موضوع پر ولیم پٹ کے نام اپنا معروف خط لکھا اور مغربی علوم کے فروغ میں پبلک فنڈ کو استعمال کرنے کی تجاویز پیش کیں جنھیں بعد کو بینٹنک انتظامیہ نے اپنایا۔ یہ مت بھولو کہ ستی کی رسم کے خلاف رام موہن کا پہلا رسالہ 1818 میں شائع ہوا تھا۔ اجمالی طور پر مذہبی روایات کی ایک زیریں لہر، جو غالباً بغیر کسی مزاحمت کے چلتی رہی تھی، شاعروں اور ولیوں کے ایک پورے سلسلے میں ایک زندہ حقیقت تھی۔ یہ شاعر اور ولی مختص طور پر سیدھی سادی اور تقریباً ان پڑھ اکثریت سے تعلق رکھنے والے تھے۔ اور یہ بات صرف بنگال ہی نہیں بلکہ سارے ہندستان پر صادق آتی تھی۔

Atmiya Society (1815) اور Unitarian Society (1822) کے تتمے کے

طور پر برہمو سماج (1822) قائم ہوئی۔ رام موہن رائے کے جانشین دیپندر ناتھ ٹیگور (1817-1905) نے لکھا تھا کہ برہمو لوگ اپنے عقیدے کی بنیاد مذہب کی بنیادی سچائیوں پر جن کی تصدیق عقل و شعور کرتے ہیں، رکھتے ہیں۔ یہ وجودِ عالیہ (Supreme Spirit) اور اپنے رابطے کے درمیان، انسان، کتاب اور کسی شبیہ کو آنے کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور اس سب سے زیادہ یہ کہ یہ لوگ برہمو پہلے تھے ہندستانی یا ہندو بعد میں۔ انھوں نے اس بات پر بہت زور دیا کہ ان لوگوں کو اپنے مذہب کے جوہر یعنی شبیہوں اور مجسموں کو پوجنے کو ترک کرنے کے اپنے عہد سے پھرنا نہیں چاہیے۔ مادر وطن عزیز تھی مگر ان کا مذہب عزیزتر تھا اور برہما عزیزترین، بیٹے سے زیادہ عزیز دھن دولت سے زیادہ عزیز اور ہر دوسری شے سے اعلیٰ و برتر۔

جگ موہن ستی کی رسم کے بارے میں کچھ مزید جاننے کے لیے بے چین تھا۔ ستی عموماً ہندوؤں کے اعلیٰ طبقے کی رسم تھی۔ اس کا ذکر سب سے پہلے ولیم کیری (1791)، چارلس گرانٹ اور کلاڈیس بُش مین، جیسے مبلغین نے کیا۔ کرنل ولیم سلیمین جس نے 50-1849 میں اودھ کا دورہ کیا تھا، ہر قصبے اور تقریباً ہر گاؤں میں ستی کے بے شمار مندر دیکھے تھے۔ جب اِس نے ان کے بارے میں دریافت کیا تو اسے بتایا گیا:

> "جناب۔ یہ مندر عام طور پر برہمنوں، تاجروں، ہندو افسران، کاروباریوں اور دوکانداروں کی بیواؤں کی یاد میں بنے ہیں۔ کیا اودھ میں راجپوت زمینداروں کی بیواؤں کی یاد میں ایسے مندر بہت ہیں؟ حضور میں نے ایسا کوئی مندر نہیں دیکھا ہے۔ اور کسی راجپوت زمین دار کی بیوہ کو اپنے آپ کو جلانے کی بات بھی شاید ہی سنی ہو۔ نہیں حضور، بختاور سنگھ نے کہا ایسی عورتیں ستی ہونے کے لائق کیسے ہوسکتی ہیں؟ اتنے بہت سارے معصوم بچوں کے خون سے لال اپنے ہاتھوں کے ساتھ یہ ستی (ماتا) بننے کی جرأت نہیں کرسکتیں"، حضور ہم برہمن اور دوسرے معزز ہندو اپنے یہاں لڑکیوں کے پیدا

ہونے کو اپنی عزت افزائی سمجھتے ہیں۔ اور ہم اس وقت تک ایک پرمسرت زندگی کو یقینی نہیں سمجھتے جب تک کہ عزت و وقار کے ساتھ ان کی شادی نہ کردیں۔ یہ، حضور ہمارا وہ فرض ہے جس کا ہمارے دیوی دیوتا ہم سے مطالبہ کرتے ہیں اور جس کی طرف سے لاپروائی اور بے توجہی، ہم نہیں سمجھتے کہ وہ کبھی معاف کریں گے .... وہ عورتیں اور وہ مرد جو پیدا ہوتے ہی اپنی لڑکیوں کو مار دیتے ہیں اس زندگی میں یا دوسرے جنم میں کیسے کوئی توقع رکھ سکتے ہیں؟ اپنے جرائم کا شعور رکھنے والی بیوائیں جلتی ہوئی چتا میں کود کر اپنے ان شوہروں کے ساتھ جان دے دینے سے کیا امیدیں رکھ سکتی ہیں جو ان سے جرائم کرانے کا سبب بنے تھے؟ اور آپ کیا یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی قربانیوں میں بیواؤں کے لیے کہ جنھوں نے اس زندگی میں اپنے فرائض کو ادا کیا ہے کوئی خوبی یا کوئی ثواب ہے؟ یقیناً حضور میں سمجھتا ہوں۔ اگر کوئی خوبی نہ ہوتی تو پھر بھگوان نے انھیں جلنے کی تکلیف سے ایسا بے نیاز کیوں بنایا ہوتا؟ میں نے اپنے زمانے میں بہت سی بیواؤں کو اپنے آپ کو جلاتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے انھیں اپنے اس ارادے کے اعلان سے لے کر مرنے تک دیکھا ہے۔ ان سب کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے انھیں آگ کے شعلوں کی تپش اور جلنے کی تکلیف کا کوئی احساس ہی نہیں ہے۔ کوئی احساس نہیں۔ ایسی آزمائشوں سے گزرنے کی طاقت صرف اوپر والا ہی دیتا ہے۔ اس پر یقین کیجیے حضور کہ خود اپنی اولادوں کے ہاتھوں مارے جانے والے راجپوت کی بیوہ کی کوئی ایسی مدد کی جائے گی۔ وہ جانتی ہیں کہ ان کے ساتھ ایسا نہیں ہوگا اسی لیے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے

وہ ایسی آزمائشوں میں اپنے کو کبھی نہیں ڈالتی ہیں۔ صرف
وفادار بیویاں اور اچھی مائیں ہی ایسا جوکھم اٹھا سکتی ہیں۔
شراب بندی پر بھی حضور، راجپوت اور ان کی بیویاں بہت
خوش تھیں کیونکہ اب دوسرے لوگ وہ سب کچھ نہیں
کرسکتے تھے جسے کرنے کی وہ پہلے ہمت کرلیا کرتے تھے؟"
"سیتا رام تمھارا کیا خیال ہے؟" حضور میں سمجھتا ہوں کہ بچہ
کشی کے اس جرم کی جڑیں خاندانی خودپسندی اور تکبر میں
ہیں۔ یہ تکبر لوگوں سے کچھ بھی کرا سکتا ہے۔ یہ مغرور
راجپوت اپنے کو سالا یا سسر کہنے کا حق کسی کو نہیں دے
سکتے"۔

"کیا ستی کی رسم آج کل بھی ہوتی ہے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"سچ تو یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے۔ 1934 میں آئی سی ایس آفسر وائی ڈی گنڈیوا نے قنوج سے قریب فتح گڑھ (یوپی) میں ہونے والے ایک واقعے کی رپورٹ دی تھی۔ میں جو کچھ جانتا ہوں وہ ایک ستی مندر کی موجودگی ہے۔ یہ مندر غالباً آزادی سے قبل یا آزادی کے بعد گڑگاؤں کے ایک گاؤں بھونڈسی میں بنا تھا۔ اور وہاں نیچی ذات کے ہندو نہیں صرف ہرگوجر راجپوت جاتے تھے۔ اکتوبر اور نومبر کے درمیان کارتک کے متبرک مہینے میں عورتیں برت رکھتی ہیں اور اسی جگہ ایک میلے میں شریک ہوتی ہیں۔ کچھ ان دانشوروں کا جو غیر مذہبیت، تعقل اور اعتدال کے مغربی نظریات کے نکتہ چیں ہیں، کہنا ہے کہ ایسے مندروں کے وسیلے سے ستی کی روایت اپنے آپ کو ضروری نہیں ہے کہ مزید مستحکم کرتی ہو۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ ایسی علامتیں، خود کو فنا کردینے والے اور وفادار بیوی کے مشتبہ اور مشکوک تصور کو تقویت اور اعتبار بخشتی ہیں، اور عورت کی شبیہ کو پاک دامنی، نیکی اور ایثار و قربانی کے ایک اکمل نمونے کے طور پر استحکام عطا کرتی ہیں۔ بھونڈسی کے مندر سے متعلق ایک پریشان کن حقیقت یہ بھی ہے کہ راجپوتوں نے ستی کو جائز قرار دے کر فلسفہ

کثرت وجود اور اتحاد پسند عقیدوں اور رواجوں کو کمزور کردیا۔ بدترین بات یہ ہے کہ ستی مندر وہ چاہے جھونڈسی میں ہو یا کہیں اور، مذہبی قدامت پسندی کی ہمت افزائی کرنے، ذات پات کی تفریق کو دوام بخشنے اور سر قبیلی (Patriarchal) اقدار کو توانا رکھنے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی طرف اشارہ کرتا ہے"۔

"مگر کیا مغلوں نے ستی کی رسم کو ختم نہیں کردیا تھا؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اچھا سوال ہے۔ اکبر نے اس رواج کو ختم کرنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔ دوسری طرف اورنگ زیب نے یہ حکم جاری کیا کہ مغل قلمرو میں اب کبھی کوئی افسر کسی عورت کو اس طرح جلنے کی اجازت نہیں دے گا۔ بعد کو مراٹھا حکمرانوں نے بھی ستی کو ترک کرنے کی صلاح دی۔ چندر ناگور میں فرانسیسیوں نے ڈینش لوگوں نے سیسرام پور میں اور پرتگالیوں نے گوا میں ستی کو ممنوع قرار دیا۔ ان جگہوں کے ہندو باشندوں کو جلانے سے پہلے انگریزی علاقے میں جاکر انگریز مجسٹریٹ سے اجازت حاصل کرنا ہوتی تھی۔ ستی کی رسم انگریز کے زیراثر علاقوں میں راجستھان اور بنگال میں بڑے پیمانے پر رائج رہی"۔

"ٹھیک ہے"، پردیپ نے اتفاق ظاہر کیا۔

عزیز نے باقی کہانی کو بھی بیان کرنے کا فیصلہ کیا۔ "میں ابتدا میں بتا دوں کہ مارکس نے اپنے "Notes on Indian History for 1849-51" میں لکھا تھا کہ انگریزوں نے ڈکیتی، ٹھگی، لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مارنے، انسانی قربانی اور ستی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہندستان ایک تعمیری عہد کی دہلیز پر کھڑا تھا، اس نے کہا کہ برطانوی سرمایہ داری خود ایک بالغ مرحلے میں داخل ہورہی تھی۔ اس کا سہرا ڈلہوزی کے سر بندھا۔ دنیا کی طویل ترین نہر، گنگا نہر اپریل 1854 میں رڑکی میں شروع کی گئی۔ یہ آب پاشی اور آبی سفر دونوں کے لیے استعمال کی گئی۔ کلکتے سے مدراس اور بمبئی سے اٹک تک ٹیلی گراف کی نئی لائنیں فروری 1885 میں عوام کے لیے کھولی گئیں۔ برطانیہ کی روئی کی تجارت کے لیے اہم ریلوے لائن کا پہلا جال بھی کلکتہ اور مدراس سے بچھا اور اس پر آمدورفت 56-1853 میں شروع ہوئی۔

بورڈ آف کنٹرول کے صدر چارلس ووڈ نے ریلوے لائنوں کو مختلف شہروں سے روئی والے اضلاع تک لے جانا چاہا۔ اس نے ڈلہوزی کو بتایا کہ بس یہی چیز ہے مانچسٹر کے لوگوں کو جس سے دلچسپی ہے"۔

"ریل ویز کے بارے میں تم ہمیں اور کیا بتا سکتے ہو؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"کچھ بہت نہیں۔ بس یہی کہ تقسیم ملک کے وقت بیس ہزار میل براڈ گیج، سولہ ہزار میل میٹر گیج اور تین ہزار نو سو میل نیرو گیج پٹریاں تھیں"۔

اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کے لیے عزیز ایک لمحے کے لیے رکا پھر بات شروع کی اور پھر چپ ہو گیا۔

"بلا شبہ"، اس نے سلسلۂ گفتگو پھر شروع کیا۔ "کمپنی کے مالی معاملات کچھ بہت امید افزا نہیں تھے۔ یہ صورت حال بسا اوقات لندن میں ان کے اختیارات کو کم کرا دیتی تھی۔ کیا چین سے تجارت میں کوئی بہت انحطاط آگیا تھا؟ نہیں، افیون جس کی جاگیرداری ہندستان میں کمپنی کے پاس تھی، جنگ اور اسمگلنگ کے ذریعے بڑی مقدار میں چین پر تھوپ دی گئی۔ 1855 میں حکومت کے کل ریونیو کا ساتواں حصہ چین کے ہاتھ افیون کی فروخت پر منحصر تھا۔ چائے اور افیون سے حاصل ہونے والے ریونیو میں کوئی کمی؟ حقیقتاً کوئی نہیں۔ یا زمین کے بندوبست کی متنوع نوعیتوں سے؟ بنگال میں 1793 کا استمراری بندوبست اور مدراس میں رعیت واری (کسان یا رعیت کے ساتھ) انتظام؟ نہیں۔ اس کے برعکس، ہندستان آہستہ مگر مسلسل ایک نوآبادیاتی اقتصادیات کی طرف کھسکتا رہا۔ خام مال کو فراہم کرنے والا، مصنوعات کے لیے منڈی، اور اپنے حکمرانوں کے لیے نفع"۔

بندوبست استمراری نے زمین داروں کو محض زرعی ریونیو جمع کرنے والے تنخواہ دار افسر ہی تسلیم نہیں کیا بلکہ انھیں زمین کا پشتینی مالک بھی مانا۔ اس کے بدلے میں زمین دار اپنی آمدنی کا دسواں گیارھواں حصہ ریاست کو دیتے تھے۔ یہ طریقہ کار بنارس میں تھا۔ مدراس میں تھامس منرو نے ایک رومینٹک سرقبیلی (paternalism) اور

دیہی تنظیم کے سیدھے سادے نقطہ نظر کی روشنی میں کام کیا۔ اس نے رعیت داری کا طریقہ اپنایا، یہ براہ راست زمین جوتنے والے اور حکومت کے درمیان معاہدہ تھا اور اس میں بچولیوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ رعیت داری طریقے کے تحت رعیت اور گورنر اِن کاؤنسل کے مابین اتنے ہی بچولیے ہوتے تھے جتنے کہ زمین داری نظام میں ہوا کرتے تھے۔

بندوبست استمراری نے زمین داروں کی ایک مصنوعی جماعت پیدا کردی جو پچھلے زمین داروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ حریص اور غارت گر تھی۔ یہ زمین دار وہ تھے جو دوسرے صوبوں سے اکھاڑ دیے گئے تھے۔ قرضوں کی ادائیگی کے لیے جو خرید و فروخت ہوئی اس میں زمین کی معتدبہ منتقلی بھی ہوئی۔ اُن چھ بڑی زمین داریوں میں، جو سب مل کر بنگال کے کل زرعی ریوینیو کا نصف ادا کیا کرتی تھیں صرف بردوان ایسی زمین داری تھا جو انیسویں صدی میں، اپنے نصف سے زیادہ علاقے کے ساتھ داخل ہوا۔ تبدیلی صرف مالیے کے تحصیل کے حق ملکیت میں ہوئی زمینوں میں نہیں۔ درحقیقت، تعلقداروں اور زمین داروں کی ایک نسبتاً چھوٹی جماعت نے زمین داریوں کی فروخت سے بازار میں آنے والے حقوق کا بڑا حصہ خرید لیا۔

کلکتہ میں رہنے والے صاحب املاک زمین داروں نے گاؤں کی فاضلات (surplus) کا زیادہ سے زیادہ حصہ تخمینی نرخوں کو بڑھانے یا برابر کرنے میں ہتھیا لیا۔ رعیت داری نظام نے جو مہاراشٹر میں منفعت بخش (utililtarian) اصلاح کا سب سے زیادہ اہم قدم سمجھا جاتا تھا ہندوؤں کے مختلف فرقوں کو ان کی باہمی پیوستگی اور توانائی سے محروم کردیا۔ صحیح ہے کہ اس نظام نے متمول کاشتکاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت کو بڑھاوا دیا اور utilitarians یہی چاہتے بھی تھے۔ بہرحال وانی (Vani) کے نودولتیا طبقے کے عروج نے، جو کاشت کاری میں شریک نہیں ہوئے اور دیہی اقتصادیات میں ایک مفت خورے کے کردار کو ترجیح دی، پاٹلوں اور دیشمکھوں کے زوال کی رفتار کو تیز کردیا۔ پاٹل اور دیشمکھ وہ لوگ تھے جنھوں نے مہاراشٹر کے گاؤں کی تخلیقی توانائیوں اور ان کی خودکفالتی کو زندہ رکھا تھا۔ افادیت پسندی کی ترغیب کے تحت ہونے والی

اصلاحات کے کھوکھلے پن سے واقف ہونے کے لیے 1875 کے دکن کے فسادات کا مطالعہ کرو"۔

مہاراشٹر اور دوسرے مقامات پر کاشتکاروں کے مصائب اور افلاس و تنگ دستی سے متعلق کافی دستاویزات موجود ہیں۔ برطانوی ہند کے کاشتکاروں کا مقابلہ مشرقی شان و شوکت ٹھاٹ باٹھ اور تعیشات میں الٹے تلٹے کرتے ہوئے ان بدیسیوں سے کرو جو ان پر حکمرانی کررہے تھے۔ ایک جونیر سیولین، کھیت جوتنے والے ایک آدمی کی سال بھر کی آمدنی ایک ہفتے میں صرف اپنے سگار کے دھوئیں میں اڑا دیتا تھا۔ راج کے تاج میں دوسرا ہیرا سستے مزدور بھی تھے۔ اگرچہ اس ہیرے کی چمک دمک کے پیچھے ابتری، بھوک، گندگی، بیماری اور گداگری کی ایک کہانی تھی۔ ایسی بددماغی، ایسا تمول اور اتنی فاقہ زدگی!

ابتدا میں مطلق العنانی اور استبداد میں ایک سیاسی کلچر کی آمیزش ہوتی تھی جو اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ حکمرانوں کو ریوینیو کے بڑے بڑے مطالبات کے بدلے میں خدمت اور اخراجات کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔ مگر انگریزی سرکار نے ایسی پابندیوں کو شاذ ہی تسلیم کیا۔ اسی لیے ابتدائی نوآبادیاتی ریاست کے جواز کا بحران ایک اقتصادی بحران کے ساتھ ساتھ ایک اخلاقی بحران بھی تھا۔

یہ تم چاہو تو برطانوی استعمار اور ترکوں، افغانوں اور مغلوں کے راج میں ایک باریک سا فرق بھی ہے۔ برطانوی راج کی ساری بنیاد، مغلوں کی حکومت کی اساس سے اتنی مختلف تھی کہ اول الذکر کے بارے میں کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ موخرالذکر کا کسی طرح بھی کوئی تسلسل تھا۔ ملک کے ریوینیو کا تصور، ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیادہ سے زیادہ نفع کا تھا اور یہی وہ بنیادی اصول تھا جس کے تحت برطانوی قلمرو کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ دولت کو انگلستان لے جانا، چاہے عوامی ذریعوں سے ہو یا چاہے نجی ذریعوں سے، آخری اور حقیقی مقصد تھا۔ سلطنت کی اپنی ناہمواریاں تھیں لیکن یہ اگر انصاف سے دیکھیے تو اپنی ماہیت اور اپنے مواد کے لحاظ سے بالکل مختلف تھیں۔

عزیز نے برطانوی حکومت کے بیک وقت تخریبی اور مصلحانہ کردار سے متعلق مارکس کے خیالات پڑھے تھے۔ جرمن فلاسفر نے کہا تھا کہ انگریز پہلے برتر فاتح تھے اس لیے ہندو تمدن کے لیے ناقابل رسائی تھے۔ انھوں نے دیسی کمیونٹیز میں تفرقہ ڈال کر، دیہی صنعتوں کو برباد کر کے اور دیہی سماج کی ہر اس چیز کو جو اعلیٰ تھی، عظیم تھی، تہس نہس کر کے اس (تمدن) کو تباہ و برباد کردیا۔ ان کی تاریخ کے اوراق میں تباہی و بربادی کے علاوہ شاید ہی کچھ اور ملتا ہو۔ کھنڈرات کے ڈھیر میں تعمیری اور جان پرور کام کی شہادت شاذ و نادر ہی ہوگی۔ پھر بھی، بہرحال اس کا آغاز ہوچکا تھا"۔

"تم ایک بات کہتے ہو"، پردیپ نے کہا، "لیکن ابھی کل ہی نخاس میں میری ملاقات ترویدی سے ہوگئی اس نے بالکل مختلف انداز میں بات کی۔ اس نے گرو گول والکر کی کتاب سے ابواب اور عبارتوں کے حوالے دے کر اس بات کی وضاحت کی کہ انگریزوں نے اتنے وسیع و عریض اور متنوع ملک پر اپنے تسلط کو کیوں کر پھیلایا۔ میرا مطلب ہے کہ یہ سب ذہن کو پریشان کردینے والا ہے۔ تم نے کہا کہ 1901 میں ملک کی کل 294,000,000 آبادی میں یورپین اور پیوندی (Allied) نسل والے لوگوں کی تعداد محض 170,000 تھی۔ اس طرح چند لوگ اتنے بہت سارے لوگوں کے مقدر کے مالک تھے اور اتنی طویل مدت تک تھے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے کس طرح اتنی آسانی سے اطاعت قبول کرلی"۔

"میں خود حیران ہوں"، جگ موہن نے کہا، "تم ہندستانی ایمپائر کی وسعت بتاؤگے؟"

"ارے، ترویدی"۔ عزیز نے کہا، "وہ آریہ سماج کے گڑھ لاہور کے ایک ڈی اے وی اسکول کا پڑھا ہوا ہے۔ مجھے بہت نہیں معلوم ہے سوائے اس کے کہ اس کے بانی دیانند سرسوتی تھے۔ ذاتوں کے امتیازات کو (ورن کے نظام کی مخالفت کیے بغیر) پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بت پرستی کو ترک کیا اور موحدانہ اور غیر بُت پرستانہ ویدک دھرم کی تمام دوسرے مذاہب پر برتری کی تصدیق کی۔ انھوں نے 1863 سے 1375 تک لمبے لمبے سفر کیے اور بمبئی اور کلکتے میں ممتاز مصلحین سے

ملاقاتیں کیں۔ کلکتے میں وہ بیوگی، کم سنی کی شادی اور تعلیم کی کمی جیسے عورتوں کے مسائل سے واقف ہوئے، بنگالی مصلحین میں یہ مسائل اس وقت زیر بحث تھے۔ جلدی ہی 1860 کا یہ جہاں گرد سنیاسی ایک سماجی اور مذہبی مصلح، ہندستان کا ہونے والا لوتھر بن گیا۔

دس اصول جنھیں ہر آریہ کو رکنیت کی درخواست دیتے وقت ماننا پڑتا تھا وہ اس کے عقائد اور اس کے اصولوں کی واحد مصدقہ تفسیر ہیں۔

1. خدا تمام حقیقی علم اور اس کے وسیلے سے جانی جانے والی ہر چیز کا مبداء و ماخذ ہے۔

2. خدا علم کل ہے، حسنِ کل ہے، غیر مادّی ہے، قادر مطلق ہے، منصف، رحم کرنے والا، غیر زائیدہ (لم یولد)، کسی ابتدا کے بغیر ہے (Without a beginning) ناقابل بدل ہے، عدیم المثال ہے۔ ہر شے کا سہارا سب کا آقا ہے، All-pervading اور ہمہ داں ہے۔ لازوال اور لافانی ہے، بے خوف ہے، ابدی وازلی ہے، پاک ہے اور کائنات کا سبب۔ صرف اسی کی عبادت ہم پر فرض ہے۔

3. وید علمِ حقیقی کی کتابیں ہیں۔ اور ہر آریہ کا سب سے بڑا فرض انھیں پڑھنا، انھیں سننا، دوسروں کو پڑھانا اور دوسروں کو سنانا ہے۔

4. ہر آریہ کو حق کو ماننے اور جھوٹ سے انکار کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

5. تمام اعمال نیکی کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یعنی ہر کام صحیح اور غلط کے بارے میں پورے غور و خوض کے بعد کرنا چاہیے۔

6. سماج کا بنیادی فریضہ ہے بنی نوع انسان کی جسمانی روحانی اور سماجی حالت کو بہتر کرکے ساری دنیا کو فائدہ پہنچانا۔

7. ہر شخص سے ساتھ محبت، انصاف اور اس کی خوبیوں کو دیکھ کر سلوک ہونا چاہیے۔

8. جہالت کو ختم کرنا چاہیے اور علم کو پھیلانا چاہیے۔

9. کسی شخص کو صرف اپنی خوبیوں پر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے۔ ہر شخص کو وہ چاہے عورت ہو یا مرد، صرف اُس خوشحالی اور سکھ کو اپنا سمجھنا چاہیے جس میں دوسروں کے سکھ اور دوسروں کی خوشحالی شامل ہو۔

10. اُن معاملات میں جن کا اثر ہماری نسل کی عام سماجی فلاح و بہبود پر ہوتا ہو، ان میں کسی کی ذاتیات کو دخل انداز ہونے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ صرف خالص ذاتی معاملات میں ہر شخص آزادی سے عمل کر سکتا ہے۔

"ان دس اصولوں کے علاوہ کوئی دوسری چیز ایک دوسرے کو متحد کرنے والی نہیں ہے۔ اعتقادی تعلیمات صرف وہ ہیں جو پہلے تین اصولوں میں بیان کی گئی ہیں۔ ان میں آریہ سماج کا خدا کا عقیدہ، God-Head کا تصور اور ویدوں کے متعلق اس کی تعلیمات بتائی گئی ہیں۔ یہ یقیناً سادہ ترین مسلک ہے، جس کی حمایت و پیروی میں کسی ہندو کو کسی حالت میں بھی کوئی دشواری نہیں ہونا چاہیے۔

"مگر آریہ سماج"، جگ موہن نے سوال کیا، "پنجاب میں اتنی مقبول کیوں ہوئی؟ بہت دن ہوئے میرے چچا نے بتایا تھا کہ پنجابیوں نے دیانند کے طریقے کے لیے بڑی گرمجوشی دکھائی جبکہ برہمو سماج کی طرف ان کا رویّہ عدم دلچسپی کا رہا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ برہمنوں اور پنڈتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے اور خالص ویدک ریتوں، رواجوں اور اس کے اپنے صحیفوں کو عوام کو واپس دے کر دیانند نے پنجابیوں کو اصلاح کے عمل سے اور حقِ قومیت سے محرومی کے احساس سے آزادی دلادی"۔

"کیا یہ تحریک کمیونل (فرقہ پرست) تھی؟" پردیپ نے پوچھا۔

"یہ یقیناً مسلم دوست یا اسلام دوست نہیں تھی"، عزیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ دیانند کے ایک پیرو پنڈت لیکھ رام نے "آریہ گزٹ" نکالا۔ انھوں نے اس رسالے کو اسلام کے خلاف اپنے غم و غصے کو نکالنے کا ذریعہ بنایا۔ وہ بھی آخر میں ایک دوسرے آریہ سماجی لیڈر شردھا نند کی طرح قتل کیے گئے۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے شدھی کرن میں سماج شامل تھی، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو دھرم کی طرف واپسی کی رسومات آریاؤں نے ادا کیں اور ایسی تقریبات کی سرپرستی کی۔ دیانند نے، جو اپنے زمانے کی ایک دیوپیکر شخصیت تھے، اپنے پیچھے رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی کوئی وراثت نہیں چھوڑی۔ وہ خود بھی مسلمانوں کے بہت بڑے نکتہ چیں تھے۔ ان کی مشہور کتاب، "ستیارتھ پرکاش"، پنجاب میں اسلام مخالف نزاعی بحث و مباحثہ کی بنیاد بنی۔ بحیثیت مجموعی اگر دیکھئے تو بنگال میں اصلاحی تحریکوں کا کردار یقیناً زیادہ لبرل اور زیادہ وسیع المشرب تھا۔ یہ صورت حال پانچ دریاؤں کی سرزمین اور مہاراشٹر میں نہیں تھی"۔

تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ پردیپ ایک کٹر سناتنی آریہ سماج کے بارے میں کچھ بہت نہیں جانتا تھا، جگ موہن کی واقفیت بھی زیادہ نہیں تھی۔ اور پھر اس کی دلچسپی انڈین ایمپائر میں تھی۔ اس کے استفسارات کے جواب میں عزیز نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں انگریزوں نے 540000 مربع میل کے علاقے پر حکومت کی۔ یہ علاقہ بنیادی طور پر مشرقی ساحل کے ساتھ ساتھ زمین کی ایک پتلی پٹی سے باہم جڑے ہوئے ڈیلٹا (بنگال پریسیڈنسی) اور جنوب میں برصغیر کے ضمیمے (Appendix) (مدراس اور بمبئی پریسیڈنسی) پر مشتمل تھا۔ درمیانی علاقوں میں راجوں مہاراجوں کی ریاستیں تھیں۔ ان کی بقا کے ضامن راجدھانی میں کمپنی کے فوجی دستے تھے۔ اس ضمانت کی اجرت ان کو ریاستوں کے حکمرانوں سے ملتی تھی جن کی حرکات و سکنات پر برٹش ریذیڈنٹ نظر بھی رکھتا تھا اور انھیں کنٹرول بھی کرتا تھا۔ یہ راجے مہاراجے تقریباً نوے ملین آبادی کے براہِ راست حاکم تھے اور تقریباً ساڑھے

بارہ لاکھ مربع میل کے علاقے کی جو لگ بھگ ایک سو چالیس ایک سو پچاس ملین باشندوں پر مشتمل تھا، پاسبانی کرتے تھے۔

1818 میں بنگال میں فورٹ ولیم کی پریسیڈنسی میں بہار، اڑیسہ اور بنارس کے کنارے کے فتح کیے ہوئے اور عطا کیے ہوئے صوبے شامل تھے۔ انھیں صوبہ آگرہ (1834) اور شمال مغربی صوبجات (1836) کا نام دیا گیا۔ فورٹ ولیم والی بستی میں 1928 میں کہیں زیادہ یوروپین تھے۔ دو ہزار ایک سو چھے یورپینوں میں سے تقریباً ایک ہزار پانچ سو پچانوے یورپین بنگال میں رہتے تھے خصوصاً کلکتے میں۔ اسی طرح 1900 میں بمبئی پریسیڈنسی میں شہر (Town) بمبئی کا جزیرہ، بمبئی گودی کا جزیرہ، Salsette کا جزیرہ، جنوبی کونکن میں دور افتادہ بنکوٹ کا اسٹیشن (فورٹ وکٹوریہ) اور سورت کا شہر اور ضلع شامل تھا اور اس کی یوروپین آبادی ایک سو سولہ سے زیادہ نہیں تھی۔ مدراس پریسیڈنسی ایک لاکھ چالیس ہزار مربع میل پر محیط سات ضلعوں کے علاقے پر مشتمل تھی۔

ہندستان پر ایک مستبدانہ طرز کی حکومت تھی اور رپن کی وائسرائی اصلاحات ہونے تک اور صوبوں میں 1892 کے انڈین کاؤنسل ایکٹ کے نفاذ تک نمائندہ حکومت کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ پابندِ شرائط، سول سروس کمپنی راج کا ڈھانچہ تھا۔ 1793 کے چارٹر ایکٹ میں قانونی حیثیت ملنے کے بعد سول سروس میں تقررات کو باضابطہ کرنے کا اختیار 1857 کے بعد سکریٹری آف اسٹیٹ کو دے دیا گیا تھا۔ قطعی تقرر سے پہلے سکریٹری آف اسٹیٹ کے ساتھ ایک معاہدہ یا اقرار نامہ ہوتا تھا۔ اس میں وائسرائے کے تئیں وفاداری اور سرکاری ضوابط کے مطابق رکھی گئی شرائط کو ماننے کا عہد کرنا ہوتا تھا۔ آئی سی ایس افسروں کی تعداد کسی ایک وقت میں، 1859 میں 846 اور 1899 میں 1021 کے درمیان گھٹتی بڑھتی رہی۔ 1879 میں آئی سی ایس میں صرف ایک ہندستانی تھا۔ 1902 تک بتیس مزید افراد اس حیثیت میں داخلے کے لائق ہوئے۔ 1902 میں ایک ہزار سرسٹھ افسروں میں چالیس ہندستانی تھے۔

1806 میں Hert Ford میں قائم ہونے اور 1809 میں Hailey Bury میں

منتقل ہونے والے ایسٹ انڈیا کالج نے انتظامیہ اور عدلیہ کے لیے افسر تیار کیے اور بہتر پبلک اسکول خصوصاً رگبی، مارلبرو اور ویلنگٹن نے انڈین آرمی کو اس کے آفیسرز مہیا کیے۔ فوج نے ایشیا اور افریقہ میں برطانوی برتری اور تفوق کو برقرار رکھنے کے وسائل فراہم کیے۔ غدر کے چالیس سال بعد ہندستانی فوجیں، چین (1859)، ایتھوپیا اور سنگاپور (1867) ہانگ کانگ (1868) افغانستان (1878) مصر (1882) برما (1885) نیاسالینڈ (1893) سوڈان اور یوگنڈا (1890) گئیں۔

ہندستان اورینٹل سمندروں میں برطانوی بیرک تھا جہاں سے انگریز بغیر کوئی معاوضہ دیے ہوئے جتنی فوجیں چاہیں حاصل کر سکتے تھے۔ شروع شروع میں فوج مختصر سی تھی مگر انقلاب فرانس اور نپولین جنگوں کے دوران ان میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ اور یہ فوجیں جو 1790 میں 115000 تھیں۔ 1805 میں بڑھ کر 155000 ہو گئیں۔ 1857 میں فوج 34000 یوروپین اور 257000 ہندستانیوں پر مشتمل تھی۔ ٹیکس کا ادا کرنے والا ہندستانی نہ صرف یہ کہ اپنی ماتحتی اور غلامی کا معاوضہ دے رہا تھا بلکہ تقریباً نصف انگریزی فوج کے راتب (رسد) کا انتظام بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ اس طرح ہندستانی ایمپائر ایک سیاسی اور اقتصادی املاک تھی۔ اس کے محصولات اور اس کی مین پاور نے ایمپائر کی ریڑھ کی ہڈی کا کام کیا، اس نے دفاع کی ڈھال فراہم کی اور زنجبار سے بصرہ اور مشرق کی سمت میں Yellow Sea تک مزید پیش قدمی کے لیے تلوار مہیا کی۔ جزوی طور پر یہی صورت حال جنوبی سمندروں میں بھی تھی۔ کیونکہ ہندستانی فصیل (Bastion) نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے تحفظ میں بھی مدد کی۔ ان کے درمیان سپاہیوں اور رائل نیوی نے سارے مشرقی سمندروں اور پیسفک میں تجارتی قلمرو کی حفاظت کی۔ 1908 میں ہندستان سے متعلق لبرل سکریٹری آف اسٹیٹ جان مارلے نے، انگریزی فوج کے خزانے میں ہندستان کے سالانہ حصے کو 420000 پاؤنڈ سے بڑھا کر 720000 پاؤنڈ کردینے کی وار آفس کی درخواست کو مان لیا۔ اس بات پر جب لارڈ کچنر نے اعتراض کیا تو وار آفس نے جواب میں کہا کہ منصفانہ برتاؤ کے اصول کا نفاذ صرف خود مختار اتحادی ریاستوں پر ہوتا ہے، کسی ایسی ماتحت ریاست پر

جس میں غیر اور بے گانہ نسلیں آباد ہوں یہ اصول نافذ نہیں ہوتا۔

"ارے یہ آئی سی ایس والے"، جگ موہن نے کہا، "بڑے بڑے بنگلے بنواتے ہیں اور ان کے بچے قیمتی کاروں میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ جلدی ہی وہ ایک دو سوانح عمریاں لکھیں گے جس میں ہمیں بتائیں گے کہ انھوں نے کس طرح سلطنت کی بنیادوں کو اندر سے کھوکھلا کیا"۔

"میرے دادا جان"، پردیپ نے بیان کیا، "کہیں گے تم کپلنگ کو یہ جانے بغیر پڑھ ہی نہیں سکتے کہ آئی سی ایس اصل اور بنیادی سروس تھی اور یہ کہ اس نے سنٹرل سکریٹریٹ میں خود سب سے اوپر بیٹھ کر اور ضلع کے افسر کو سب سے نیچے رکھ کر ملک کو کس طرح چلایا"۔

عزیز جب بھی کسی چیز کے بارے میں شدت سے محسوس کرتا تو اس کا عموماً طریقہ یہ تھا کہ وہ بیچ کمرے میں اس طرح کھڑا ہو جاتا جیسے لوگ کہیں جانے سے پہلے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

"مجھے نہیں معلوم کہ میں پہلے کب اتنا جھنجھلایا ہوں۔ شعبے میں سازشیں — توبہ۔ محض آدھا درجن استاد اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے۔

"ڈپٹی کلکٹر کو کیا کام سونپے گئے تھے۔ میں جب بھی بارہ بنکی جاتا ہوں، لوگوں کو اُسے مائی باپ کہتے سنتا ہوں"۔

جب جگ موہن نے کلکٹر کے بارے میں سوال کیا اس وقت عزیز شعبے کی آئندہ طوفانی میٹنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

ان بیچاروں کے بارے میں کیا ہے؟ ہاں کلکٹر اکثر ہندستانیوں کے لیے حقیقتاً حکومت تھا۔ 1800 کے بعد اسے چھوٹا اگرچہ کسی قدر کریم النفس فرماں روا سمجھا جاتا تھا۔ وہ ہندستان میں جہانبانی کے برطانوی تصور کی اصل شبیہ تھا۔ اس قبیلے کا ایک بہت دل چسپ تذکرہ بی آر البیری میکے کی کتاب "Twenty One Days in India" میں ملتا ہے۔

پردیپ جگ موہن کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی ان مسکراہٹ میں خوشی بھی تھی اور استہزا بھی۔

☆☆☆☆☆

اس بظاہر مستحکم قلمرو کے لیے 1857 کی بغاوت ایک بہت بڑا دھماکہ تھی۔ "دی ٹائمز" (لندن) کے نامہ نگار ڈبلیو ایچ رسل نے لکھا، "انگریزوں کے سامنے ایک صرف غلاموں کی جنگ یا ایک طرح کے کسانوں کاشتکاروں کی ملی جلی لڑائی نہیں تھی۔ یہ لڑائی مذہب کی اور نسل کی لڑائی تھی اور ایک بدیسی حکومت کے جوے کو اتار پھینکنے کے لیے ایک انتقامی جنگ تھی۔ فوری سبب وہ چربی لگے ہوئے کارتوس تھے جن کے اوپر ایک خول چڑھا رہتا تھا۔ کارتوس چلانے سے پہلے جسے دانت سے کاٹ کر نکالنا ہوتا تھا۔ سپاہیوں کو بتایا گیا تھا کہ خول میں لگی ہوئی چربی گائے اور سور کی چربی تھی۔ گائے ہندوؤں کے لیے مقدس اور سور مسلمانوں کے لیے حرام تھا۔ یہی وہ چنگاری تھی جس نے ہندستان میں جو بارود بھی تھی اس میں آگ لگادی۔

جون 1857 کی اس بغاوت سے متعلق مارکس نے اپنے پہلے مضمون میں چربی لگے کارتوس اور سپاہیوں کو اپنے مذہب کے لیے خطرے کو اِس ہنگامے کا مبینہ سبب بتایا۔ اس نے یہ بات اپنی کسی رائے یا کسی قسم کی تحقیق کے بغیر کی۔ مگر اسے جلدی ہی اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ فوج میں بڑے پیمانے پر ایک سازش ہوئی تھی اور یہ کہ عوام کے انگریز مخالف جذبات بھڑک گئے تھے۔

دریائے جمنا کے بائیں کنارے پر میرٹھ میں لوگوں نے دس اور گیارہ مئی 1857 کو بغاوت کی۔ باغی سپاہیوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور بہادرشاہ کو اپنا لیڈر بنادیا۔ اس کے بعد بغاوت کی آگ بہت سی دوسری جگہوں میں لگی۔ دہلی کے جنوب مشرق میں بلبھ گڑھ کے جاٹ راجہ نے اپنے خاندان کی قدیم وفاداری کے نام پر بادشاہ کا ساتھ دینے کا عہد کیا۔ لکھنؤ میں بغاوت 30 مئی کو اڑتالیس نیٹو انفنٹری میں شروع ہوئی اور پندرہ دن کے اندر سارے اودھ میں پھیل گئی۔ گورنر جنرل کیننگ نے 19

جون 1857 کو لکھا کہ روہیلکھنڈ اور دو آب دہلی سے کانپور اور الہٰ آباد تک سارا ملک صرف یہی نہیں کہ انگریز کے خلاف بغاوت میں مصروف تھا بلکہ یکسر بے قانون اور بے لگام ہوگیا تھا۔ مارکس نے لکھا ہے کہ ہندستانی فوج میں بغاوتیں ہوتی رہی تھیں مگر یہ سرکشی اور اطاعت سے روگردانی کچھ مختلف تھی۔ اور یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ سپاہیوں کی رجمنٹس نے اپنے یورپین افسروں کو قتل کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے، اپنی باہمی نفرتوں کو بالائے طاق رکھ کر بہادرشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھادیا۔ مارکس کا کہنا تھا کہ شورش محض چند بستیوں تک محدود نہیں تھی بلکہ اس کا تعلق ایشیا میں برطانوی تفوق کے خلاف ایک عام بے چینی سے تھا۔ بنگال آرمی کی بغاوت، پرشین اور چائنا کی جنگوں سے جوڑی جارہی تھی۔

کوئی نہیں جانتا کہ اتنی پُرتشدد شورش کیوں ہوئی اور کیوں اتنی جلدی ختم ہوگئی۔ کیا یہ محض سپاہیوں کی بغاوت تھی، عوامی مدافعت، عوامی شورش یا ایک دَم توڑتی ہوئی فرسودہ استبدادی حکومت کی آخری کراہیں تھی یا زمانے کو ایک بار پھر جاگیردارانہ نظام کی تنہائی اور ظلم و ستم کی طرف لے جانے کی کوشش؟ ایک چھوٹی سی چنگاری جس نے آتش گیر مادّے کے ڈھیر کو آگ لگادی؟ کیا یہ ہندستانی جنگ آزادی تھی؟ ہندستانی قومیت کی صورت گری میں جن جذبات کی کارفرمائی تھی وہ 1857 میں انگریزوں سے نفرت کے اظہار میں نظر آتے ہیں۔ اگرچہ قومیت کے نوزائیدہ احساس نے جدید سیاسی قوم کی شکل ابھی اختیار نہیں کی تھی۔ اپنی روایتی مراعات کو قائم رکھنے کے لیے لڑنے والے بڑے بڑے جاگیردار بغاوت کی رہنمائی کررہے تھے۔ نئے طرز کی قومیت کو ابھی معرضِ وجود میں آنا تھا۔

جنگ کے مطلب کو اُن آئینی رشتوں میں ڈھونڈا جاسکتا ہے جو اس وقت کمپنی اور مغل بادشاہوں کے مابین تھے۔ کمپنی نے لگان دار (vassal) کی حیثیت کو قبول کرلیا تھا مگر 1843 میں گورنر جنرل نے رواج کے مطابق تحفے تحائف دینے سے انکار کرکے اُس اصلی شرط کو توڑ دیا جس نے کمپنی کو بادشاہ سے باندھ رکھا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کمپنی کے سپاہیوں کی بغاوت نہیں بلکہ باغی و سرکش کمپنی کے

خلاف اپنے بادشاہ کے پاس ان کی واپسی تھی۔

تو کیا یہ عظیم بغاوت، وسیع مسلم سازش کے نتیجے کے طور پر ایک مسلم سازش تھی؟ نہیں، سید احمد خاں نے اعلان کیا، سید احمد خاں جنھوں نے صدر امین کی حیثیت سے بجنور میں ساری انگریز آبادی کو بچایا تھا۔ اپنی کتاب "An Account of the Loyal Mahomedans of India" میں انھوں نے انگریزوں کے اس عام یقین کی تردید کی کوشش کی کہ اس ساری سازش اور سرکشی کو ان کے ہم مذہب افراد نے منظم کیا تھا۔ اس سے پہلے لکھی ہوئی اپنی ایک کتاب میں انھوں نے 1857 کی بغاوت کے اسباب بتائے تھے۔

1. ملک اور اس کے عوام سے حکومت کی ناواقفیت۔ جس کا نتیجہ یہ کہ عوام الگ تھلگ۔ ان کا کوئی قائد یا رہنما ایسا نہیں تھا جو ان کے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو اور یہ دیکھے کہ ان کو انصاف ملتا ہے۔ اسی لیے عوام خاموشی سے روتے رہنے پر مجبور تھے۔
2. عوام کی اور خصوصاً مسلمانوں کی نکبت اور ان کا افلاس۔
3. ایسے قاعدوں اور ایسے قوانین کا اپنایا جانا جو ہندستان کے مانے ہوئے رسوم و رواج سے ٹکراتے تھے۔ اور مذہبی احساسات کی تحقیر کرتے تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ عوام کو یہ یقین تھا کہ حکومت یکساں طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں پر عیسائیت اور مغرب کے طور طریقے کو تھوپنا چاہتی ہے۔
4. فوج کا خراب انتظام اور اس میں پھیلی ہوئی بے اطمینانی۔
5. لگان سے مستثنیٰ زمینوں کی باز دخلی۔

سید احمد خاں صحیح تھے مگر شاید انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ بغاوت کے

خدوخال مختلف اضلاع بلکہ گاؤں اور گاؤں میں بڑی حد تک الگ الگ تھے۔ اور ان کا تعیّن معیشت کے ان پیچیدہ جوڑوں اور رشتوں کی بنیاد پر ہوتا تھا جو حق ملکیت کے طریقوں اور استعماری ریاست کے متنوع اثرات کا پرتو ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک کے محض چھٹے اور آبادی کے چوتھائی سے بھی کم حصے پر اثرانداز ہوئے۔ پنجاب اور بنگال دونوں وفادار رہے۔ میرٹھ کنٹونمنٹ میں بغاوت کے شروع ہونے کے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر لاہور میں بنگال آرمی کے سپاہیوں کو غیر مسلح کرنے کی کارروائی انگریزوں کے لیے حکمت عملی کی ایک بڑی کامیابی ثابت ہوئی۔ دہلی سے باہر برج پر انگریزی فوجوں کے لیے کمک فراہم کرنے کے لیے پنجاب میں مسلمان، سکھوں اور کوہاٹ کے قبائلیوں کے ساتھ مل گئے۔ شمال مغربی صوبوں میں انھوں نے توقع سے کہیں بہتر کارکردگی دکھائی۔ راجا عموماً ایسی استقامت کے ساتھ ٹکے رہے کہ کیننگ کو انھیں طوفان میں پشتہ کہنا پڑا۔ حیدرآباد کے نظام اور رامپور، کرنال، مرادآباد اور ڈھاکہ کے نواب وفادار رہے۔ باغیوں میں سے ایک راجہ ہنونت سنگھ نے یہ بات بے سبب نہیں کہی تھی کہ بغاوت دبائی صرف اس لیے جا سکی کہ یہ سارے ہندستان میں نہیں بلکہ اودھ میں ہوئی۔

1857 کے لوگوں نے خود اپنی جس جدوجہد کو "Reigning Indian Crusade" کی حیثیت سے دیکھا تھا وہ عدم اتحاد، لیڈرشپ کے فقدان، کم درجے کی جنرل شپ اور کم تر فوجی مہارت کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کو سیدھی راہ پر لگانے کے لیے نہ تو کوئی نظریہ تھا اور نہ ہی کوئی پروگرام۔ کسانوں کی ہزار سالہ حکومت کا عقیدہ اتنا بھی مشترک پلیٹ فارم مہیا نہ کرسکا جتنا کہ چین میں ہمعصر تائی پنگ بغاوت نے اپنے ابتدائی مدارج میں فراہم کیا تھا۔ ابتدا سے ہی پرانے نظام کے نمائندے بڑی تعداد میں شریک تھے۔

مارکس نے دہلی میں شکست کے اسباب میں ریجیمنٹس میں اختلاف، ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ اور سپاہیوں اور تاجروں کے، کہ جنھیں سپاہیوں نے لوٹا تھا، باہمی اختلاف کو قرار دیا۔ نانا صاحب اور رانی جھانسی خودغرض تھے، سندھیا انگریزوں

کے پٹھو تھے اور ان کے ساتھ تھے مہاراجہ پٹیالہ جن سے جرمن فلاسفر انگریزوں کے ساتھ ان کی ملی بھگت کے لیے نفرت کرتا تھا۔

پھر بھی یہ شورش محض چند غیر مطمئن عناصر کے لیے ایک موقع نہیں بلکہ یہ عوام کی بغاوت تھی۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اسے بہرحال مشترکہ جذبات میں کھلبلی سمجھتے تھے۔ شورش کا کردار اور شورش کا مواد ایک ایسی کشمکش کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اہمیت کے اعتبار سے چھاؤنیوں کی بغاوت سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ کسی انقلاب کا ورثہ نسل کے تحت الشعور میں رہتا ہے۔ اور اُن اسباب کو تلاش کرنا مشکل ہوتا ہے جو نظر سے اوجھل رہتے ہوئے کسی مقصد کے حصول کے لیے خاموشی کے ساتھ فعال رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قومی اقتدار اور خود مختاری کے کسی خیال کے نہ ہونے کے باوجود 1857 کے باغی وطن پرستی کے ان احساسات کے وسیلے سے متحد ہوئے جن کی اساس، نسل، مذہب اور کمیونٹی کے قدیم اور مانوس نظریات میں تھی۔ ورثے کی جہاں تک بات ہے تو بغاوت نے بہت سی قابل پرستش شخصیتیں پیدا کیں جو بعد کو قوم پرستانہ اساطیر کا حصہ بن گئیں۔ کلکتے کے جوار میں سب سے بڑی چھاؤنی کے قصبہ بیرک پور میں منگل پانڈے، بہار میں کور سنگھ، بیٹھور میں اپنا دربار لگانے والے پونا کے بے دخل حکمران کے بیٹے نانا صاحب، تانتیا ٹوپی اور رانی جھانسی وسطی ہند میں اور فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ۔ مولوی صاحب نے جہاد کی تلقین کرتے ہوئے اودھ کے شہروں کا دورہ کیا اور 1858 کے موسم گرما کی مہم میں کولن کیمبل کی فوجوں کو ناکوں چنے چبوادیے۔ ایک لوک ہیرو رانی بینی راؤ مادھو کو میلوں ٹھیلوں کے موقع پر گائے جانے والے دیہاتی گیتوں میں انتہائی عزت و وقار عطا کیا گیا۔ یہی کیفیت رزمیہ شخصیت رانی جھانسی اور بھوجپوریوں کے باپ کنور سنگھ کی تھی۔ کنور سنگھ کی تاریخی مارچ کے بارے میں انگریزوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

دو انتہائی مقبول لوک گیت ہیں :

خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی
توپیں چڑھیں میناروں پر، اگنی بان ہوا میں
اڑتے تھے
خوب لڑی مردانی
سپنک کھائیں دودھ ملائی
وہ گو چاول کھاتی تھی
خوب لڑی مردانی وہ تو جھانسی والی رانی تھی

(انگریزی سے ترجمہ)

اور پھر

اُو بابو کنور سنگھ
ہم نا رنگبے کپڑے اپنے اب کیسریا رنگ ماں
جب تک راج تمھارا آئے نا
ایک اُور سے آئے پھرنگی اور ایک اُور سے کنور بھیا
دونن کی توپن سے اگنی برسن لاگی
جیسے رنگ اڑے ہے ہولی ماں
گھمسان کا یدھ ہوا رَن ماں
اُو بابو کنور سنگھ
ہم نا رنگبے کپڑے اپنے اب کیسریا رنگ ماں
جب تک راج تمھارا آئے نا۔

(انگریزی سے ترجمہ)

"کیا یہ صحیح ہے؟" پردیپ نے پوچھا، "کہ ان محب وطن لوگوں کے نام سبھاش چندر بوس کی قیادت میں قائم ہونے والی آزاد ہند فوج کے عارضی گورنمنٹ کے اعلامیے (21/ اکتوبر 1943) میں شامل تھے؟

"ہاں"، عزیز نے جواب دیا، "پچھلے سال میں شمال مشرقی پنجاب میں فرخ نگر گیا تھا۔ دہلی سے فرخ نگر تک کا یہ سفر خاصا طویل اور تھکا دینے والا تھا۔ اس کی بوقلموں تاریخ اٹھارھویں صدی کی تیسری دہائی کے اوائل سے شروع ہوتی ہے جب مغل بادشاہ فرخ سیر نے ایک بلوچ سردار فوجدر کو وہاں کا گورنر بنایا تھا اور اس نے اس شہر کی بنیاد رکھی تھی۔ ماضی بہرحال عوامی شعور میں طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔ اگرچہ وہاں کے لوگ وسیع و عریض شیش محل کے سائے میں ایک پرمسرت زندگی گزار رہے ہیں مگر انھیں اس محل کے تعمیر کرنے والے کے بارے میں کچھ معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ایک عظیم قلعہ، تصویر میں بڑا اہم ہے۔ مگر وہاں کے باشندوں کو یہ پتہ چلانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ قلعے کی دیواریں اور اس کے دروازے بوسیدہ ہو ہو کر کیوں ٹوٹتے جا رہے ہیں، یا پھر 1757 سے 1764 تک فرخ نگر پر قابض رہنے والے بھرت پور کے جاٹوں کا بنوایا ہوا ہشت پہل کنواں اتنی دانستہ بے توجہی کا شکار کیوں بنا؟

پھر کچھ یادیں پسند اور ناپسند کی بنیاد پر قبول یا رد کر دی گئی ہیں، آزادی کی جدوجہد اس علاقے کے بزرگوں کی گفتگو کا پسندیدہ ترین موضوع ہے۔ ان لوگوں نے مجھے وہ کہانیاں سنائیں جو انھوں نے اپنے والدین سے سنی تھی۔ کہانیاں کہ کس طرح گورا پلٹن 1857 کی بغاوت کے چھ مہینوں میں، محض عوام کے انتقامی حملوں کے خوف سے فرخ نگر میں داخل نہیں ہوئی، کس طرح ان کے نواب احمد علی خاں نے بہادر شاہ ظفر کو پیسے اور گولے بارود کی پیش کش کی اور کس طرح بالآخر انگریزوں نے ان کو نیچا دکھایا۔ ان لوگوں نے تفصیل کے ساتھ بتایا کہ کس طرح انگریز فوجی دستے لال دروازے سے فرخ نگر میں داخل ہوئے، کس طرح نرغے میں پھنسے ہوئے نواب کو انھوں نے گرفتار کیا، دہلی تک کا سات میل کا راستہ کس طرح ان سے پیدل طے کرایا اور کس طرح بلبھ گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ اور جھجھر کے سردار کے ساتھ نواب صاحب کو بھی تہہ تیغ کیا"۔

"یہ سب تو ٹھیک ہے، مگر لکھنؤ میں کیا ہوا؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"ہاں، دلیری اور شجاعت کی کہانیاں جو کانوں میں پڑتی ہیں، آزادی کے لیے جان دینے والوں کی یادگاریں جو خود ہمارے شہر میں ہیں"۔ پردیپ نے اضافہ کیا۔

ایک سوچالیس دنوں تک چلنے والے لکھنؤ کے محاصرے کو یاد کرتے ہوئے عزیز نے تیس مئی کے بعد باغیوں کی مسلسل پیش رفت اور اس کے بعد معزول واجد علی شاہ کے ایک نوجوان بیٹے برجیس قدر کے بادشاہ ہونے کے چھے اگست کے اعلان کا حوالہ دیا۔ اس کے بعد طوفان کا رخ بدلنے لگا۔ نئے کمانڈر اِن چیف، گلاسگو کے ایک بڑھئی کے لڑکے کولن کیمپبل نے 16/ نومبر کو لکھنؤ واپس لیا اور دوسرے دن ریسیڈنسی کو آزاد کرالیا۔ کانپور میں تانتیا ٹوپی کو شکست دینے کے بعد کیمپبل اپنی فوجی کارروائی کو مکمل کرنے کے لیے لکھنؤ واپس آیا۔ 22 مارچ کو اس نے باغیوں کے آخری دفاع کی سرکوبی کردی، مارچ 1858 میں ریسیڈنسی کے کھنڈرات پر یونین جیک لہرا دیا گیا۔

مارکس نے کیمپبل کی مہم کی توانائی اور دانش مندی کو تو سراہا مگر باغیوں کے رویے کی تعریف نہیں کی۔ اس نے لکھا کہ "لال کوٹ" والوں کا نظر آنا ہی انھیں ہر جگہ خوف و ہراس میں مبتلا کردیتا تھا۔ مارکس کے اس خیال کا، دوسری دہائی میں شرر کے اس خیال سے موازنہ کیجیے کہ محاصرہ کرنے والے شہر کے بدنام عناصر اور بے اصولے سپاہیوں پر مشتمل تھے۔ ان میں ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جو جنگ کے اصولوں کی ذرا سی بھی واقفیت رکھتا ہو یا بکھری اور منتشر فوجوں کو یکجا کرکے انھیں ایک منظم حملہ آور فوج میں تبدیل کرسکتا ہو۔ عوام ملکہ حضرت محل کی کارکردگی اور ان کی خوش نیتی کی تعریف کرتے تھے مگر ان کے مشیروں کو نااہل اور ان کے سپاہیوں کو ناکارہ سمجھتے تھے۔ اپنی خودغرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے ان میں سے کسی نے کسی دوسرے کی نہ کوئی بات بنی نہ کسی کا کوئی مشورہ مانا"۔

"کیا؟" پردیپ نے دھیرے سے پوچھا، جیسے اسے یہ خیال ہوا کہ عزیز حوالے کا مطلب صحیح نہیں سمجھ رہا ہے۔

مارچ کے آخر میں مسجدوں، مکانوں اور قبرستانوں کی توڑ پھوڑ کے ساتھ ایک عذاب ٹوٹ پڑا۔ 364 افراد پر مقدمات چلے، 23 افراد کو پھانسی دی گئی، 115 کو شہر بدر کیا گیا، 13 آدمیوں کو تین سال سے کم کی سزائیں ہوئیں، 27 کو کوڑے لگائے گئے، 47 پر جرمانے ہوئے اور 139 کو رہا کر دیا گیا۔ 17/ ستمبر 1858 کے نیویارک ڈیلی ٹریبون میں اپنے ایک مضمون میں اینگلز نے انگریز فوجی دستوں کی ظالمانہ انتقامی کارروائی پر اظہار خیال کیا تھا۔ افسوس ہے کہ لکھنؤ اب پھر پرانا لکھنؤ نہیں ہونے والا تھا۔ اس تباہ حال شہر کی شام کے اس دھندلکے، ایک تہذیب کے انحطاط اور خود لکھنؤ والوں کی نظروں کے سامنے، ایک مخصوص انداز فکر اور ایک مخصوص طرز معاشرت کی موت کو بیان کرنے کے لیے ہمیں احمد علی جیسے کسی صاحب قلم کی ضرورت ہے"۔

"اور واجد علی شاہ کا انجام؟" پردیپ نے پوچھا، اس کے لہجے میں سوال بھی تھا اور بیان بھی۔

"اس کا جواب تو میں بھی دے سکتا ہوں"، جگ موہن بول پڑا، "میں نے کہیں پڑھا تھا کہ معزول بادشاہ نے 13/ مارچ 1858 کو لکھنؤ چھوڑا اور 13/ مئی کو وہ کلکتے پہنچے۔ مٹیابرج میں اپنی پنشن پر زندگی بسر کرتے ہوئے انھوں نے لاکھوں روپے ماہانہ اپنے پچیس ہزار کبوتروں کی دیکھ بھال اور اپنے حرم میں جو پہلے ہی سے بہت بڑا تھا، مزید اضافے پر خرچ کیے۔ اگر مجھے ان کی موت پر لکھنا ہوتا تو میرے پاس ان کے بارے میں لکھنے کے لیے اچھی باتیں شاید بہت نہ ہوتیں۔ وہ ایک اچھے موسیقار اور ایک اچھے شاعر تھے مگر لائق حکمراں نہیں تھے۔ شاید وہ حالات کے شکار تھے اور ایک فرسودہ، وراثت کے وارث۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ واجد علی شاہ کے شرمناک عہد کا ذکر تو بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں مگر آصف الدولہ کے بارے میں منہ سے ایک حرف نہیں نکالتے ہیں۔

جگ موہن کی آواز میں تمسخر تو نہیں تھا ہاں ایک جذباتی سنجیدگی ضرور تھی۔

عزیز کچھ تھکا تھکا سا معلوم ہوتا تھا۔ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ایک لمبی سانس لی، ایک سموسہ کھایا، پائپ کی راکھ جھاڑی اور حالی کے مسدس کے اشعار پڑھنے لگا۔

یہاں ترقی کی غایت یہی ہے
سر انجامِ ہر قوم و ملت یہی ہے

صدا سے زمانے کی عادت یہی ہے
طلسمِ جہاں کی حقیقت یہی ہے

بہت یاں ہوئے خشک چشمے اُبل کر
بہت باغ چھانٹے گئے پھول پھل کر

وہی ایک ہے جس کو دائم بقا ہے
جہاں کی وراثت اسی کی سزا ہے

سوا اس کے انجام سب کا فنا ہے
نہ کوئی رہے گا نہ کوئی رہا ہے

مسافر یہاں ہیں فقیر اور غنی سب
غلام اور آزاد ہیں رفتنی سب

عزیز نے اپنی بات ابھی ختم نہیں کی تھی۔ اس نے 1806 میں ہندستانی فوجی دستوں کی ویلور کی بغاوت کا ذکر کیا جس میں ولیم بینٹنک کو مدراس کی گورنرشپ کی قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔ عزیز نے 1808 کے موسم گرما میں کمپنی کی مدراس آرمی کے افسروں کی "سفید بغاوت" (White Mutiny) کا بھی ذکر کیا۔ ویلور مدراس سے تقریباً ساٹھ میل دور تھا۔

داڑھی صاف کرنے والے معاملے سے چوکنے ہوئے کمپنی کے ہندستانی فوجی دستے (سپاہیوں سے پریڈ میں آنے سے پہلے اپنی داڑھیاں کٹوانے، یونیفارم کی ٹوپیاں

پہننے اور پیشانی سے تلک وغیرہ چھڑانے کا حکم دیا گیا تھا) 6/ر جولائی کو انگریز افسروں اور سپاہیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، انھوں نے تقریباً سو افسروں اور سپاہیوں کو مار ڈالا۔ 1756 میں کلکتے کے سقوط کے بعد برطانوی قوت کو غالبًا یہ سب سے گہرا دھکا لگا تھا۔

1806 کے موسم گرما میں شورش کے وفور سے قبل، لوگوں نے اہم برطانوی ٹھکانوں کے قرب و جوار میں جہاں گشت مذہبی فقیروں کی تعداد میں ایک اچانک اضافہ محسوس کیا۔ ان فقیروں نے خفیہ سوسائٹیاں بنائیں اور لوگوں کو یہ بتایا کہ انگریزوں نے مکاری اور فریب سے ہندستانی علاقوں پر قبضہ کیا ہے، ہر نواب اور ہر راجہ کو معزول کردیا ہے، خوب دولت کھسوٹی ہے اور عوام کو مفلس بنا دیا ہے، اپنے قانون، اپنے رسوم و رواج اور اپنے مذہب کو جبراً مسلط کردیا ہے۔ انھوں نے عیسائیوں کی تبدیل مذہب کی کارروائیوں کا بھی حوالہ دیا۔ ان میں سے بعض نے تو سیرام پور میں بیپٹسٹ مشنریوں کی سرگرمیوں پر اور Claudius Buchanan جیسے کمپنی کے چیپلنوں کے ہندو مخالف مناظروں پر خصوصیت کے ساتھ اپنے ردّعمل کا اظہار کیا۔ ایک طرف ہندوؤں کا خیال تھا کہ حکومت گائے کا خون ملا ہوا نمک بیچ کر انھیں آلودہ کرنا چاہتی ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو یہ شبہ تھا کہ نمک میں سور کا خون ملا ہے۔ یہ خیالات اور یہ دلائل 1857 کے انقلاب کے اسباب کی واضح بازگشت لگتے تھے۔

عزیز نے بتایا کہ ہندستان میں برطانوی حکومت کے استحکام کا سبب بننے کے بعد عظیم بغاوت کس طرح اینٹی کلائمکس ثابت ہوئی۔ اسے تاریخ کی بوالعجبی کہیے کہ 1857 کے سال نے انگریزوں کے اقتدار پر تکمیل اور قطعیت کی مہر لگادی۔ یہ ٹھیک ہے کہ انیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں اپر انڈیا کے بعض حصوں میں نام نہاد وہابی، تردد کا سبب ضرور بنے رہے مگر انگریزوں کے لیے کوئی حقیقی خطرہ نہیں تھا، نہ کسی بغاوت کی سرکشی کا اور نہ ہی کسی سازش کا۔ رُڈیارڈ کپلنگ کا ہندستان، جس کا پرتو "Kim" (1901) میں نظر آتا ہے، ایک ایسی مصدقہ دنیا تھی جس میں جنگ صرف سرحد پر یا اَپر برما میں جاری تھی۔ اس نے ناول میں تخریبی تحریکوں اور بدیسی

سازشوں کو کہانی کے پلاٹ کو زیادہ اشتعال انگیز بنانے کے لیے متعارف کرلیا۔ سماج کی ماہیت کو تبدیل کرنے یا اس پر فوقیت حاصل کرنے کا، بہر حال وہاں کوئی سوال نہیں تھا۔ کسی برطانوی سول سرونٹ کے لیے ناول کا ماحول وہی تھا جس میں وہ چودہ برس کی عمر سے ہندستان چھوڑنے تک رہا تھا۔

مگر اس مصدقہ دنیا میں بھی کیا غلط ہوا تھا، سے واقف رہنا اور دوستوں اور خیرخواہوں کے مشوروں پر توجہ دینا ضروری تھا کیونکہ لاپروائی اور بددماغی انگریزوں کو پہلے ہی بہت نقصان پہنچا چکی تھی۔ اس لیے احتیاط اور ضبط کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انگریزوں کی نوجوان نسل پر خصوصاً بغاوت کی تاریخ کو پڑھنا، گرہ میں باندھنا اور یاد رکھنا فرض تھا کیونکہ بغاوت میں بے شمار سبق تھے اور لا تعداد چیتاونیاں۔ (لارڈ کرومر)

مختصراً یہ کہ پہلا منصوبہ، مفاہمت اور جبر کی ملی جلی پالیسی کے ذریعے سلطنت کے تانے بانے کو ازسرنو بنانا تھا۔ کابینہ کے ایک وزیر نے 1892 میں لکھا تھا کہ سو سال تک انگریزوں نے ہندستان میں نیم خدا کی طرح سلوک کیا تھا۔ اس اعتماد میں کوئی کمزوری، انگریزوں کے دماغ میں یا ہندستانیوں کے ذہن میں، احکامات کے لحاظ سے خطرناک تصور کی گئی۔ مگر شہزادے جو خاموش رہے تھے انھیں اس خاموشی کا اجر بھی دینا تھا اور شاہی نظام میں مدغم کرنا بھی تھا۔ نتیجتاً پٹیالہ اور جند کے مہاراجاؤں نے جنھیں زمینوں کے بڑے وسیع و عریض قطعات دیے گئے تھے، شمال مغرب کے راستے عنایت بھی کیے اور انھیں کھلا بھی رکھا۔ کپورتھلا کے راجہ کو دس ہزار روپے اور اودھ میں دو جاگیریں دی گئیں اور ساتھ ہی گیارہ توپوں کی سلامی کا حق بھی۔ بعد کو لٹن (انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں وائسرائے) نے اُن بابوؤں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں کی معاونت حاصل کرلی۔ جن کو ہم نے، دیسی اخباروں میں نیم باغیانہ مضامین لکھنا سکھایا تھا۔ زمین داروں کی راج کے دست و بازو کی حیثیت سے ہمت افزائی کی گئی۔ اودھ کے تعلقداروں کو جنھیں کچھ سال پہلے طفیلی بچولیے سمجھا جاتا تھا، ازسرنو اپنایا گیا اور ملک کے قدیم، دیسی اور عزیز

از جان ادارے کی حیثیت عطا ہوئی۔ اس عمل نے کسانوں کی روزافزوں ابتری میں مزید معاونت کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایچ ایس کننگھم کو تعلقداروں کو ملنے والی مراعات میں تخفیف کے لیے زبردست اصلاحی اقدامات کی سفارش کرنا پڑی۔

یکم نومبر 1858 کے ملکہ وکٹوریہ کے اعلامیے نے راجاؤں، سرداروں اور ہندستانی عوام سے مذہبی بُردباری اور پرانے حقوق اور رسوم و رواج کو قائم رکھنے کا وعدہ کیا۔ کمپنی کی اتھارٹی جو 1833 سے یوں بھی رو بہ زوال تھی، 1858 کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے ساتھ بالکل ختم ہوگئی۔ اب ہندستان پر لندن ایک سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے وسیلے سے حکومت کرے گا اور اس کی مدد کے لیے پندرہ اراکین کی ایک کاؤنسل ہوگی۔ گورنر جنرل کو وائسرائے بنا دیا گیا اور 1861 کے انڈین کاؤنسل ایکٹ کے تحت اس کی کاؤنسل اور ساتھ ہی بمبئی اور مدراس کی کاؤنسلوں کو صرف لیجسلیٹیو مقاصد کے لیے، غیرسرکاری اور یورپین اراکین کی تعداد میں اضافہ کرکے نسبتاً بڑا کردیا گیا۔

کرزن کو اس انتہائی پیچیدہ اور دہرے ڈھنگ کے انتظامی روپ پر جس میں دو سربراہ (Chiefs) تھے، بڑی حیرت تھی۔ لندن میں سکریٹری آف اسٹیٹ انگلستان میں سب سے اگلی کرسی پر اور سب سے اہم میز پر اور جائے واردات یعنی یہاں ہندستان میں وائسرائے۔ موخرالذکر کے بے پناہ حقوق تھے۔ اگرچہ آخری ذمہ داری وہائٹ ہال ہی پر تھی۔

افادیت پسندی (Utilitarianism) کے خیال کے زیراثر مالی انتظامی اور عدلیہ کی تبدیلیاں ہونا شروع ہوئیں۔ آئینی اخلاقیات میں افادیت پسندی کی روایت، انگلستان میں اٹھارھویں صدی سے چلی ہوئی وہ روایت ہے جس میں ہر وہ عمل اچھا سمجھا جاتا ہے جو مسرت اور خوشی کو فروغ دینے میں معاون ہو، اور یہ مسرت نہ صرف عمل کرنے والے کے لیے ہو بلکہ ہر اس شخص کے لیے ہو جو اس عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق، بینتھم اور مِل جیسے سیاسی فلسفیوں نے ایکٹ کی ازلی ماہیت یا اس کے بنانے والے کی نیت کے مقابلے میں اس کے عواقب پر توجہ مرکوز کی۔

میکالے کی تجویز کے مطابق، ایک متوسط طبقہ، ایسے لوگوں کا ایک طبقہ جو رنگ و خون میں ہندستانی اور مذاق، آرا، اخلاق اور ذہن میں انگریز ہو، پیدا کرنے کے لیے جو حکمرانوں اور ان کی لاکھوں کی تعداد میں پرجا کے مابین ترجمان کی حیثیت سے کام کرے گا، انگریزی تعلیم کو ترجیحی درجہ دیا گیا۔

"حقیقی سرکاری رویہ" بقول کپلنگ تھا، سفید چمڑی والوں کا بوجھ اٹھانا" عزیز نے اظہار خیال کیا۔ اس کا لہجہ اور آواز ایسی تھی جس میں کوئی شخص کسی ایسی چیز کے بارے میں بات کرتا ہے جو اتنی ناقابل یافت ہو کہ اس کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت نہ ہو۔

1857 کی شورش کے اور بھی بہت سے دور رس عواقب تھے۔ ایک تو یہی کہ انتظامیہ جیسے جیسے اداریاتی اور رسمی ہوتا گیا، زیادہ محتاط نگہبان حضرات انگلیسیت کے رہنماؤں پر فوقیت حاصل کرنے لگے۔ متعدد ایڈمنسٹریٹر تھے جنھوں نے شورش کے لیے عیسائی مشنریوں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور ان کے مسیحی جوش و خروش کو دبا کر مذہبی غیر جانب داری کی تلقین کی۔ مشنری کام پھر شروع ہوا مگر 1857 کے رسن و دار کے طویل سایوں میں۔ الگزنیڈر ڈف (1820) جسے اسکاٹ مبلغین کو تحریک دینے والے ایک مسیحی ہندستان کی تعمیر کے خواب کا سحر آہستہ آہستہ دھندلا پڑا۔ مگر پنجاب میں ایک طرف مشن اور دوسری طرف آریہ ساجی اور احمدی لوگوں کے درمیان تلخ و طویل مناظرے ختم نہ ہوئے۔ بہرحال جب مشنریوں کی طرف سے خطرات کم ہوئے تو آریہ ساجیوں نے مسلم مناظرین سے حساب بے باق کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔

1857 کی شورش کا نتیجہ فوج میں بڑی بڑی انتظامی تبدیلیوں کی شکل میں نکلا۔ توپ خانے کی ساری ذمہ داری برطانوی فوجیوں کے سپرد کی گئی۔ انگریز اور ہندستانی فوجوں کے تناسب کو 1:5 کے بجائے 1:2 کیا گیا۔ ایک برطانوی اور دو ہندستانی بٹالینوں کو یکجا کیا گیا تاکہ کوئی بھی قابل لحاظ چوکی انگریز سپاہیوں کے بغیر نہ رہ جائے۔ یوپی کے برہمن عناصر کو تقریباً بالکل خارج کردیا گیا کیونکہ ان لوگوں نے اپنے آقاؤں کو اس وقت چھوڑا تھا جب ان کی مدد کی شدید ضرورت تھی۔

عسکری نسلوں کی سرکاری پالیسی کی اہمیت بڑھی۔ اس کی وجہ سے فوج کے ڈھانچے میں بہت ادل بدل کی ضرورت ہوئی اور اس میں بڑی اہم تبدیلیاں ہوئیں۔ فوج میں گورکھے، ڈوگرے، پٹھان، جاٹ، راجپوت، سکھ اور پنجابی زیادہ سے زیادہ بھرتی کیے گئے۔ ڈوگروں کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ابھی پرانی آریہ نسل کے تعلق کو قائم رکھے ہوئے ہیں، واضح طور پر یورپی ظاہر رکھنے والے چھوٹے چھوٹے بھورے بال اور نیلی آنکھوں والے یہ آفریدی بھی سکندر اعظم کے یونانی سپاہیوں کی جھلک رکھتے تھے۔ جاٹ عیسائی عہد کی ابتدا کے فوراً بعد ہندستان آنے والے انڈو- سیتھینس (Indo-Scythians) سمجھے جاتے تھے۔ وہ اگرچہ عقل میں کم مشہور تھے مگر انھوں نے رنجیت سنگھ سے ہونے والی دو لڑائیوں میں اپنی جنگی مہارتوں کا بہت ثبوت دیا تھا۔ رنجیت سنگھ کی رہنمائی میں سکھ ریاست کی ابتدا اور اس کی فوج کی شجاعت و دلیری نے انگریزوں کو سکھوں کو بھی عسکری نسلوں سے تعلق رکھنے والا سمجھنے پر مجبور کردیا۔ بنگال آرمی کی اصل تعمیر نو 1860 کے اوائل میں مکمل ہوگئی تھی اور ریکروٹوں کا جو توازن و تناسب اس وقت تک قائم کیا جاسکا تھا وہ راج کے خاتمے تک کسی حد تک قائم رہا یعنی سکھ، پنجابی مسلمان، راجپوت اور ہندستان اور سرحد کے مسلمان۔

عزیز نے اپنے نوٹس پر سے نگاہیں اٹھائیں۔ پردیپ اس کے بولے ہوئے ہر ہر حرف کو لکھنے میں مصروف تھا اور جگ موہن اپنے قلم کے کنارے کو چباتے ہوئے اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

''انیسویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیاں'' عزیز نے وضاحت کی، ''اکثر جاندار متحرک اور پُرامید قرار دی جاتی ہیں۔ تمام دوسری چیزوں کے علاوہ ایک طرف ریلوں نے ہندستان کے شہروں کو بڑی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملادیا، دوسری طرف تجارتی خوشحالی نے ان مایوس کن خدشات کو دور کیا کہ ہندستان کی مالیات بغاوت کے قرضوں کے بوجھ سے مستقل طور پر بے دست و پا ہوچکی ہے۔ انگریزوں نے اس ملک میں تقریباً دو سو ستر پاؤنڈ لگائے تھے یہ رقم ان کی سمندر پار کل سرمایہ کاری کے پانچویں حصے سے برائے نام ہی کم ہوگی۔ ہندستان ایک اہم اور

قابلِ قدر برآمد کرنے والا ملک بھی تھا اور درآمد کرنے والا بھی، اور برطانوی برآمدات کا تقریباً انیس فیصدی مال درآمد کرتا تھا۔ ایشیا کے دوسرے حصوں سے ہونے والی زیادہ تر علاقائی تجارت انگریزوں کے ہاتھ آگئی کیونکہ ہندستان علاقائی نظامِ تبادلہ میں کلیدی حیثیت کا مالک تھا۔

"یقیناً جاندار اور متحرک مگر ہمارے نہیں، برطانوی نقطہ نظر سے" پردیپ نے کسی قدر جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "ہماری قیمت پر، اپنے نجی کلبوں میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے ان پکے صاحب لوگوں سے ہمیں کیا ملا؟ یوروپین کلب، میں نے جارج آرویل کے ناول "برمیز ڈیز"(Burmese Days) (1934) میں پڑھا تھا، روحانی گہوارہ اور برطانوی اقتدار کی انتہائی منزل تھی۔ نِروان کہ جس کے دکھ میں دیسی افسران اور لکھ پتی بے کار دبلے ہورہے تھے۔ میں سنتا رہتا ہوں کہ کلکتے میں کلب صرف یوروپین کمیونٹی بلکہ اس میں بھی کچھ مخصوص لوگوں کے لیے مختص تھے۔ میں نے "تہذیب و اخلاق کی پابند" میم صاحبوں کے قصے بھی سنے ہیں جو جاہ پسند، تحکم پسند اور نسلی طور پر متعصب تھیں اور برطانوی کمیونٹی کی اُس خود شعوری علاحدگی کی کہانیاں بھی سنی ہیں جو برائے نام تبدیلی کے ساتھ 1857 کے بعد کے پچاس برسوں تک جاری رہیں۔ میں یہ بھی سنتا ہوں کہ انگریزوں میں نسلی امتیاز 19 ویں صدی میں مزید واضح اور مزید جارح ہوا اور 1899 اور 1905 کے درمیان کرزن کے وائسرائے ہونے کے زمانے میں اپنے عروج پر پہنچا۔ میں یہ بھی سنتا ہوں کہ ہندستان میں پبلک سروسز سے متعلق رائل کمیشن (14-1912) آئی سی ایس افسروں کی زوال آمادہ صلاحیتوں کی شکایتوں سے پُر تھا۔ ان شکایتوں میں تہذیب کے فقدان اور ہندستانیوں کے مفادات کی طرف سے بے توجہی کی شکایتیں بھی تھیں۔

"ہاں ہاں، یقیناً"، عزیز نے کسی قدر پریشان ہوتے ہوئے کہا، "اس وقت کے برطانوی طبقاتی رویے، نوآبادیوں میں منتقل ہوئے اور فروغ پائے۔ نسل، حکومت و اقتدار کا سب سے بڑا جواز تھی۔ امپیریلزم کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ اس نے مقامی تمدن اور تہذیبوں کو بدنام کیا۔

"میں نے پڑھا ہے کہ Lansdowne (1888-94)، Elgin (1894-98) اور کرزن (1898-1905) کے انتظامیہ نے" پردیپ نے بات جاری رکھی۔ "عدلیہ اور پبلک سروسیز میں ہندستانیوں کی شمولیت کے کانگریسی مطالبے کو ماننے میں کس کس طرح مزاحمت کی۔ کرزن، خصوصاً یہ سمجھتا تھا کہ ہندستانیوں کی بھرتی انتظامیہ کے لیے سب سے بڑی تباہی تھی"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو"، عزیز نے کہا، "غلام احمد حسین نے جن کا میں نے پہلے ذکر کیا تھا، انگریزوں کے سماجی اختصاص کا حوالہ دیا ہے۔ انھوں نے Lansdowne اور Elgin کے زمانے سے بہت پہلے شکایت کی تھی کہ انگریزوں نے اعلیٰ ترین سے لے کر کمترین تک کے ہندستانیوں کی طرف کبھی کوئی توجہ نہیں کی اور یہ کہ وہ اپنی اس نفرت کو یہاں تک لے گئے کہ وہ کہیں بھی کسی بھی آسامی پر ان کا تقرر نہیں کرتے تھے۔ دیسیوں کے لیے جس تنفر اور جس بغض و عناد کا کھلم کھلا اظہار کیا وہ اتنا شدید تھا کہ حاکم اور محکوم کے درمیان کوئی پیار و محبت یا کوئی دوستی و مفاہمت ...... جگہ نہیں پاسکتی تھی"۔

1858 کے بعد 1895 تک دو سو میل سے بڑھ کر 19555 میل لوہے کی پٹریوں کا جال، جو سارے برصغیر میں انتہائی تیزی سے پھیلا، اور آب پاشی کے وسیع و عریض نظام کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جگ موہن نے پوچھا، "پچھلے روز عزیز بھائی نے، مارکس کا حوالہ دیتے ہوئے کچھ ایسی بات نہیں کی تھی کہ جدید صنعتوں کا پیش خیمہ ریلوے نظام، ذات کے نظام کو بھی ختم کردے گا جو ہندستان کی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے؟"

عزیز نے وضاحت کی کہ Pax Brittanica کے قیام نے ذاتوں کو "انگریزوں سے پہلے کے سیاسی نظام کی خلقی علاقائی پابندیوں سے آزاد کردیا۔ نئے اقتصادی نظام نے، چھوٹی ذاتوں کے لیے، روایتی اقتصادی نظام کے تحت اپنے اعلیٰ طبقے کے مربّیوں کی دست نگری سے چھٹکارے کے امکانات روشن کردیے۔

عزیز نے جو کچھ کہا اس کی بنیاد اٹاوہ کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے اس کی گفتگو تھی۔ مجسٹریٹ، مدراس کیڈر سے آیا تھا اور اس کا تعلق ناڈر کمیونٹی سے تھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں اونچی ذات کے ہندو، ناڈر کمیونٹی کو تمام ذاتوں میں کمترین اور سب سے زیادہ نجس اور ملچھ سمجھتے تھے۔ مگر یہ صورت حال جلدی ہی بدل گئی اور یہ لوگ جنوب میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے کامیاب ترین کمیونٹی ہوگئے۔ سیاسی طور پر انھوں نے انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں جسٹس پارٹی کی حمایت کی۔ بعدکو، ان کی حمایت کا رخ کانگریس کی طرف ہوگیا خصوصاً جب 1937 میں مدراس کے وزیراعلیٰ راج گوپال اچاری نے مندروں کے دروازے تمام ذاتوں کے افراد کے لیے کھلوا دیے۔ ناڈر لوگوں کی آبادی کا بڑا حصہ کنیاکماری اور ضلع Tinnevelly کے جنوبی حصوں میں ہے۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ کانگریس لیڈر کے کامراج بھی ناڈر ہی ہیں؟" پردیپ نے خاصے اعتماد کے ساتھ پوچھا، "اس لیے مارکسسٹ لفاظی کی رو میں بہیے مت۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ امپیریلزم ہمارے عہد کی سب سے زیادہ ولولہ انگیز خرافات (myth) ہے۔ یار اپنے کارل مارکس کو بھولو مت جس نے ان پہلوؤں کی فہرست مرتب کردی تھی جن کے لیے برطانوی عہد روح افزا ثابت ہوگا۔ پہلو یہ تھے۔

1. ہندستان کی سیاسی یکجہتی زیادہ مربوط و مستحکم ہوگی، اور اس میں وہ وسعت ہوگی جو مغلوں کے عہد میں کبھی نہیں ہوئی۔ برقی ٹیلی گراف کی وجہ سے اس میں مزید استقامت اور استحکام لازمی ہے۔
2. دیسی فوج، انگریز ڈرل سارجنٹ سے تربیت حاصل کرے گی اور منظم ہوگی۔
3. آزاد صحافت ایشیا میں پہلی بار متعارف ہوگی۔

4. زمین داری اور رعیت داری نظاموں نے زمین کی نجی ملکیت کے انتہائی ناگوار مگر ایشیاٹک سوسائٹی کی بڑی حاجت کے مطابق بڑے واضح نظام متعارف کرائے۔

5. حکومت کی ضرورتوں کے مطابق اور یورپین سائنس سے مرصع ایک تعلیم یافتہ ہندستانی طبقہ۔

6. بھاپ کے ذریعے چلنے والے ذرائع ترسیل و ابلاغ کے ذریعے یورپ سے سریع اور باقاعدہ رابطہ۔

"خرافات مت بکو"، پردیپ نے مراقبے سے نکلتے ہوئے کہا، "برطانوی استعمار کے دفاع کے لیے جواز کی تلاش کیوں؟ آخر کیوں؟ میرے والدین بات کرتے ہیں کہ انگریزوں کے زمانے میں کتنا اچھا تھا۔ گھی، چاول، شکر ہر چیز سستی۔ تکلف برطرف، اس غلامانہ ذہنیت سے مجھے گھِن آتی ہے۔ اتنا سب پڑھنے کے بعد مجھے یقینی طور پر یہ معلوم ہوگیا ہے کہ نہروں کی تعمیر نے سماج کے مفلس طبقے کو مزید معذور و بے سہارا کیا اور انھیں ساہوکاروں، زمینداروں اور حکومت کا مزید دست نگر بنادیا۔ پانی کے نکاس کی کسی باقاعدہ سہولت کی عدم موجودگی کی وجہ سے شہروں کی تعمیر بہت سے علاقوں میں وسیع پیمانے پر پانی کے جماؤ اور شوریت کا سبب بنی اور نتیجتاً لاکھوں ایکڑ زمین بنجر ریگستانوں میں بدل گئی"۔

"میرا خیال ہے"، عزیز نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "کہ ریلوں نے یقیناً زرعی پیداوار جدید صنعت اور کان کنی میں معتدبہ اضافہ کیا۔ شہری آبادی کی ازسرنو تقسیم کو بہتر کیا اور آبادی کے کچھ حصے کے لیے آمدنی کے ذرائع وسیع کیے۔ مگر ان تبدیلیوں نے ہماری اقتصادیات کے بنیادی ڈھانچے کو نہیں بدلا جس کی حیثیت، عالمی منڈی کے حاشیے اور خام مال کے فراہم کرنے والے کی تھی۔ ریلویز نے، اصلی بات تو یہ ہے کہ، دیسی دست کاری کی تباہی کی رفتار کو بڑھادیا۔ گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ دستکاریوں اور گھریلو مصنوعات پیدا کرنے والے تمام گاؤں اپنے قرب و جوار کے زرعی گاؤں میں اپنی روایتی منڈیاں کھوچکے ہیں جس کی وجہ سے دستکاروں کو روزی روٹی کے

لیے اپنے چرخوں اور اپنے کرگھوں کو چھوڑ کر زمین (کھیتوں) کی طرف لوٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس صورت حال کے سبب کا ایک حصہ تو وہ داخلی ٹکس تھے جو ہماری اشیا پر عائد کیے گئے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ امتیازی قیمتیں تھیں جو ہمارے بنکروں کو دی جاتی تھیں۔ نتیجے کے طور پر ریلویز اگر ایک طرف مغربی یورپ اور امریکا میں ہونے والے صنعتی انقلابوں کی مددگار ثابت ہوئیں تو دوسری طرف ہمارے ملک کو مکمل طور پر نوآبادیاتی بنانے میں معاون رہیں۔ افریقہ میں، انگریزوں نے ایک دوہری ہدایت کی بات کی جس کی رو سے بنیادی سہولتوں (infrastructure) یعنی تعلیم اور پیداوار کی شکل میں دونوں فریقوں کو فائدہ پہنچنے والا تھا۔ بہرحال اس ترقی کے پیچھے کارفرما بورژوازی جو یورپ میں تھی، وہ سارا نفع اپنے گھر لے گئی اور چوطرفہ مقامی ترقیوں میں ایک طویل عرصے تک کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ "انڈر ڈیولپمنٹ" کی اصطلاح اسی صورت حال سے وجود میں آئی۔ اس لیے بحث کا مرکز یہ ہے کہ آیا کلونیل حکمرانوں نے نوآبادیوں کو اس ڈھانچے میں مقید کر دیا یا ان کی ترقیاتی سرگرمیوں میں حصہ لیا"۔

عزیز نے اپنی بات ختم کی تو پردیپ نے مڑ کر جگ موہن سے کسی قدر زور سے پوچھا، "1865 سے 1900 کے درمیان طویل اور بھیانک قحطوں کے اس سلسلے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں سنا جس میں ہزاروں لاکھوں افراد ختم ہو گئے تھے؟"

"میں نے سنا ہے"، جگ موہن نے دبی دبی سی آواز میں، جواب دیا۔

عزیز نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ مورخ این. کے. سنہا نے کہا تھا کہ انگریز حکومت ایک قحط سے شروع ہوئی تھی اور ختم بھی ایک عظیم قحط پر ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ 1943 میں پڑنے والا قحط اس رجحان کا منطقی نتیجہ تھا جو 1771 میں شروع ہوا تھا۔ میرا یہ ایمان ہے کہ 1800 سے 1825 کے درمیان پڑنے والے قحطوں سے موازنہ کیجیے تو 1875 اور 1900 کے مابین پڑنے والے بائیس قحط، برطانوی اقتدار کی پیداوار تھے۔ ہندی شاعر بدری نرائن پریم گھن نے 1890 کی دہائی میں پڑنے والے قحطوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

بھاگو رے بھاگو بھینکر اکال پڑا ہے
بھارت پر تباہی کے کالے بادل گھر آئے ہیں
کاروبار ٹھپ، دھندے سب بند

(انگریزی سے ترجمہ)

"برطانیہ کی قحط پالیسی کی ایک تلخ و ترش تنقید میں، متعدد لکھنے والے، بشمول ولیم ڈگبی، کہتے ہیں کہ خود برطانیہ نے 1890 کی دہائی کے قحطوں کی شدت میں اچھی خاصی مدد کی اور ایسا کرنے میں انھوں نے ایسے علاقوں کو آنے والی دہائیوں تک کے لیے معاشی جمود بلکہ سماجی انتشار کا شکار بننے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر بھی ہمارے کچھ مورخین قحطوں اور اکالوں کو محض عذاب الٰہی قرار دیتے ہیں اور زمینوں کے بے پناہ کرایوں، ناقابل برداشت ٹیکسوں اور سود کی آسمان چھوتی ہوئی شرحوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔ 1883 کے فیمین کوڈ میں دی ہوئی گنجائشوں یا 1898 کمیشن کی سفارشوں جیسے قحط تدار کی اقدامات کے سر اتنے سہرے باندھے جاتے ہیں، جتنے کے یہ مستحق نہیں ہیں۔ اسی لیے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کی چھٹی جلد ہمیں بتاتی ہے کہ تدار کی اقدامات کی نگرانی خود کرزن نے بڑی توجہ اور دلچسپی سے کی اور جولائی کی شدید گرمی میں گجرات کے انتہائی متاثر اضلاع کا بہ نفس نفیس دورہ کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ 1880 میں بھوک سے ایک بھی موت واقع نہیں ہوئی۔

"جہاں تک بعض علاقوں کا ذکر ہے ہم جانتے ہیں کہ بدیسی تسلط نے کس طرح وسطی ہندستان کے سنتھالوں، مُنڈاؤں اور اوراؤں (Mundas and Oraons) کے قبائلی سماجی نظام کو آہستہ آہستہ مگر مسلسل منتشر کیا۔

"کیا تمھیں معلوم ہے"، پردیپ ایک بار پھر کسی قدر جارحانہ موڈ میں جگ موہن سے مخاطب ہوا، "کہ عظیم بغاوت پر آنے والی لاگت جو چالیس لاکھ روپے (ایک عام سال میں حاصل ہونے والے محصول کے برابر) تھی ہم سے وصول کی گئی اور اس کی ادائیگی چار برسوں میں اضافہ شدہ محصولی وسائل کے ذریعے کی گئی؟"

"یہ صحیح ہے"، عزیز نے کہا، "دادا بھائی نوروجی اور رمیش چندر دت نے بتایا ہے کہ ہندستان نے برطانیہ کو براہِ راست اور مشتبہ طریقوں سے تباہ کن حد تک بھاری سالانہ ادائیگیاں کیں۔ 1870 تک ان ادائیگیوں کا تخمینہ ستائیس ملین پاؤنڈ کے بقدر تھا، ہندستان سے سب ملا کر تقریباً 500 سین پاؤنڈ کھسوٹنے کے لیے برطانیہ نے اپنی سیاسی قوت کو استعمال کیا۔ 1882 میں یہ کھسوٹ 1355 ملین روپے (1946-47 کی قیمتوں کی شرح پر) تھی جو سالانہ قومی آمدنی کا تقریباً چار فیصدی سے زیادہ کا حصہ تھا۔ خاصی ہوش رُبا رقم ہے؛ اگر تم اجازت دو تو میں اس بات کی طرف بھی اشارہ کردوں کہ پرانے کانگریسی لیڈروں نے لاصنعتیت (De-industrialisation) اور ہندستان کی برآمداتی اشیا کی فہرست میں دستکاروں کی بنائی ہوئی اشیا کے انحطاط آمادہ تناسب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

روشن خیالی کی تبلیغ اور اصلاحات وغیرہ کی بات کرتے ہوئے 2/ فروری 1883 کے لارڈ رِپن کے اِلبرٹ بل پر ہونے والے شور و غوغا کو یاد کیجیے جس نے ہندستانی ججوں کو یوروپین انگریز رعایا پر کرمنل الزامات کے تحت مقدمہ چلانے کی اجازت دی تھی۔ 'سفید بغاوت' (W..ite Mutiny) کی مالی امداد کلکتے کے ان سرمایہ داروں نے کی تھی جو plantations اور چائے کے باغات کے مالک تھے اور اپنے مقامی ایجنٹوں کے اختیارات اور وقار میں کسی طرح کی بھی تخفیف سے خوفزدہ تھے۔ شورش و بے چینی کچھ ایسی تھی کہ 'پنچ' نے ایک کارٹون چھاپا جس میں ایک ہاتھی دکھایا گیا تھا جس کا مہاوت رِپن تھا اور ہودے میں بہت سے یوروپین تھے جو رِپن پر حملہ کررہے تھے۔ اور کارٹون کا عنوان تھا "دی اینگلو انڈین میوٹنی" (ہاتھی کے لیے ایک تحقیر آمیز مثال)۔

اِلبرٹ بل احتجاج کے، تعلیم یافتہ ہندستان کے جواب کے طور پر دسمبر 1883 میں سریندر ناتھ بنرجی نے پہلی انڈین نیشنل کانفرنس کی۔ اس کے بعد مئی 1884 میں مدراس مہاجن سبھا اور جنوری 1885 میں بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن وجود میں آئی۔ مدراس مہاجن سبھا نے مندروں سے متعلق اصلاحات، زمینداری مقدمات،

انکم ٹیکس، اکسائز ڈیوٹی میں اضافے اور زمین کے لگان کے تنازعات کے ازسرنو بندوبست سے متعلق تحریکیں چلائیں"۔

"پردیپ، تم غالباً ان مسائل سے خاصی واقفیت رکھتے ہو۔ آج کل پام دت کو پڑھ رہے ہو نا؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"ہاں پڑھ رہا ہوں"، ویسے ہی دھیمے لہجے میں پردیپ نے جواب دیا۔

جگ موہن کسی قدر شرمندگی کے ساتھ مسکرایا۔

"مطمئن رہیے۔ میں دوسری کتابیں بھی پڑھتا ہوں، میں نے ابھی ابھی ڈینس کِن کیڈ Kincaid کی کتاب 'برٹش سوشل لائف اِن انڈیا' ختم کی ہے۔ اس نے یوپی اور پنجاب کے گورنر میلکم ہیلی سے متعلق دو واقعات بیان کیے ہیں جن سے تمھیں آئی سی ایس کے بارے میں کچھ اندازہ ہوجائے گا۔ جب ہیلی دہلی کا چیف کمشنر تھا تو اس نے اپنے کاموں کو اِن ہدایات کے ساتھ ایک دوسرے شخص کے سپرد کیا۔ "کل تمھارا دن ایک تکلیف دہ دن ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ تمھیں کسی فساد کا سامنا کرنا ہو، مگر میں نے تمام متعلقہ انتظامات و اقدامات پر بات کرلی ہے، اور میں نے انھیں منظوری دے دی ہے۔ بہرحال ایک شرمندگی سے تم بچ جاؤ گے۔ میں کل مچھلی کے شکار پر جارہا ہوں"۔

پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے ہی ہیلی صاحب ایک رات کھانا کھانے کے بعد موسلا دھار بارش میں اپنے کتّے کے ساتھ چہل قدمی کے لیے گئے۔ وہاں ان کی نظر نعرے لگاتے ہوئے ایک جلوس پر پڑی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ایسے واقعات سے پولیس کیسے نپٹتی ہے، وہ جلوس میں شامل ہوگئے۔ مگر ہوا کچھ نہیں، دوسرے دِن انھوں نے جلوس سے متعلق پولیس رپورٹ کی ایک کاپی طلب کی، اور انتہائی مسرت کے ساتھ انھوں نے پڑھا کہ ایک نامعقول یورپین بھی اپنے کتّے کے ساتھ جلوس میں شامل ہوا تھا۔

دلچسپ واقعات ایک طرف، ہم برطانوی شاہی اقتدار کے نصف النہار کی

بات نہیں کر رہے ہیں۔ شاہی عروج کی یہ باتیں کیا ہیں؟ جگ موہن نے آہستہ سے سوال کیا۔

"آرنلڈ ٹوائن بی"، عزیز نے کہنا شروع کیا، "نے ایک پھول کا رس چوسنے کے بعد دوسرے پھول پر جا بیٹھنے کے تتلی کے اشتیاق کی بات کی تھی۔ جگ موہن اور یہی بات تم پر بھی صادق آتی ہے۔ "مہمل باتیں نہ کیجیے عزیز بھائی"، جگ موہن نے کنکھیوں سے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔

عزیز نے ایک معصوم سا قہقہہ لگایا۔

جگ موہن کے سوال کا جواب دینا آسان نہیں تھا۔ ایک شخص جس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں برطانوی دین کی توصیف کے پل باندھ دیے وہ تھے سید احمد خاں۔ ان کے اس انداز اور ان کی اس رائے سے بہت سے لوگوں نے اتفاق کیا۔ مسلمانوں کی نئی نسل پیدا ہوئی اور بڑی ہوئی، اس کے لیے بدیسی راج انھیں چاہے اچھا لگے یا بُرا، زندگی کی ایک ناقابلِ ترمیم حقیقت تھا۔ پنجاب میں برطانوی اقتدار کا مطلب ایک ملحد حکومت سے دوسری ملحد حکومت میں تبدیلی تھا۔ کچھ عرصے تک، جب سرکاری زبان کی حیثیت سے فارسی کے استعمال جیسے مغلوں کے انتظامی نمونوں کو انگریز دوام بخش رہے تھے۔ بڑے عہدوں پر چند انگریزوں کی موجودگی ان کے روزانہ کاموں میں کچھ بہت دخل انداز نہیں ہوئی۔ عدلیہ اور محصول کے کاموں میں، سوائے اونچے عہدوں کے اُنیسویں صدی کے وسط تک بنگال میں مسلمانوں نے اپنی حقیقت برقرار رکھی اور یوپی میں ایک نسل بعد تک۔ یہاں قصبات میں مسلمان شرفاء انیسویں صدی کے اوائل تک، برطانوی حکومت میں نچلے عہدوں پر جمے رہے۔ مسلمان زمین دار اپنے اثر و رسوخ اور اپنی رعیت کے ساتھ اس صدی تک موجود رہے۔ غالبؔ نے جو مغربی خیالات و نظریات کی نئی ہوا کو محسوس کر رہے تھے صبح کی آمد آمد کا اعلان کیا اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کیا۔

غالبؔ کے دوست اور ان کی سوانح عمری لکھنے والے حالیؔ برطانوی راج کی نعمتوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں :

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں
ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں
کہ راجہ سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا
نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

کھلی ہیں سفر اور تجارت کی راہیں
نہیں بند صنعت و حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں
تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں
نہ گھر میں غنیم اور دشمن کا کھٹکا
نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

کرو قدر اس امن و آزادگی کی
کہ ہے صاف ہر سمت راہ ترقی
ہر ایک راہ رَو کا زمانہ ہے ساتھی
یہ ہرسو سے آواز پیہم ہے آتی
کہ دشمن کا کھٹکا نہ رہزن کا ڈر ہے
نکل جاؤ رستہ ابھی بے خطر ہے

شمالی ہندستان کے کچھ حصوں میں مسلمان گروپوں نے نئے حکمرانوں کے ساتھ ایک قابل عمل طریقہ کار اپنایا اور آرزوؤں اور تمناؤں اور روحانی تخلیقیت کی نئی راہیں نکالیں۔ انھوں نے موجود اداروں سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اور انتظامی اور نوکرشاہی ڈھانچے سے فائدے اٹھائے۔ ندوۃ العلماء جو 1894 میں قائم ہوا، ایک متوسط راہ کی تلاش کی خواہش کی علامت تھا۔ اس کے مؤسس شبلی نعمانی نے علم

کے روایتی نظام اور مغربی طور طریقوں کے امتزاج کے لیے جگہ کے طور پر لکھنؤ کا انتخاب کیا۔ فرنگی محل نے بھی جو لکھنؤ میں تھا اور اسلامی تعلیمات کا ایک موقر و معتبر مرکز تھا، مفاہمت کے اسی جذبے اور اسی خواہش کی عکاسی کی۔

مگر پھر بھی، کسی غالبؔ یا کسی حالیؔ کی اس خوش امیدی سے ہر شخص نے اتفاق نہیں کیا۔ صدی کے اختتام تک بہت سے سرپھرے تھے جنھیں قابو میں لانا تھا۔ اردو کے شاعر اکبر الٰہ آبادی نے جو عظیم بغاوت سے گیارہ سال قبل پیدا ہوئے تھے برطانوی امپریلزم اور سرسید کی مصالحت و مفاہمت کی سیاست کو ردّ کیا۔

مشرقی تو سرِ دشمن کو کچل دیتے ہیں
مغربی اس کی طبیعت کو بدل دیتے ہیں

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولہ ہٹا تو رندہ ہے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں
وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے
وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

سرسید اور ان کے علی گڑھ کالج کے بارے میں اکبر الٰہ آبادی کا کہنا تھا۔

کیا جانیے سید تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک

جوابِ حضرت سید کا خوب ہے اکبرؔ
ہم ان کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں
ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر
خدا کو اور نہ طریقِ دعا کو مانتے ہیں

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں
وہ صرف قوت فرمانروا کو مانتے ہیں

اپنے سامعین اور اپنے قارئین کو اکبر الہٰ آبادی کے خوش کرنے سے بہت پہلے ہی نوآبادی مخالف جذبات اپنے آپ کو احیاء پسند رجحانات سے ربط دے چکے تھے۔ فرائضیوں نے جن کی قیادت حاجی شریعت اللہ کررہے تھے جنھوں نے 1818 میں حج سے واپسی کے بعد اپنی تحریک شروع کی تھی۔ اعلان کیا کہ جب تک انگریز بنگال پر حکمران ہیں مسجدوں میں نماز نہیں ہوگی۔ حاجی صاحب کے بیٹے دُودُو میاں نے جو مسلمان کاشتکاروں کی نمائندگی کرتے تھے صرف خدا کی حکمرانی کو تسلیم کرتے ہوئے کرایہ اور لگان ادا کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے فرید پور کے ہندو زمینداروں کے دلوں میں رات کے وقت طاقت ور گھوشوں کے خلاف آٹھ سو فرائضی کسانوں کی ایک مہم چلا کر خوف و دہشت پیدا کردی۔ مغربی بنگال میں چوبیس پرگنہ میں، ٹیٹو میر نے، جن کی پیدائش 1782 میں ہوئی تھی، ایک خالص اسلام کے نام پر تحریک چلائی۔ ان کی زبان اور ان کے محاورے سید احمد بریلوی اور شریعت اللہ کی ہی طرح تھے۔

دہلی کے ممتاز عالم شاہ عبدالعزیز نے ہندستان کے ایک دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ ان کا خیال تھا کہ نماز عیدین اور جمعے کی نماز اجتماعی طور پر ادا نہیں کی جاسکتی ہیں اور یہ کہ انگریزی پڑھنا، انگریز کے یہاں کلرک، ملازم یا سپاہی کی طرح نوکری کرنا بھی جائز نہیں ہے۔ ان کے بیانات نے سید احمد بریلوی کی انگریز مخالف تحریک کو پنجاب کے غصب کے بعد بھی بیس سال تک زندہ رکھا اور انیسویں صدی کے دوسرے انگریزی راج مخالف معرکوں کو حق بجانب بھی قرار دیا۔ یوپی میں بریلی کے مولوی سید قطب شاہ صاحب نے ہندوؤں اور مسلمانوں سے ایک اپیل کی جس میں ان سے اپنے اپنے دھرم اور ایمان کو بچانے کی تلقین کی گئی تھی۔

"میں ان سے پوچھوں گا"، انھوں نے کہا، "اپنی زندگیوں اور اپنے ایمان کو بچانے کے لیے تم نے کیا طریقہ سوچا ہے؟ اگر

> میرے اور تمھارے خیالات یکساں ہیں تو ہم انھیں (انگریزوں کو) بہت تھوڑی تکلیف اٹھاکر یکسر تباہ و برباد کرسکتے ہیں۔ اور اگر ہم ایسا کرتے ہیں تو ہم اپنے مذاہب اور اپنے ملک کو بچاتے ہیں۔ اور چونکہ یہ خیالات محض تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب اور ان کی زندگیوں کے تحفظ کی خواہش کے تحت پروان چڑھے ہیں اور ان پر غور و خوض ہوا ہے اس لیے آپ کی اطلاع کے لیے اس خط کو طبع کرلیا جارہا ہے۔

ایسے مقامی مذہبی رہنما کی طرف سے نظریاتی تحریک نے دہلی کے شمال میں تھانہ بھون کے قریب مذہبی مسلمانوں کو 1857 کی شورش میں شامل ہونے پر اکسادیا۔ ان ہی میں سے کچھ لوگوں نے دیوبند میں ایک دینی مدرسے کی بنیاد ڈالی۔

ایسا کیوں ہے کہ ہماری جنگ آزادی کی تاریخ کی کتابوں میں مسلمان افراد اور مسلمان جماعتوں کا تذکرہ نہیں ملتا ہے؟ پرتھوی راج چوہان جنگ آزادی کا ایک سپاہی تھا، رانا صاحب جنگ آزادی کا ایک سپاہی تھا، ان کی ہی طرح شیواجی تھا۔ اس میں حب الوطنی کی چنگاری بڑی خالص اور بڑی روشن تھی۔ مگر جنگِ آزادی کے مسلمان جیالوں کا ذکر؟

عزیز نے پردیپ پر ایک تحیّر آمیز نظر ڈالی، کچھ کسمسایا، راست جواب سے اجتناب کیا اور ایک دینی پیشوا کی سی سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں ہاں، کچھ مسلمانوں نے اس وقت تک انگریزوں سے مذاکرات کی کوشش کی جب تک کہ انھوں نے ان کی مذہبی آزادی میں دخل اندازی نہیں کی۔ بہت سے علما نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہندستان دارالامن تھا، کیونکہ انگریزوں نے، وراثت، توالی و جانشینی، تحائف، اوقاف، شادی بیاہ، ولدیت، سرپرستی اور نان نفقے سے متعلق اسلامی پرسنل لاء کو تسلیم کیا تھا۔ اس بات کا ثبوت ہمارے شہر میں شیعہ مجتہد

کے فتاویٰ سے بھی ملتا ہے۔ جب کمپنی کی ملازمتوں کو قبول کرنے کے بارے میں سوال کیا گیا تو عالم سید دلدار علی نے کسی قدر جھجکتے ہوئے رضامندی یوں ظاہر کی کہ اگر ملازمت ممنوعہ کاموں سے متعلق نہیں ہے تو قبول کی جاسکتی ہے۔

ایک دوسری سطح پر، مسلم جماعتوں نے کلونیل حکومت کو کام کرنے پر مجبور کیا۔ دیہی پنجاب کے بہت سے سجادہ نشینوں نے برطانوی انتظامیہ میں انھیں شریک کیے جانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ بیسویں صدی کے اوائل تک وہ دیہی بچولیوں کے اس طبقے کا ایک جزو لاینفک تھے جن پر برطانوی حکومت کی بنیاد تھی۔ سندھ میں، سیاسی نظام ان زمیندار طبقہ شرفا کے تعاون پر منحصر تھا جس میں پیروں کی خاصی تعداد تھی۔ شرفاء کے اس طبقے نے جس کے پاس اصولی طور پر، انتظامیہ سے بہت قریب ہونے میں کھونے کو بہت کچھ تھا، دیکھا کہ اپنے نئے حکمرانوں سے کام کا اچھا تعلق رکھنا، ان کے لیے مفید تھا۔ غالبؔ نے 13/ جنوری 1859 کو نواب رام کو لکھا کہ بہرحال 'نمک خوار سرکار انگریز ہونا' کوئی اتنی بُری بات نہیں تھی۔

پردیپ اور جگ موہن دونوں ہنس پڑے۔

عزیز نے ان کی ہنسی کا جواب اپنی سردمہری اور سیدھے سادے عملی رویے سے دیا۔

"اسی نہج کی دلیل سید احمد خاں کی بھی تھی۔ اور یہی دلیل انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں برٹش سِول سرونٹس بشمول ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے بھی دی تھی۔ 1857 میں عظیم مسلم سازش کے نظریات ترک ہوئے تو مسلمانوں کو نوآبادیاتی حلقے میں لانے کے لیے متعدد کوششیں شروع کی گئیں۔ اسی لیے ہنٹر نے ایک ابھرتی ہوئی مسلم نسل کے لیے خواب دیکھنا شروع کردیے جو خود اپنے میڈیویل قانون کے نظریات سے سرشار ہونے کے بجائے مغرب کے شائستہ علم سے آراستہ ہوگی۔ ایک کے بعد ایک وائسرائے نے، خصوصاً Mayo اور نارتھ بروک نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پچھلی دہائیوں میں بنایا گیا مسلمانوں کا ہیولا مبالغہ آمیز خدشات پر مبنی تھا"۔

"اچھا ایسا ہے؟" پردیپ نے اپنی تیوریاں کسی قدر چڑھاتے ہوئے سوالیہ انداز میں عزیز کو دیکھا۔ عزیز میز پر سے اتر کر اب پردیپ کی نکلی ہوئی توند کو تھپتھپا رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا "ہمیں پیش رفت تو کرنا ہی ہے"۔

پردیپ نے کان کھجلاتے ہوئے کہا، "یقیناً"۔

"ایک طویل کہانی کو مختصر کرتے ہوئے .... مسلمانوں کے مفادات کی خاطر کی گئی بعض آئینی تبدیلیوں میں ان لوگوں کے لیے انگریزوں کی تشویش کا پرتو نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی کی ساتویں دہائی اور اس کے بعد حکومت کی پالیسیوں کے رخ اور ان کے جھکاؤ نے ہندستانی سیاست میں ایک مسلم تشخص پیدا کردیا جو پہلے نہیں تھا۔ جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ کلونیل حکومت نے خود اپنے زیادہ عسکری اور ضدی مخالفین کے چیلنجوں کو 'دو عظیم قوموں' ہندو اور مسلمان کے درمیان توازن کی پالیسی اختیار کرکے کس طرح کند کردیا۔ زمیندار خاندانوں اور ملازم پیشہ کمیونیٹیز، کائستھوں اور کشمیری پنڈتوں کو وسیع و عریض انتظامی ڈھانچے میں مدغم کیا گیا۔ اس کارروائی کا مرکز لکھنؤ تھا۔ امپیریل بغاوت کو پورا کرنے کے لیے جو بنیادی ڈھانچہ تشکیل پایا اس سے تاجروں اور کاروباری لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔

"کیا تم یہ کہوگے" پردیپ نے استفسار کیا، "کہ ایسی پالیسیوں کے آغاز کا سلسلہ مغلوں کے مدنی نظام کے ڈھانچے سے جوڑا جاسکتا ہے؟"

"اس سے پہلے کہ تم اظہار خیال کرو مجھے پردیپ کو یہ بتانے دو کہ یہ سوال نہایت احمقانہ ہے"۔

"اس سے قبل کہ تم مزید توتو میں میں ملوث ہو" عزیز نے اپنے دوستوں کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں تمھیں بتاؤں کہ ہم اب جب ملیں گے انشاء اللہ تو ہم چند تنازعات اور کشمکشوں پر بات کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ابتدائی قوم پرستوں نے ان کا مقابلہ کیوں کر کیا۔ فی الحال خدا حافظ۔

"ہاں، اس سے پہلے کہ تم جاؤ، پردیپ، سُنیتا کے لیے سیب لے جانا نہ بھولنا کہ یہ سیب سیبوں کے ملک کے باغوں سے توڑے گئے ہیں"۔

وہ رات پورے چاند کی تھی۔ عزیز پیچ در پیچ گلیوں سے ہوتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

پانچواں باب

روح کی ندرت اور پاکیزگی، کہ جس کی مجھے آرزو ہے، جب میری فطرت بن جاتی ہے، جب میں کوئی گناہ کرنے کے لائق ہی نہیں رہ جاتا ہوں، جب کوئی کھردری چیز یا کوئی سخت بات، چاہے یہ کیفیت لمحاتی ہی کیوں نہ ہو، میرے خیالات کی دنیا میں داخل نہیں ہوتی۔ اُس وقت، اُس سے پہلے نہیں، صرف اُسی وقت میری اہنسا سارے عالم کو متاثر کرے گی۔

(م۔ک۔ گاندھی)

لوگ گاندھی کے حالات زندگی لکھیں گے، اور ان کے نظریات و خیالات اور ان کے کاموں پر بحثیں کریں گے تنقیدیں کریں گے۔ مگر ہم میں سے بعض لوگوں کے لیے وہ نظریات سے الگ کچھ رہیں گے — ایک روشن و تابناک اور پیاری شخصیت جس نے ہماری حقیر زندگیوں کو ایک جوہر شرافت بخشا اور انھیں کچھ اہمیت عطا کی۔ اور جس کی موت ہمیں ایک خلا اور ایک تنہائی کے احساس میں ڈبو گئی۔ بے شمار تصویریں ابھرتی ہیں میرے ذہن میں اس شخص کی جس کی آنکھوں میں قہقہے ہی قہقہے ہوتے تھے۔ پھر بھی وہ غم و اندوہ کی اتھاہ جھیلیں ہوتی تھیں۔ جو تصویر سب سے واضح اور

اہم ترین ہے وہ وہ ہے جس میں میں نے انھیں مارچ 1930 میں، ہاتھ میں لاٹھی لیے ڈانڈی کی طرف مارچ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ سچائی، سکون اور شانتی کی تلاش میں نکلا ہوا ایک مسافر، پُر عزم اور بے خوف جو عواقب سے بے نیاز اپنی اس تلاش اپنے اس سفر کو جاری رکھے گا۔

(جواہر لال نہرو)

یہ فروری کی ایک شدید سرد شام تھی۔ چار باغ ریلوے اسٹیشن کے جنگلے مسافروں اور ان کے دوستوں اور رشتہ داروں کو نینی تال سے آنے والی سرد ہواؤں سے بچا رہے تھے۔ کرسمس اور نئے سال کے موقعے پر لکھنؤ جگمگایا تھا مگر لگتا ایسا تھا کہ اُس وقت کی تقریبات اوائل فروری تک بدستور جاری تھیں۔ مسکراتے ہوئے چہرے، اپنے عزیزوں اور اپنے پیاروں کے لیے طرح طرح کے کیک اور تحائف وغیرہ سے لدے ہوئے رکشوں میں اِدھر سے اُدھر آجارہے تھے۔ امین آباد میں جشن و مسرت کا ماحول تھا۔ بعض لوگوں نے یہاں کی بھیڑ بھاڑ اور یہاں کے شکستہ راستوں سے بچنے کے لیے، لکھنؤ کے نسبتاً امیر طبقے کے افراد کی ملاقاتوں کے مرکز حضرت گنج کو ترجیح دی تھی۔ یا پھر کچھ لوگوں نے خوبصورت چھتر منزل کا رُخ کیا تھا۔ معمر لوگوں نے شاہ نجف یا لاماٹینیر کے اطراف کے خاموش اور نسبتاً پُرسکون مقامات کو پسند کیا تھا۔ لاماٹینیر ایک ممتاز عیسائی ادارہ، فرانسیسی سپاہی جنرل کلائڈ مارٹن کے جوش و خروش کی علامت تھا۔ مختصراً یہ ہے کہ ہر شخص مطمئن نظر آتا تھا اور ماحول ہر بے چینی اور کشاکش سے پاک تھا۔

جگ موہن اور پردیپ نے اپنے بہت دن سے بچھڑے ہوئے دوست عزیز کو خوش آمدید کہنے کے لیے پلیٹ فارم نمبر دو کا رُخ کیا اور بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے وہاں پہنچے۔ جلدی ہی انھوں نے اونچی پیشانی اور پیچھے پڑے ہوئے بالوں والے اپنے دوست کو دیکھ لیا۔ ٹرین رکی اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

عزیز اپنے ایک گھریلو جھگڑے میں الجھ گیا تھا۔ زمین کے ایک قطعے اور آم کے ایک باغ پر کوئی خاندانی تنازعہ تھا جسے طے کرانے کے سلسلے میں وہ گیا تھا۔ اسی دوران ایک نوجوان چچازاد بھائی کی موت کا حادثہ ہوگیا۔ اس بیچارے کی زندگی عین اس وقت ختم ہوگئی جب وہ اپنے منتخب پیشے میں عروج پر پہنچنے والا تھا۔ عزیز جلالی میں تھا، ڈیتھ سرٹی فیکیٹ لینے کے لیے اُس نے متعدد بار علی گڑھ کی ڈسٹرکٹ کورٹ کے چکر لگائے اور آخر میں اس نے بابوؤں کو رشوت دے کر مطلوبہ دستاویز کو اگلی صبح گھر پر پہنچائے جانے کا انتظام کردیا۔

اقبال مہدی نہیں آئے۔ دہلی میں بڑے پیمانے پر فسادات شروع ہوجانے کی خبریں سن کر وہ مردولا سارا بھائی، رامیشوری نہرو، انیس قدوائی اور سبھدرا جوشی کے شروع کیے ہوئے باز آباد کاری کے کام میں شریک ہوگئے۔ انتہائی تشویش ناک حالات میں، مغویہ عورتوں کو نکال کر لانا اور انھیں ان کے خاندانوں سے ملانے کی ان لوگوں کی کوششوں سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے ان مصیبت زادہ عورتوں کے مسائل اور ان کی دشواریوں سے براہ راست واقفیت حاصل کی۔

ایسی ایک مثال ایک نوجوان سِکھ کی تھی جو ایک مسلمان تانگے والے کی نوجوان لڑکی کو اس وقت جب کہ لڑکی کے والدین پاکستان بھاگ رہے تھے، اپنے گھر لایا تھا۔ بالآخر، سکھ نوجوان نے مسلمان لڑکی سے شادی کرلی۔ اس نوجوان نوبیاہتا بیوی نے رامیشوری نہرو کو بتایا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بالکل خوش ہے اور یہ کہ اس کے رشتے دار جو اس کی واپسی کا مطالبہ کررہے ہیں وہ اسے شاید واقعی قبول بھی نہ کریں۔ مگر بہرحال قانون یہ کہتا تھا کہ دوسری طرف کا کوئی گمشدہ فرد مل سکتا ہو اور اس کے اعزاء اس کے واپس لائے جانے کا مطالبہ کررہے ہوں تو وہ متعلقہ ملک واپس بھیج دیا جائے گا۔ قانون نے اپنا کام کیا۔ رامیشوری نہرو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئیں، وہ ایک مظلوم کے دو طرفہ المیے کو برداشت نہ کرپائیں۔

عزیز کی عدم موجودگی کے زمانے میں بہت سے واقعات ہوئے۔ مسلح قبائلی کشمیر میں داخل ہوئے اور ہندو پاک کی لڑائی کے لیے زمین ہموار کردی۔ حسن اتفاق

دیکھیے، 80000 مربع میل کے رقبے والا کشمیر فرانس سے بڑا ہے۔ 565 رجواڑا ریاستوں کا ادغام بہت دردسری کا کام نہیں تھا۔ اگرچہ اجتماعی طور پر یہ ریاستیں 1947 کے ہندستانی سیاسی نقشے کا ایک بڑا حصہ تھیں، سارے ملک کا تقریباً 2/5 علاقہ اور برما کو چھوڑ کر سابقہ ہندستانی قلمرو کا پانچواں حصہ۔ نواب آف جوناگڑھ اپنے آٹھ سو کتوں کے ساتھ کسی قدر پریشانی کا سبب تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں حیدرآباد کی ریاست ترکی، اٹلی یا برطانیہ سے بڑی تھی اور وسعت کے اعتبار سے کشمیر، گوالیار اور اندور کی مجموعی وسعت کے برابر تھی۔ حیدرآباد کے غیرمستقل مزاج حکمران میر عثمان علی خاں ایک ایسی سلطنت پر حکمرانی کررہے تھے جس کی آمد و خرچ 1947 میں بلجیم کی آمد و خرچ کے برابر تھی اور اقوام متحدہ کی بیس رکن ریاستوں کی آمد و خرچ سے زیادہ تھی۔ اپنے بھولے پن میں ان کا خیال تھا کہ وہ انڈین یونین سے الگ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کا اعلان کردیا۔ بہرحال ستمبر 1948 میں پولیس ایکشن نے ان کے خواب کو چکناچور کردیا۔ گمراہ رضاکاروں پر پابندی لگادی گئی اور ان کا قائد پاکستان بھاگ گیا۔

کمیونسٹوں نے حیدرآباد کے تلنگانہ کے علاقے میں ایک مسلح جدوجہد کی قیادت کی۔ تحریک کے عروج کے زمانے میں وہاں کے متعدد اضلاع میں پھیلے ہوئے تین ہزار گاؤں میں تیس لاکھ افراد اس کے زیراثر آئے۔ تلنگانہ ہندستان کا Yenan کہلانے لگا۔

فروری 1948 میں کلکتے میں ہونے والی کمیونسٹ پارٹی کی دوسری کانگریس، حکومت پر بغاوت کے ذریعے قبضہ کرنے کے بی ٹی رندیوے کے تھیسس کے مطابق یہ فیصلہ کر ہی چکی تھی کہ ہندستان میں مسلح جدوجہد کے لیے حالات بالکل سازگار ہیں۔ پی سی جوشی نے جنھیں اقبال مہدی جانتے تھے، مخالفت کی اور ان کی جگہ پر رندیوے کو فائز کردیا گیا۔ رجنی پام دت کی مشاورتی مداخلتوں سے متاثر اس نئے جارح قائد نے بورژوازی لیڈرشپ کی نکتہ چینی کی۔ یہ سوال کرنے والا، بہرحال وہ تنہا نہیں تھا، آزادی کس سے اور کس کے لیے؟ اور آزادی کاہے کے لیے؟

مارکسی تاریخ داں ڈی ڈی کوسامبی کو یہ تذبذب تھا کہ جب کانگریس کی حمایت کرنے والے طبقے کے مفادات غریب طبقوں کے مفادات سے اتنے مختلف ہیں تو کیا نہرو کا مارکسی رجحان بدل نہیں جائے گا۔ انھوں نے مزید کہا کہ بورژوازی کو نہرو کی قیادت کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح ہندستان کو خود اس طبقے کی ضرورت ہے۔ شگونوں پر انھوں نے جوں جوں غور کیا انھیں یہ محسوس ہوا کہ راستوں کی علاحدگی صاف نظر آرہی تھی۔ جو بات ان کے ذہن میں واضح نہیں تھی وہ تھی کہ نہرو راستہ کون سا اپنائیں گے؟

ایسے قابل توجہ مسائل پر آئین ساز اسمبلی نے بحث کی۔ کولمبیا سے ڈاکٹریٹ اور لندن یونیورسٹی سے ایک ڈگری لینے والے دلت لیڈر بی. آر. امبیدکر نے جلسوں کی صدارت کی۔ ڈاکٹر امبیدکر مہاراشٹر کے ان دو سماجی لیڈروں میں سے تھے جنھوں نے ذات پات والے ہندو سماج کی عدم مساوات کے خلاف احتجاج کے طور پر تبدیلیٔ مذہب کی تلقین کی۔ ایسے دوسرے لیڈر پنڈت راما بائی سرسوتی تھے۔

"امبیدکر اتنے بڑے لیڈر کیوں تھے؟ اور دلتوں کے بارے میں ہماری معلومات کیا ہیں؟" خاموشی کو توڑتے ہوئے پردیپ نے کہا۔

عزیز نے اپنے کندھے جھٹکے، "امبیدکر کے بارے میں بات کرنے سے پہلے، میں تمھیں بتاؤں کہ گاندھی جی نے اچھوتوں کے ساتھ کیے جانے والے سلوک کی بڑی شدت کے ساتھ مذمت کی۔ ان اچھوتوں کو پیٹ کے بل گھسٹنا پڑتا تھا، اپنی ناکیں زمین پر رگڑنا پڑتی تھیں، انھیں ریل کے ڈبوں سے باہر دھکیل دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ وہ ہیں جنھیں چاروں ورنوں سے باہر رکھا جاتا ہے۔ اور ہمیشہ سے یہ لوگ سماجی اور مدنی معذوریوں اور مجبوریوں کے شکار بنائے گئے ہیں۔ 1920 کے آخر میں چھوت چھات کو ختم کرنا کانگریس کے پروگرام کا جزو لاینفک بنا۔ گاندھی جی وہ شخص تھے جنھوں نے اسے بے مثال رفتار بخشی، ساتھ ہی ایک نمو پذیر، متحد کرنے والے اور جامع نظام کی حیثیت سے اس کا دفاع کیا اور کہا کہ یہ درجہ بندی کے نظریات سے خود اپنے آپ کو آزاد کرسکتا ہے۔ اُن کے مطابق ذات، قانون سازی، انتظامیہ، عدلیہ

اور اسی طرح کے دوسرے نیم سرکاری کام کرنے والی ایک خود اختیاری سماجی اکائی تھی۔ اس لیے ذات پات کے نظام نے آبائی پیشے کے تسلسل کو یقینی بنایا، انسانی رشتوں کی ساخت کو مرتب کیا۔ بدیسی راج کے طویل زمانوں میں ہندستان کو ٹوٹ پھوٹ اور انتشار سے محفوظ رکھا اور اس کی مذہبی اور ثقافتی اقدار کی بقا کی ضمانت لی۔ ان کا خیال تھا کہ فرد کی زندگی کی چار منازل طالب علمی، گرہستی، خاندان سے وسیع کیونٹی کی رکنیت اور تیاگ ایسی باتیں تھیں جن کا استعمال عالمی پیانے پر کیا جاسکتا تھا۔

پردیپ نے میز پر سے ایک کاغذ اٹھایا اور دوات کا ڈھکنا کھولا۔

"دوسری طرف امبیدکر نے ذات پات کے نظام کے اس عینیت پسندانہ رُوپ کی مذمت کی۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انھوں نے مہاتما کے اس مرن برت پر نکتہ چینی کی جو انھوں نے برطانوی حکومت کے 1932 کے اُس کیونل اوارڈ کی مخالفت میں رکھا تھا جو اچھوتوں کو الگ ووٹروں کی جماعت فراہم کرتا تھا۔ انھوں نے شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ یہ برت بے بس و مجبور عوام پر جبر و ظلم کی بدترین شکل تھا۔

بہت سخت الفاظ میں، "امبیدکر چاہتے کیا تھے"، جگ موہن نے پوچھا۔

تمھیں شاید کچھ اندازہ ہو پائے، "انھوں نے ناگپور میں 1930 میں پسماندہ طبقات کی کانفرنس کو خطاب کیا جس میں ہندستان کی آزادی کی اپیل کی اور اچھوتوں کو غلاموں کے غلام قرار دیا۔ اسی سال لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس میں انھوں نے اچھوتوں کے لیے ووٹروں کی الگ جماعت کا مطالبہ کیا۔ ان کے مطابق، پسماندہ طبقے کو دوسری اقلیتوں کے ساتھ یہ ڈر تھا کہ قانون سازی، انتظامیہ یا شہریت کے دوسرے عوامی حقوق کے معاملات میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جائے گا۔ خطرہ مزید زیادہ اس لیے بھی تھا کہ اکثریت کا اقتدار قدامت پسند ہندوؤں کا اقتدار ہوگا جو صدیوں سے انصاف، مساوات اور خوش ضمیری کے تمام احکامات کی خلاف ورزی کرتے رہے تھے۔"

"یہ بات میری سمجھ میں آتی ہے"، جگ موہن نے کہا۔

ہاں، مگر گاندھی جی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ کانگریس کسی ایسی تجویز کی، جس کے تحت آزادی کا پودا پنپ نہ سکے اور ایک ذمہ دار حکومت قائم نہ ہوسکے تائید کرنے کے بجائے گمنامی کی زندگی گزارنا پسند کرے گی۔ پھر Yeravda جیل میں گاندھی جی کا مَرن برت ہوا۔ کچھ لوگوں نے 19 ستمبر 1932 کو پونا میں کانگریس اور دلت لیڈروں کی ایک کانفرنس کا اہتمام کیا۔ اس کانفرنس کا نتیجہ پونا پیکٹ کی شکل میں نکلا۔ الگ الکٹرورئٹس کے معاملے میں اگرچہ امبیدکر کو ناکامی ہوئی مگر صوبائی قانون ساز اسمبلیوں میں انھوں نے کیمونل ایوارڈ کے تحت ملنے والی 78 نشستوں کے مقابلے میں 148 محفوظ سیٹوں پر فتح حاصل کی۔

جی ڈی ٹینڈولکر نے جیل کی بے مثال تقریب کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ یہ تقریب 26 ستمبر، پیر کے دن، پانچ بج کر پندرہ منٹ پر یورودا (Yeravda) جیل میں منعقد ہوئی۔ ذرا تصور کیجیے۔ گاندھی جی اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں، تقریباً دو سو افراد چارپائی کے چاروں طرف کھڑے ہیں، دعاؤں کا سلسلہ ٹیگور اپنی گیتانجلی کی ایک نظم سے شروع کرتے ہیں۔ جب دل میں ایک قطرہ خون نہ ہو، وہ پیاسا ہو، اپنی بارشِ رحمت کے ساتھ آؤ۔ اس کے بعد سنسکرت کے کچھ اشعار پڑھے گئے۔ بعد کو گاندھی جی کا پسندیدہ بھجن ویشواجناتو گایا گیا۔ ہر شخص نے آواز میں آواز ملائی۔ اس سب کے ختم ہونے کے بعد کستوربا نے انھیں ایک گلاس میں سنترے کا شربت دیا اور برت ٹوٹ گیا۔

"موثر عکاسی ہے"، پردیپ نے رائے ظاہر کی۔ "مگر تم نے اور جگ موہن نے ذات پات اور ذات پات کے نظام کا تذکرہ اتنی بار کیا ہے، اچھا ہو اگر تم اس پر کچھ مزید روشنی ڈالو۔"

"ذات کی اصطلاح کے" عزیز نے جواب دیتے ہوئے کہا، "متعدد اور متنوع مطلب ہیں۔ صدہا برسوں میں، اِسے سماج کی مختلف سطحوں پر ذرا ذرا سے اختلاف کے

ساتھ مختلف معنی ملتے رہے ہیں۔ مقامی جاتیوں پر مبنی درجہ وار ترتیب اور کل ہند (Pan-India) پیمانے پر ورن کی بنیاد پر قائم درجہ بند حیثیتوں کے مابین ذاتوں کی انتہائی پریشان کن اور بے ترتیب ریجنل اور ضمنی علاقائی گروپ بندی ہے اور ذات کی درجہ بندیوں کے متنوع تصورات ہیں۔ مزید یہ کہ ذات کی بنیاد پر بنے ہوئے گروپوں نے اپنی اپنی حیثیت اور اپنی اپنی جگہیں بدل لی ہیں کیونکہ کاسٹ سوسائٹی کے پاس بدلتی ہوئی سیاسی و اقتصادی اور سماجی و مذہبی رسوم کے اکتساب کو جواز بخشتے ہوئے نئے گروپوں کو ساتھ ملانے اور بدلتی ہوئی رسوم کو جگہ دینے کی میکنزم یا حکمتِ عملی تھی"۔

"لیکن" جگ موہن نے کہا، "ذات پات کی بندشیں حالیہ برسوں میں، شہری تعلیم یافتہ افراد میں کچھ کم ہوئیں ہیں"۔

"صحیح ہے، مگر پھر بھی ذات کی ارا، ذات کی وفاداریاں آج بھی ایک طاقت ور، مربوط اور منضبط قوت ہیں۔ ذات، سیاسی اجتماع، سیاسی اتحاد اور معاشی تقسیم نو کے لیے فطری مرکز ہے اور ساتھ ہی سماجی اور ثقافتی پہچان کا نشان۔ اسے عام طور پر ہندستانی مدنی (polity) بکھراؤ اقتصادی عدم مساوات اور سماجی انتشار کا اہم ذریعہ اور سب سے بڑا سبب قرار دیا جاتا ہے"۔

ذات، ہندستان کے عصری مسائل کے نوآبادیاتی نظام کے بعد کے کردار کی یقیناً بڑی واضح اور بیّن یادگار اور اس بات کی علامت ہوسکتی ہے کہ تاریخ اور روایت سے ہندستان کے رشتے میں نوآبادیاتی قاضی ہی ثالث رہے گا۔ اگرچہ ذات اور کلونیل ازم ایک حوالے کے بغیر گزر نہیں کرسکتے تھے، مگر ایسا لگتا ہے کہ آنے والے بہت عرصے تک یہ دونوں ہندستان میں زندہ رہیں گے۔

"خوفناک امکان"، جگ موہن نے کہا۔

"عزیز بھائی چلو اب چلیں۔ ویسے تم اتنا خوبصورت دوشالہ اوڑھے ہوئے ہو"۔

"تم اس کا تذکرہ شرر کی کتاب "خدا حافظ" میں دیکھ سکتے ہو"۔

☆☆☆☆☆

30 جنوری، پانچ بجے شام کو ہندستان پر قومی المیے کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا جب ایک کٹر ہندو نے، جمعے کی پرارتھنا سبھا میں کھڑے ہوکر، انتہائی قریب سے راشٹر پتا پر ؛ار گولیاں داغ دیں۔ "ہماری زندگیوں سے روشنی چلی گئی، ہر طرف اندھیرا ہے ...... ہارے پیارے لیڈر جنھیں ہم پیار سے باپو پکارتے تھے، راشٹرپتا کہتے تھے، باقی نہیں ہے۔ روشنی گم ہوگئی"، کرب میں مبتلا نہرو نے ملک و قوم کو اطلاع دی۔ "مگر میں ملطی پر تھا۔ کیونکہ روشنی جو اس ملک میں نظر آتی تھی وہ کوئی معمولی روشنی نہیں تھی، روشنی، جس نے اس ملک کو اتنے برسوں سے منور رکھا وہ ابھی مزید برسہا برس تک ملک کو روشن رکھے گی ...."۔ کچھ دنوں بعد انھوں نے مجلس قانون ساز کو بتایا، "ایک عظمت رخصت ہوگئی ہے، وہ سورج جو ہمیں گرمی پہنچاتا تھا، اور جس نے ہماری زندگیوں کو منور کر رکھا تھا وہ ڈوب گیا اور ہم ٹھنڈک اور تاریکی میں کانپ رہے ہیں"۔

گاندھی جی کی ارتھی کے جلوس کے بے شمار تفصیلی بیانات، لاکھوں افراد پر مشتمل امنڈتے ہوئے ہجوموں کے غم اندوہ کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ ترک موالات کی ایک ممتاز ستیہ گرہی اور آل انڈیا ویمنس کانفرنس کی مؤسس یقین ہی نہیں کرسکیں کہ مہاتما کا انتقال ہوگیا ہے۔ گاندھی جی کے جسد خاکی کو ان کے آخری سفر پر لے جانے والی گاڑی کو دیکھنے کے لیے وہ تیار ہی نہیں تھیں۔ بڑی کوششوں کے بعد وہ اپنے آپ پر قابو پاسکیں۔ وہ اپنے آپ کو ایک وسیع و عریض خلا میں یک و تنہا محسوس کررہی تھیں، کچھ نہیں تھا وہ جس کا سہارا لیتیں، کوئی نہیں تھا جس کی طرف وہ دیکھتیں۔

مہاتما جیسے زندہ رہے تھے ویسے ہی مرے۔ قیمت سے بے خبر، انجام سے بے نیاز، اپنے اصولوں سے وابستہ، یہ سب ہوا کیسے؟ ارتھی کے اس عظیم اور عجیب و غریب جلوس کو وہ دیکھ رہی تھیں۔ لاکھوں افراد، موت کی سی خاموشی میں جمع ہوئے تھے، مبہوت، حیران و پریشان اور خاموش، کبھی کبھی کہیں سے کسی چیخ کی آواز آتی، مہاتما گاندھی امر رہو اور پھر مدھم ہوتے ہوئے اجالے میں غائب ہوجاتی۔ جواب میں

کوئی دوسری آواز نہیں تھی، کوئی بازگشت بھی نہیں۔ ایک ایسے منظر میں جو خوف زدہ تھا، پریشان اور غیر حقیقی تھا، لاکھوں گلے سوکھ گئے تھے، بیٹھ گئے تھے۔

وائسرائے کے اے ڈی کانگ (سردار رکاب) نے شاہی راستے پر گاندھی جی کے آخری درشن کیے۔ وہ شخص جس نے راج کی منسوخی میں سب سے زیادہ مدد کی آج مرنے کے بعد وہ نذرانہ عقیدت وصول کر رہا تھا کہ جس کا تصور کسی وائسرائے نے خواب میں بھی نہ کیا ہوگا۔ گاندھی جی شام کو مرے اور دوسری ہی صبح انھیں شمشان گھاٹ لے جایا گیا۔ ان کی موت کے اعلان کے لیے زیادہ وقت بھی نہیں ملا تھا۔ مگر پھر بھی گھنٹہ بھر میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ ان کے آخری دیدار کے لیے جوق در جوق آگئے۔ کون تھا جو اس بے پناہ عقیدت کے سامنے ایمانداری سے یہ دعویٰ کر سکتا کہ گاندھی جی کو واقعی ماننے والے نہیں تھے؟

نہرو چاہتے تھے کہ جائے واردات، برلا ہاؤس کو قومی یادگار بنا دیا جائے۔ سردار پٹیل نے یہ کہتے ہوئے کہ خود باپو نے اس خیال کو کبھی پسند نہ کیا ہوتا، اس منصوبے کی مخالفت کی۔ باپو کی یاد کو باقی رکھنے یا ملک و قوم اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے اس عظیم اور مہیب المیے کو میراث کی طرح چھوڑنے کا اس سے زیادہ قابل اعتراض طریقہ وہ سوچ نہیں سکے۔

☆☆☆☆☆

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، غالبؔ کا بھی نہیں کہ جن کا خیال تھا کہ "موت کا ایک دن معین ہے"۔ ادھر کچھ دنوں سے جگ موہن، پردیپ اور عزیز اپنے انکم ٹیکس کے حسابات میں الجھے ہوئے تھے۔ ان کی ایک دوسرے سے ملاقات تو ہوتی تھی مگر کسی طویل گفتگو کا موقع نہیں تھا۔ تقریباً تین مہینے بعد ان لوگوں کو حضرت گنج کے Benbows ریسٹوراں میں مل بیٹھنے کا موقع ملا۔

"برادر عزیز"، پردیپ نے گفتگو کا آغاز کیا، "میں ایک اچھا خاصا مشہور سرجن، کلائیو کے طرز عمل اور رانی جھانسی کی بہادری کے کارناموں پر اپنی راتوں کی

نیند کیوں حرام کروں .... آخر کیوں؟"

"میں ان سے اتفاق کرتا ہوں"، جگ موہن بولا۔ میں بارہ بنکی میں بننے والی نہر کی کھدائی کی نگرانی میں اپنے دن بلکہ ہفتے صَرف کرتا ہوں، جونیر انجینیر آتے نہیں ہیں، مزدور ہر روز اُجرت بڑھانے کا مطالبہ کرتے ہیں، مقامی زمیندار اپنی زمینوں کا زیادہ معاوضہ چاہتے ہیں، سیاست دانوں کے کبھی نہ ختم ہونے والے مطالبات ہوتے ہیں، ملک کی یہ خوفناک صورت حال مجھے بے پناہ پریشان کررہی ہے۔ کیا آزادی اور خود مختاری کا یہی مطلب ہے؟ ہندوؤں اور مسلمانوں کے فسادات بدستور ہوتے ہیں، آزادی سے قبل ہمیں بار بار یہ یقین دلایا جاتا تھا کہ انگریزوں کے بعد تعصب ختم ہوجائے گا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم ہوجائے گی۔ تیسرا فریق ہماری سرزمین سے چلا گیا۔ کیسا اتحاد اور کیسا سکون۔ کشمیر میں کیا ہورہا ہے، کیا یہ بھی تقسیم کا خمیازہ ہے؟ میں نے نیشنل ہیرالڈ میں پڑھا کہ خود اپنی پارٹی میں فرقہ پرستی کا زہر پھیلنے کی وجہ سے نہرو پریشان ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ آخر کیوں ایک ہندستانی نے گاندھی جی کو مار ڈالا؟ کیا یہ ایک حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ عدم تشدد کا ایک اوتار خود اپنے ہی ملک کے ایک باسی کی گولی سے مارا گیا؟ کیا ہوا اگر ناتھو رام گوڈسے ایک ہندو تھا یا آر ایس ایس کا ایک سرگرم کارکن؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ باپو اپنی ساری زندگی، خود اپنی کانگریس کے ساتھیوں کا نشانہ رہے؟

"ہاں، ہاں، میں بھی جگ موہن کی پریشانیوں کو سمجھتا اور share کرتا ہوں"۔ پردیپ نے کہا، "میری بیٹی جو لاریٹو کانونٹ میں پڑھتی ہے، کشمیر کے مسئلے پر، ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات پر، گاندھی جی پر اور نہ جانے کس کس بات پر، سوالات کی بوچھار کردیتی ہے۔ وہ پوچھتی ہے کہ ونوبھاجی کی یہ پُرخلوص بھودان، زمین کے تحفے کی تحریک کیا ہے؟

"مجھے اس کے بارے میں کچھ بہت نہیں معلوم ہے، میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کوشش یہ ہے کہ تین سَو ملین ایکڑ قابل کاشت آراضی میں سے پچاس ملین ایکڑ حاصل کرکے انھیں ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کردیا جائے۔ یہ طریقہ کار

کامیاب نہیں ہوگا۔ صحیح لائحہ عمل تو یہ ہوگا کہ زمینی اصلاحات کی جائیں اور زمینداری کو ختم کیا جائے۔ یوپی میں یہی کیا جارہا ہے مگر ضرورت ہے کہ یہی عمل دوسرے صوبوں میں بھی کیا جائے"۔

اسی لمحے ایک عجیب و غریب آواز آنے کی وجہ سے گفتگو اچانک ختم ہوگئی۔ کسی نے گراموفون پر ریکارڈ کے گھومنے کے دوران سوئی اٹھا لی تھی اور ایسا لگا تھا کہ جیسے کوئی شخص بولنے والا ہے۔ بعد کو پتہ چلا کہ یہ کوئی تقریر نہیں بلکہ ریسٹورنٹ میں داخل ہونے والے لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے ایک گیت تھا۔ انھوں نے اپنے گرو سے سلام و دعا کی، اس کے دوستوں سے اپنا سب کا تعارف کرایا اور اس کلچرل پروگرام کے بارے میں بات کی جس میں انھوں نے مشہور پلے بیک سنگر طلعت محمود کو بلایا تھا۔ عزیز نے اس راز کو افشا نہیں کیا کہ علی گڑھ میں منٹو سرکل اسکول میں طلعت محمود اس کے ہم عصر تھے۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد پردیپ نے جلدی سے بحث کا موضوع پھر بدلتے ہوئے کہا، "اتفاقاً، سنیتا کی کتاب میں میں نے کرزن کی وہ تقریر دیکھی جس میں وہ ہندستان میں برطانوی راج کے نظریات و خیالات اور اس کے مقاصد کی بڑی تابناک تاویل کرتا ہے۔"

"تقریر، تم جس کا حوالہ دے رہے ہو"، عزیز نے کہا، "زبردست ہے، اس میں انٹونی کے لہجے اور اس کے زور خطابت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود ایک دہائی کے اندر اندر بنگال میں سودیشی احتجاج کی لگائی ہوئی نیشلسٹ بیداری کی چنگاری Pax Brittanica کے لیے ایک قابل لحاظ خطرہ بن گئی۔ اور پھر جنوبی افریقہ میں اپنے طویل اور ہنگامی قیام کے بعد موہن داس کرم چند گاندھی، راج کی اخلاقی اور نظریاتی اساس کو چیلنج کرنے آگئے۔ بے باک شاعر اکبر الہٰ آبادی کے الفاظ میں :

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہ نامہ ہو چکا اب وقتِ گاندھی نامہ ہے

پردیپ نے تحسین میں سر ہلایا، کتنا شاعرانہ، کتنا صحیح!

عزیز نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا، "گاندھی کی وجہ سے ملک گیر پیمانے پر ہلچل پیدا ہوگئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ محض مہاتما گاندھی نہیں رہ گئے۔ مہاتما کا یہ خطاب خود گاندھی جی نے گوکھلے کو دیا تھا اور بعد کو یہی خطاب ٹیگور نے گاندھی جی کو دے دیا۔ وہ ایک روشن ضمیر اور غیب کو جاننے والے سیاسی قائد بن گئے جس نے عدم تشدد کے اپنے طریقوں سے استعماری (کلونیل) حکومت کی مخالفت کی۔ ٹیگور اور دوسرے لوگوں نے جنھوں نے مہاتما کی اصطلاح استعمال کی، انھوں نے اسے اُس عام معنی میں استعمال کیا جس میں اس سے مراد ایک ایسے شخص سے تھی جس نے عوام کی آرزوؤں اور تمناؤں کا اور ساتھ ہی زبان و مکان کی سچائی کا اظہار کیا۔

"ٹھیک ہے"، پردیپ نے فلسفیانہ انداز میں اظہار خیال کیا۔ صحیح ہے کہ ہم نے آزادی حاصل کرلی، مگر کس قیمت پر، اتنے لوگ مارے گئے، لاکھوں بے گھر ہوگئے، تقسیم کے شکار لوگوں کو ہم نے دہلی میں دیکھا تھا۔ یہی تھا گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے جس کا سودا کیا تھا؟ یہ سب ہوا کیسے؟ تمھاری عالمانہ وضاحتوں کے بعد میں تو اب بھی مخمصے میں ہوں، بے پناہ الجھن میں۔"

ظاہر ہے عزیز کے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔ یہ سب کس نے کیا؟ پھر بھی جدوجہد آزادی کے کچھ پہلوؤں اور تقسیم سے پہلے ہونے والے بعض واقعات پر اس نے روشنی ڈالی۔

عزیز نے آئین ہند کے اہم نکات کو بیان کیا جو 26 نومبر 1949 کو منظور ہوا تھا اور 26 جنوری 1950 سے نافذ ہوا۔ یہی دن تھا جب ہندستان باقاعدہ طور پر ایک جمہوری ریپبلک اور وفاقی ملک قرار پایا۔ یہ دن ہندستانی عوام کے لیے ایک انتہائی اہم دن تھا، کیونکہ یہ قومی جدوجہد کے ایک اہم مرحلے کی تکمیل تھا۔ سفر ختم ہوا تھا اور شاید ایک اور زیادہ دشوار سفر کا آغاز ہوا تھا۔ ایک عہد پورا ہوا تھا، نہرو نے اعلان کیا۔ عہد کی تکمیل سے ایک طرح کا اطمینان نصیب ہوا تھا اور آئندہ کی جدوجہد کے لیے توانائی ملی تھی۔

☆☆☆☆☆

یہ سب 28 دسمبر 1885 کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی میں شروع ہوا۔ 83 شرکاء جلسہ کی شمولیت سے ایک نئی آرگنائزیشن، انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ ان شرکا میں بعض معروف لوگ تھے، باقی کو عوامی اسٹیج پر ابھی آنا تھا۔ گورنر جنرل کی لیجسلیٹیو کاؤنسل کے ممبر فیروز شاہ مہتا پورے جوش و خروش میں تھے۔ دادا بھائی نوروجی، یہ بھی پارسی تھے، اپنی تجویزوں کے ڈرافٹس کو تیار کرنے کے لیے اپنے ساتھیوں کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان بدرالدین طیّب جی کی وجہ سے، اگلے اجلاس میں زیادہ مسلمانوں کی شرکت کی توقعات اور بڑھ گئی تھیں۔ سریندرناتھ بنرجی اور آنند موہن بوس، ساتھیوں کو ورناکیولر (پریس ایکٹ 1878) کے خلاف خود اپنی مہم سے واقف کرا رہے تھے۔ مدراس مہاجن سبھا کے ایک مؤسس آنند چارلو اور اخبار 'ہندو' کے اڈیٹر (98-1878) پگڑی باندھے ہوئے سبرامنیا آئیر کانگریس کو ایک کل ہند کردار تو نہیں مگر ایک زیادہ نمائندہ حیثیت دینے کے لیے وہاں موجود تھے۔ ڈبلیو سی بنرجی، ایک قابل احترام شخصیت، سارے گھمسان سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ بعد کو انھوں نے وائسرائے ڈفرن کو کانگریس شروع کرنے کا اعزاز بخشا۔

جلسے میں ہونے والی ساری بحث کو جس شخص نے بڑی توجہ سے سنا وہ ایک انگریز ایلن آکٹیوین ہیوم (Allan Octavian Hume) تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کا جنم داتا — آئی سی ایس کے اس سابق ممبر نے جلسے میں شریک ہونے والوں کے جانے کے بعد جو کچھ بھی سوچا ہو، اس نے یہ ضرور تسلیم کیا ہوگا کہ یہ اجتماع ہندستان کے لیے بڑی حد تک فیلیڈلفیا میں یونائیٹڈ اسٹیٹس کے لیے ہونے والی Continental Congress کے پہلے جلسے جیسا اہم و عظیم موقع تھا۔ ممتاز لوگوں کو خوش آمدید کہنے یا انھیں الوداع کہنے کے لیے بڑی بھیڑ اکٹھا ہوئی تھی مگر، عوام نے ان ممتاز لوگوں کے جانے کے بعد، ان کی تقریروں پر بحثیں کیں، وہاں پاس کی جانے والی تجویزوں پر تبادلہ خیال کیا۔ جلسے میں لوگوں نے جو کچھ کہا تھا وہ بہت انقلابی نہیں تھا، انھوں نے جو مطالبات کیے تھے وہ بھی نئے نہیں تھے۔ صوبائی ایسوسی ایشنس 1850 سے لیجسلیٹیو اسمبلی میں اصلاحات کرنے اور عوامی عہدوں کے تقررات میں زیادہ

ہندستانیوں کو شریک کرنے کا حکومت سے بار بار مطالبہ کرتی رہی تھیں۔

برٹش انڈیا ایسوسی ایشن 1851 ہی میں کلکتے میں بن گئی تھی، بامبے ایسوسی ایشن اس کے بعد ایک ہی سال کے اندر قائم ہوئی۔ مدراس کے تاجروں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی ایک شاخ فروری 1852 میں قائم کی جسے انھوں نے چھ مہینے بعد ایک خود مختار جماعت مدراس نیٹیو ایوسی ایشن میں تبدیل کردیا۔ اس نے اپنے سامنے کمپنی چارٹر میں ترمیم کرنے، ٹکس کے نظام پر نظرثانی کرنے اور مشنریوں کی سرگرمیوں پر قدغن لگانے کے مقاصد رکھے تھے۔ یہ ایسوسی ایشن تقریباً دس سال سرگرم رہی مگر 1858 میں برطانوی ہند کے ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو منتقل ہوجانے کی وجہ سے ایسوسی ایشن کی سب سے بڑی شکایت دور ہوگئی اور ایسوسی ایشن جولائی 1862 تک حقیقتاً معدوم ہوگئی۔ دوسری متعدد ایسوسی ایشنوں کا مقدر بھی یہی رہا تھا، مگر ان انجمنوں نے اپنی مختصر سی زندگی میں ذاتوں، کمیونیٹیز اور مذہبی گروہوں کے درمیان ہونے والی سیاسی چپقلش کی عکاسی ضرور کی۔ کچھ برسوں بعد کانگریس ان آوازوں کے لیے ایک ایسا پلیٹ فارم بن گئی جس پر سے یہ آوازیں زیادہ توانا اور زیادہ بلند طریقے پر سنی جائیں۔

سنسکرت کالج میں معدودے چند مگر متوجہ سامعین نے یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ کانگریسی حضرات نے ڈفرن کی کسی پہلو سے بھی دل شکنی نہیں کی، اس کی طرف ان کا رویّہ نرم اور معتدل تھا اور ان کی باتیں مصالحت آمیز تھیں۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ایک سال بعد دادا بھائی نوروجی نے ملک کے بہتر ہوتے ہوئے راج کی بات کی اور یہ بات صاف کردی کہ کانگریس غداری اور بغاوت کی پرورش گاہ نہیں ہے۔ 1899 میں تحریری آئین میں کہا گیا کہ کانگریس کا مطمحِ نظر، جمہوری طریقوں سے عوام کے مفادات کا تحفظ اور ان کی خوش حالی کو فروغ دینا ہے۔ اسی کے ساتھ کانگریس نے کاسٹ اور کمیونٹی کے لیڈروں کو اپنے پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے آپ کو معرضِ وجود میں آتی ہوئی انڈین پولیٹکل کمیونٹی کا کہ یہی اس کا مرکز تھی، واحد نمائندہ تصور کیا۔ ایک کھلے ادارے کی حیثیت

سے اسے اپنے آپ کو ہندستان کو برطانوی تسلط سے نجات دلانے کے بڑے مقصد کے حصول کی خاطر کی اور عملی طور پر ایک فعال سماج کی شبیہہ میں ڈھالنا تھا۔

"اس کے ان دعووں کی"، عزیز نے کہانی کو جاری رکھتے ہوئے کہا، "شدت کے ساتھ مخالفت ہوئی مگر پھر بھی اس کے مؤسسین نے تمام جگہوں پر تو نہیں، کچھ علاقوں میں اپنی کوششوں کا پھل پایا۔ انھوں نے سب کو نہیں کچھ گروپوں کو ایک بہتر مستقبل کی امیدیں دلائیں۔ ایک ایسے ناہموار اور متنوع سماج میں ان کے مطالبات لازمی تھا کہ کچھ لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتے اور کچھ کے لیے پریشانی کا سبب بنتے۔ کچھ لوگوں نے تو اپنی تیوریاں بھی چڑھائیں اور کانگریس کے ملتجیانہ انداز کی مذمت بھی کی۔ گوپال کرشن گوکھلے نے نئی نسل میں بے اطمینانی اور بے صبری کی بات کی۔ انھیں بہرحال یہ اعتماد تھا کہ کانگریس بالآخر انقلاب کی نقیب بنے گی۔ گوکھلے کے خیال کے مطابق، اس کے کردار کا انحصار برطانوی حکومت کی عقلمندی یا حماقت پر اور برطانوی عوام کے حرکات و سکنات پر ہوگا۔

اسی لیے کیا مضائقہ تھا اگر چندہ دینے والے ممبر نہیں تھے، کوئی مستقل تنظیم نہیں تھی، جنرل سکریٹری کے علاوہ کوئی عہدے دار نہیں تھے، کوئی مرکزی دفتر نہیں تھا اور نہ ہی کوئی پیسہ؟ تو پھر کیا ہوا اگر شروع شروع کے کانگریس کے متوالوں کی رہائش پریسیڈنسی ٹاؤن میں تھی، اور کیا پریشانی تھی اگر ان کا تعلق اونچی ذات والوں سے تھا؟ اہم بات جو تھی وہ یہ تھی کہ ایک سیاسی اکائی کی حیثیت سے سست مگر مسلسل فروغ اور اپنے مطالبات کی حمایت میں مختلف ذاتوں مختلف علاقوں اور مختلف فرقوں کو ساتھ لانے کا مشن۔ ان کا مقصد بلا شبہہ، مقامی رضاکار جماعتوں سے اور انگریزی اور ہندستانی زبانوں کے اخبارات کی تعداد میں اضافے سے پورا ہورہا تھا۔ (ورناکیولر اخبارات 1885 سے 1905 کے درمیان 599 سے بڑھ کر 1017 ہوگئے تھے، ان کی اشاعت 299000 سے 817000 ہوگئی تھی) اس کے علاوہ نقل و حمل اور مواصلات کے بڑھتے اور بہتر ہوتے ہوئے ذرائع بھی بہت کچھ مددگار ثابت ہورہے تھے۔ پہلے پانچ برسوں میں شرکاء میں بھی بتدریج اضافہ ہوا، 1885 میں اگر 72 ڈیلی گیٹس شریک

ہوئے تھے تو 1889 میں یہی تعداد دو ہزار تک پہنچ گئی۔ اس طرح 1885 میں جو چیز محض ایک تجربے کی حیثیت رکھتی تھی اس میں ایک مستقل قومی ادارہ بننے کے تمام امکانات نظر آنے لگے۔

بعض تاریخ دانوں کا خیال تھا کہ صورت حال بالکل ایسی تو نہیں تھی۔ ان میں سے ایک کا خیال ہے کہ کانگریس کا وجود کسی فرقے کے کسی مطالبے کی مستعدی کا یا معاشی صورت حال میں کسی واضح تبدیلی کے عواقب کا نتیجہ نہیں تھا۔ وہ طبقے اور طبقے کے درمیان کی نہیں، فرقے اور فرقے اور ذات اور ذات کی داخلی رقابتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا مرکزی خیال تین ساحلی پریسیڈنسیوں میں تعلیم یافتہ افراد کے رول پر اور اپنے اپنے موجود گروپوں یعنی ذاتوں اور فرقوں کی حیثیتوں کی بقا و ترقی کے لیے ان کی کوششوں پر مرکوز تھا۔ یہ گروپ عموماً caste ہی تھے اور چونکہ caste جنوبی ایشیا سے باہر نامعلوم تھی اس لیے ظاہر ہے کہ یہ ایک مخصوص قسم کے اعلیٰ طبقے میں تھے۔

کچھ برسوں کے بعد ایک تھوڑے سے ترمیم شدہ نقطہ نظر نے اس بات کا تعین کیا کہ اثر و رسوخ، حیثیت و مرتبے اور وسائل کے لیے ہونے والی دوڑ بستیوں میں سیاسی پسند و ناپسند اور ترجیحات کو کس طرح طے کرتی ہے۔ ان مقاصد کے حصول کی تگ و دو میں سرپرستوں نے اپنے حاشیہ نشینوں کو دھڑوں میں گروہ بند کردیا جنھوں نے عہدوں اور حیثیتوں کے لیے دوڑنا شروع کردیا۔ یہ تعلق ساتھیوں میں پارٹنرشپ سے زیادہ عموماً اثر و رسوخ رکھنے والوں اور پیچھے چلنے والوں کا اتحاد تھا۔ دوسرے الفاظ میں یہ اتحاد افقی کے مقابلے میں زیادہ تر عمودی تھے۔ مقامی جدوجہد میں یہ بات شاذ ہی ہوتی ہوگی کہ اتحاد زمیندار اور زمیندار کا ہو، کاشتکار کاشتکار کا ہو، تعلیم یافتہ کا تعلیم یافتہ سے ہو، مسلمان اور مسلمان کا اور برہمن اور برہمن کا ہو۔ اکثر تو ہندو مسلمانوں کے ساتھ کام کرتے تھے اور برہمن بھی غیر برہمنوں سے ہاتھ ملائے رہتے تھے۔ مقتدر لوگ اپنے ماتحتوں کو اپنے مددگاروں کی حیثیت سے منظم کرتے تھے، پیشہ ور لوگوں کو اپنا ترجمان بناتے تھے اور سرکاری ملازموں کو معاون و مددگار میں

تبدیل کرلیتے تھے۔ مختلف بستیوں میں لیے جانے والے زندگی کے روزمرہ فیصلوں میں، انتظامیہ کے بنائے ہوئے اور تاریخ دانوں کے اپنائے ہوئے قوانین برائے نام ہی کوئی مطلب رکھتے تھے۔

کسی نظریے کے نہ ہونے کی وجہ سے سوسائٹیوں کے ایسے بے چہرہ اور گڈمڈ ڈھیر میں کسی ملک کسی قوم کا وجود نہیں تھا۔ ہندستان تھا کیا؟ قدیم قومیتوں کا قبرستان اور جنم کے لیے کوشاں نئے نیشنلزم کی ماں۔ اسی لیے ایک ایسی تحریک کے بارے میں لکھنا کچھ معتبر نہیں تھا جس کی بنیاد مشترک مقاصد میں ہو، جس کی قیادت ایسے افراد کررہے ہوں جن کا پس منظر یکساں ہو اور جن کی بھرتی موافق مفادات والے وسیع ہوتے ہوئے گروپوں سے کی گئی ہو۔ یہ تحریک اپنی طویل زندگی میں ایک نحیف و نزار اتحاد معلوم ہوتا رہا، اس کی یکجہتی تخیلی معلوم ہوتی رہی، اس کی قوت اتنی خالی خولی تھی جتنی کہ اس امپریل اتھارٹی کی تھی جس سے اس کا مفروضہ مقابلہ تھا۔ اس کی تاریخ ہندستانی اور ہندستانی کے مابین رقابت تھی، امپریلزم سے اس کا رشتہ دو کمزور آدمیوں کا نازیبا باہمی رشتہ تھا۔ ان ہی اسباب کی بناء پر ہندستان کی تاریخ کو امپریلزم اور نیشنلزم کے پرانے تصور کے گرد منظم نہیں کیا جاسکتا۔

ان دلائل اور ان توجیہوں کی وقتاً فوقتاً سرکاری خط و کتابت اور برطانوی ادبی تحریروں میں بازگشت سنائی دیتی رہی۔ ڈفرن کی مختصر سی اقلیت، ہندستانی نیشنلسٹ، ہندستان کی ترقی کی لگن سے سرشار اور متحرک سمجھے جانے کے بجائے خود اپنی ذات میں مگن سمجھے جاتے تھے۔ پریشانیوں اور دشواریوں کا سبب عوام نہیں تھے، بلکہ معدودے چند وہ لیڈر تھے جنھیں اپنی ذاتی ترقی سے دلچسپی تھی۔ عوام کو ہر موقع فراہم کرنا تھا کیونکہ ناول نگار ایڈمنڈ کینیڈا کے مطابق، انھیں مصنوعی طور پر جوش دلایا گیا تھا، یہ تو وہ لوگ تھے جو پردے کے پیچھے سے ڈور کھینچ رہے تھے۔ دوش تو اِن لوگوں کو دیا جانا چاہیے"۔

"پھیر بدلنے کا وقت آگیا ہے"، عزیز بیچ میں بولا، "ہم وہ لقمہ ہیں کہ ہرگز نہ پچیں گے ان کو" اکبر الہٰ آبادی نے لکھا تھا۔

نیشنلزم اور نیشنلیٹیز کے گہرے عواقب و اثرات کیا تھے؟ پردیپ اور جگ موہن کو اس کا رتی بھر بھی اندازہ نہیں تھا۔ عزیز نے اکثر قوم (nation) اور اس کے جستہ جستہ ٹکڑوں کی بات کی تھی مگر کئی موقعوں پر اس کے دوست اس کی ایسی ادق علمی اصطلاحات کے سر پیر کا بھی پتہ نہیں چلا پاتے تھے۔ وہ تو ہندستان کو بس ایک ملک ایک قوم (nation) جانتے تھے کیونکہ گاندھی جی نے، ٹیگور اور بوس نے اور نہرو نے کہا تھا اور وہ یہاں لکھنؤ میں بیٹھے ہوئے اور ان کے اعزاء اور رشتے دار ملک کے دوسرے حصوں میں قیام پذیر، سب ہی اپنے آپ کو مفتخر شہری گردانتے تھے۔ تو پھر ایک قوم میں متعدد قومیں کیسے ہوسکتی ہیں؟

"Nation" ہم جانتے ہیں کہ تاریخ جتنی قدیم نہیں ہے۔ اس لفظ کے جدید معنی اٹھارھویں صدی سے پرانے نہیں ہیں۔ nationhood کے لیے کوئی معروضی اصول بھی نہیں ہیں، اور اس کی وضاحت کے لیے بھی کوئی اصول نہیں ہے کہ کچھ گروپ تو قوم (nation) ہوگئے اور کچھ دوسرے قوم نہیں بن پائے۔ اسٹالن کی وضع کی ہوئی تعریف تو یہ تھی کہ ایک قوم تاریخی طور پر وجود میں آئی ہوئی 'زبان' علاقے معاشی زندگی اور تمدن کی ایک آبادی میں پیوست ایک نفسیاتی ترتیب یافتہ کمیونٹی ہوتی ہے۔ یہ نقطۂ نظر ناقابلِ مدافعت ہے۔ زبان اور نسل خود ہی گنجلک اور دھندلے ہر آن بدلتے ہوئے اور مبہم تصور ہیں۔ اور مسافر کے لیے اتنے ہی بے کار ہیں جتنے کہ زمینی علاقوں کے مقابلے میں بادلوں کے ٹکڑے۔

نیشنلزم کا اظہار، نیشن کے نام سے ہوتا ہے۔ یہ اختراع اٹھارھویں صدی کی ہے۔ انیسویں صدی کے یورپ میں نیشنلزم کا تعلق عوامی اقتدار کے نظریے سے ہوگیا۔ یعنی اس خیال سے کہ عوام سے وفاداری کا درجہ حکمران سے وفاداری سے پہلے ہے۔ یہ خیالات Mazzini اور آئرش محبانِ وطن کے تھے جنھوں نے نیشنلزم کے پیامبروں کی حیثیت سے ہندستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کو متاثر کیا تھا۔ لندن میں آئی سی ایس کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے سریندر ناتھ بنرجی کو Mazzini کے کاموں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی، بنرجی نے اس کے بارے میں تقریریں

کیں۔ لالہ لاجپت رائے اپنے آپ کو اس کا چیلا سمجھتے تھے، انھوں نے مازینی اور جیری بالڈی کی اردو میں پہلی سوانح عمری لکھی۔ وی ڈی ساورکر اور ان کے دو بھائیوں کو بھی اس سے بڑی تحریک ملی تھی۔

آج نیشنلزم سے مراد ایک ایسی ہمہ گیر اصطلاح ہوتی ہے جس میں قومی تشخص اور قومی شعور سے متعلق تمام مظاہر اور ان پر مبنی تمام اجتماعات یعنی اقوام شامل ہوتی ہیں، بسا اوقات اسے اُس واضح آئیڈیالوجی کے حوالے سے بھی استعمال کیا جاتا ہے جس پر قومی تشخص اور قومی شعور کی بنیاد ہوتی ہے۔

"کیا نیشنلزم ایک ایسا خیال ہے جسے یورپ سے ایشیا میں درآمد کیا گیا ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

"مجھے صحیح نہیں معلوم ہے"، عزیز نے جواب دیا، "مگر جناب والا بعض لوگوں کا خیال ہے کہ چین، جاپان اور ان کے مقابلے میں کسی قدر کم ہندستان میں، حب الوطنی کا احساس شدید بھی تھا اور عوام کے دلوں میں گھر بھی کیے ہوئے تھا۔ ان سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ ایشیا میں نیشنلزم کا فروغ، یورپ میں ایسی ہی تحریک کے متوازی فروغ تھا اور ایسی ہی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ یعنی بیرونی حکومت سے مدافعت کی فضا میں۔"

maritime presidencies کے پڑھے لکھے اور اونچی ذات کے لوگوں کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ کانگریس تعلیم پائے ہوئے لوگوں کی تابعدار ہے۔ عزیز نے کہا، کانگریس کے لیڈروں نے سماج کی ہر سطح پر متعدد مفادات کے لیے کام کیا۔ اس میں انھوں نے طبقے، ذات، علاقے اور مذہب کے باہمی رشتوں کو نظرانداز کیا۔ عزیز نے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ کانگریس نے کس طرح نچلی سطح پر گاؤں اور تعلقہ اکائیوں اور اوپر کی طرف ضلعے، صوبے اور کُل ہند کمیٹیوں سے ابتدا کرکے اور ایک تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دے کر ایک عوامی پارٹی کی حیثیت اختیار کی۔

"1900 میں"، عزیز نے بتایا، "کرزن کو اس بات کا یقین تھا کہ کانگریس

لڑکھڑا رہی ہے اور اپنے زوال کی طرف آمادہ ہے۔ کرزن کی سب سے بڑی تمنا کانگریس کی پرامن موت میں اس کی مدد کرنا تھی۔ آج کرزن مرچکا ہے، ایمپائر قصہ پارینہ بن چکی ہے مگر کانگریس زندہ ہے اور اچھی طرح زندہ ہے۔ ہاں جو چاہو کہو مگر شدید نشیب و فراز اور ہر طرح کے سرد و گرم کو جھیل جانے کی کانگریس میں حیرت انگیز صلاحیت ہے۔"

پردیپ نے عزیز بھائی کے طول طویل لکچر کی یکسانیت کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

"حضرت، آپ نے فرمایا کہ کانگریس مذہب، علاقے اور ذات کے مسائل سے بالاتر رہی، یقیناً یہ بات ہمارے آج کے یوپی کے نیتاؤں کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہرو خود اپنے صوبے میں ذات پات اور فرقہ پرستی کے پھر سر اٹھانے سے بہت پریشان ہیں"۔

"یقیناً جناب، لکھنؤ میں کانگریس کے ایک جلسے میں بعض گرم مزاجوں کی موجودگی نے نہرو کو طیش میں آکر چیخنے پر مجبور کردیا تھا۔ وہ ایک دم بھڑ پڑے تھے، جیسا کہ وہ عموماً کرتے ہیں۔ کسی نے پائنیر اخبار میں لکھا کہ اُن کی بے دھڑک جذبانیت پھوٹ پڑی۔ اس واقعے کو پریس میں بے پناہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ ذات اور فرقہ پرستی کی بات کرتے ہوئے مجھے ٹالسٹائی کا خیال آیا جس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ بااختیار انقلابی بسا اوقات ان لوگوں سے بھی زیادہ بُرے ڈھنگ اختیار کرلیتے ہیں جن کی جگہ خود انھوں نے لی ہے کیونکہ وہ اس جگہ نئے نئے آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ عہدوں کی لالچ اور اس کے امکانی فوائد کی خاطر جس کمینے پن کے ساتھ بھاگ دوڑ ہوتی ہے وہ انتہائی پریشان کن ہے۔ تم دیکھوگے کہ کتنی جلدی یہ بُت یعنی یہ کانگریسی لیڈر مسند سے دھکیل دیے جائیں گے"۔

"ہاں"، اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں پردیپ نے کہا، "جب تک یہ ہوگا اس وقت تک لکھنؤ میں کچرے پر رال بہاتے .رے اور کنکروں پتھروں پر جھپٹتے ہوئے

لوگوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوچکا ہوگا"۔ اس سے پہلے کہ عزیز اپنی بات پھر شروع کرے جگ موہن نے بابے کانگریس میں منظور کیے جانے والے ایک ریزولیوشن کو پڑھنا شروع کردیا۔ یہ ریزولیوشن کاشی ناتھ تریمبوک تیلانگ نے پیش کیا تھا اور اس کی تائید سبرامنیا آئیر نے کی تھی اور حمایت دادا بھائی نوروجی نے۔

پردیپ، جگ موہن سے سبقت لے جانا چاہتا تھا، اس نے گوکھلے کا حوالہ دیا جنھوں نے 1905 میں کانگریس کے مطالبات کا یوں خلاصہ کیا تھا۔ انتظامیہ میں ہندستانیوں کے لیے زیادہ حصہ حاصل کرنا، اور ساتھ ہی لیجسلیٹو کاؤنسلوں میں اصلاح، سکریٹری آف اسٹیٹ کی کاؤنسل اور ہندستان میں اگزیکیٹو کاؤنسلوں میں ہندستانیوں کا تقرر، انتظامیہ کے طریقوں کو بہتر کرنے کے لیے عدالتی امور کو انتظامی امور سے الگ کرنا، ٹیکس کے بوجھ اور فوجی اخراجات کو کم کرنا، کاشتکاروں کے قرضے کے بوجھ کو کم کرنا، پرائمری ایجوکیشن میں توسیع اور صنعتی اور ٹکنیکل تربیت کی سہولتوں کا اہتمام کرنا۔

"لیکن مہربانی کرکے آپ تو یہ بتایئے کہ کانگریس سجے سجائے پنڈالوں سے 'جسے عام آدمی سالانہ تماشہ کہتا تھا' روزمرّہ کے متنوع اور دور رس انتظامی، زرعی اور سماجی مسائل پر آواز اٹھانے کے لیے باہر کب نکلی؟ اس کے لیڈروں نے علاقائی اور مقامی گروپوں سے تعلقات کس طرح پیدا کیے اور کس طرح انھیں مستحکم کیا؟

"یار پردیپ یہ سوالات بڑے نازک سوالات ہیں"، عزیز نے کہا، "بہر حال، میں سمجھتا ہوں کہ اپنے اسّی ملین باشندوں کے ساتھ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے غیر منقسم صوبوں کی تقسیم نے حکومت کے ساتھ ایک بڑا تنازعہ کھڑا کردیا۔ انتظامی اعتبار سے اگرچہ صحیح تھا مگر غلط مشوروں پر لیا ہوا کرزن کا فیصلہ، جیسا کہ گوکھلے نے اشارہ کیا تھا، نوکرشاہی حکومت کے بدترین عوامل، ذہانت و ذکاوت کے ریاکارانہ اور پُر غرور دعووں اور رائے عامہ سے غیرذمہ دارانہ بے التفاتی کا مظہر تھا۔ اس سب نے عوام کو سڑکوں پر نکل آنے اور ان کے لیڈروں کو سودیشی، بائیکاٹ اور قومی نظام تعلیم کی مہموں کو منظم کرنے پر اکسا دیا۔

"کیوں؟"، پردیپ نے پوچھا۔

"کرزن کا خباثت آمیز اقدام الٹا پڑا"، عزیز نے جواب دیا۔ کیونکہ سیدھے سادے طور پر، اس نے بنگالی ہندوؤں کے کمرشل، تجارتی اور پیشہ ورانہ مفادات کو شدید نقصان پہنچایا۔ تھوڑے سے انقلابیوں اور احیا پرستوں کی پشت پناہی کے ساتھ بپھرے ہوئے بھدر لوک اپنے خفیہ ایجنڈے کی نمائش کے لیے اپنی خصوصی حب الوطنی کو ایک ہتھیار کی طرح استعمال کرتے ہوئے لڑنے پر اتر آئے۔ بدقسمتی سے بپن چندر پال اور آربندو گھوش کے جنھوں نے 'بندے ماترم' کی تالیف کی تھی اور 1907 میں سورت تفرقے سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا تھا، ہندوانہ نیشنلزم نے نااتفاقی کے بیج بودیے۔ ہندو محاورے اور ہندو علامتوں کا استعمال جن کو مشہور مسلم مخالف ادیب بنکم چند بنرجی نے مقبول بنایا، بنگالی مسلمانوں کے لیے شاذ ہی پسندیدہ رہا۔

"اگر یہ معاملہ ہے" پردیپ نے زور دے کر کہا، "تو میں سودیشی کی تحریک کو آزادی کی ایک جدوجہد تسلیم کرنے سے انکار کروں گا"۔ عزیز نے اپنی عادت کے مطابق نہایت متوازن انداز میں کہا، 'کانگریس اپنے بنگال کے تجربے سے ناقابل تسخیر ہوکر نہیں نکلی، لیکن اس کے کچھ اہم افراد نے ایک عوامی جدوجہد کو منظم کرنے اور اس پر نظر رکھنے کا ایک ضروری تجربہ حاصل کرلیا۔ مگر سودیشی کی مسرت کے فوراً بعد سورت کا تفرقہ کانگریس کے لیے کوئی بہت اچھا شگون نہیں تھا۔ اس کی لیڈرشپ میں شخصیتوں کے ٹکراؤ اور لائحۂ عمل سے متعلق اخلاقیات کی وجہ سے اندر اندر پکتی ہوئی کشمکشوں نے قیادت میں باہمی نااتفاقیوں کو نمایاں کردیا۔ حدّ فاصل کھنچی، ان لوگوں کے درمیان جو سیماب وش سیاسی دنیا میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہتے تھے اور ان لوگوں کے درمیان جو عسکری رویّے کی وکالت کرتے تھے، دونوں گروہ، گوکھلے نے جنوری 1915 میں لکھا، برابر کے نہیں تھے۔ بدیسیوں کے ملک میں کھلے اور ڈھکے شدید جذبات تھے اور اس صورت حال نے پلڑے کو تِلک کے حق میں جھکا دیا۔ لیکن گوکھلے جو ایک معتدل آدمی تھے، چاہتے تھے کہ ان کے ہم وطنوں کو بدیسی تسلط سے ایک عبوری انتظام کی حیثیت سے مفاہمت و مصالحت کرلینا چاہیے۔ گوکھلے کو برطانوی

جمہوریت کے انصاف پر بھروسہ تھا۔

"انقلابیوں کے بارے میں ہم بہت کچھ سنتے ہیں"۔

"ہاں، پردیپ — سورت کے فوراً بعد انقلابی تحریک سب سے پہلے بنگال میں سامنے آئی اگرچہ بڑی تعداد میں دہشت گرد جماعتیں اس سے پہلے ہی متعدد علاقوں میں قائم ہوچکیں تھیں۔ 1908 میں مہاراشٹر میں ساورکر بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوچکے تھے، وہ 1921 تک جیل میں رہے۔ انڈیا ہاؤس گروپ کے مدن لال ڈھینگرہ نے، سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا John Morley کے سیاسی ایڈ۔ڈی۔ کیمپ Curzon Wyllie کو گولی مار دی۔ 1910 میں چاپیکر بھائیوں کی طرح ایک چت پاون برہمن اے کن ہیرے (A Kanhere) نے ناسک کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو گولی سے اڑا دیا۔ بنگال میں 1906 اور 1917 کے درمیان 82 قتلوں اور 121 افراد کو مجروح کرنے کی وارداتیں دہشت گرد سرگرمیوں ہی کا نتیجہ تھیں۔ 1908 کے اوائل میں مظفرپور میں بم کی واردات ہوئی اور اس کے بعد مانک تالا کی سازش۔ آربندوگھوش انقلابی سرگرمیوں میں بہت ملوث تھے۔ سوامی وویکانند کے چھوٹے بھائی بھوپندر ناتھ دتا، جگانتر گروپ کی انقلابی سازش میں آربندو کے اہم ساتھی تھے۔ 1918 کی سیڈیشن کمیٹی رپورٹ اس سلسلے کی مزید تفصیلات فراہم کرتی ہے۔

انقلابی تحریک کو اس وقت مزید توانائی ملی جب مارچ 1922 میں مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کو ملتوی کردیا۔ اس کے بہت سے سرگرم کارکن جیسے بھگت سنگھ اور سکھدیو وغیرہ، روس میں ہونے والے بالشوک انقلاب سے بہت متاثر تھے۔ امپیریلسٹ مخالف جذبات کو مہمیز لگانے کے لیے نوجوان بھارت سبھا اور ہندستان سوشلسٹ ریپبلکن آرمی ایسوسی ایشن بنی۔ انقلابی تحریکوں کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا ہوں مگر تم شاید کاکوری سازش کیس اور لاہور سازش کیس کے بارے میں کچھ جاننا چاہو۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان نام نہاد سازشوں میں ملوث مردوں اور عورتوں نے غیرمتزلزل جرأت اور ناقابل تسخیر عزم کا مظاہرہ کیا۔ ان لوگوں کے طریقوں کے بارے میں عوام میں لاکھ غلط فہمیاں ہوں ہم چندر شیکھر آزاد اور بھگ۔

سنگھ جیسے افراد پر فخر کرتے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں"، جگ موہن نے کہا، "یہ احساس گاندھی جی کا نہیں تھا"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان کے بعض ساتھیوں کو توقع تھی کہ 9 مارچ 1931 کو جب انھوں نے وائسرائے سے ملاقات کی تھی، وہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کو معافی دلادیں گے۔ مگر ہونا یہ نہیں تھا۔ وائسرائے نے کہا کہ بھگت سنگھ کی پھانسی، جس کی تاریخ 24 مارچ مقرر ہوئی تھی، ملتوی کرنا سیاسی اعتبار سے مناسب نہیں ہوگا۔

"مطلب یہ ہوا کہ کانگریس نے اس سلسلے میں کچھ بہت نہیں کیا"۔ جگ موہن نے کہا۔

مسئلہ یہ نہیں تھا۔ کانگریس کا موقف گنجلک تھا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ منعقدہ جولائی میں اپنے دو ممبروں بھگت سنگھ اور بی۔دت سے اظہار ہمدردی کی تجویز کو پیش کرنے کی اجازت دینے سے موتی لال نہرو کے انکار پر 1926 میں قائم ہونے والی نوجوان سبھا نے نکتہ چینی کی۔ انکار اس بنا پر تھا کہ ایسی تجویز کو پیش کرنے کی اجازت سے کانگریس کی عدم تشدد کی ریت کی خلاف ورزی ہوتی تھی۔ گاندھی جی نے 30 جولائی 1931 کے 'ہریجن' میں لکھا کہ بھگت سنگھ سے اتنی عقیدت نے بہت نقصان پہنچایا۔ انھوں نے تو حکومت سے سزائے موت کو معاف کرنے کی کراچی تجویز کو بھی پسند نہیں کیا تھا۔

اس مرحلے پر جگ موہن نے تجویز کیا کہ عزیز انتہا پسند اور اعتدال پسند کی تقسیم کے موضوع پر لوٹے۔

"صحیح ہے۔ اس تقسیم کو درسی کتابوں میں بڑے مبالغہ آمیز طور پر بیان کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کی حقیقت اتنی ضرور تھی کہ جو لوگ پارلیمانی سیاست کی طرف سے خوش گمان نہیں تھے انھوں نے تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ جیسے مہاراشٹر میں وی بی پھاڈکے، دامودر چھاپیکار اور حکومت کا تختہ پلٹنے کے لیے انڈر گراؤنڈ دہشت گردانہ سرگرمیاں۔ بہرحال اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے گروہوں کو اپنے تنازع کو طے

کرنے میں تقریباً ایک دہائی کا عرصہ لگ گیا۔ میں ایک اور اہم نکتے کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ احتجاجی سیاست نے اپنا دور مکمل کیا۔ 1911 میں ہارڈنگ کی تقسیم بنگال کو کالعدم قرار دینے کے بعد خصوصاً کانگریس اپنی زیادہ تر توانائی اور اپنے جذبے کو کھو چکی تھی۔

"اس سال"، پردیپ نے کہا، "دارالسلطنت کلکتے سے دہلی منتقل کردیا گیا تھا"۔

"ہاں، اور بڑے دھوم دھام سے۔ مگر میں کانگریس میں آنے والی تبدیلی کا ذکر کررہا ہوں۔

بنگال کے ایک سینیئر کانگریسی بھوپندر ناتھ باسو کو 1914 میں یہ دکھ تھا کہ کانگریس ایک زوال پذیر جماعت ہوتی جارہی ہے۔ یہ زوال پذیر تو نہیں تھی ہاں تفرقے کی شکار ضرور تھی۔ اعتدال پسند اور انتہا پسند جنھوں نے 1916 کی لکھنؤ کانگریس میں اپنی خود پسندی پر قدغن لگائی تھی۔ مانٹیگو جیمس فورڈ اصطلاحات (1918) پر انتہائی نااتفاقی کا اظہار کیا۔ لبرل افراد نے جن کی قیادت سری نواس شاستری اور تیج بہادر سپرو کررہے تھے۔ امپریل ڈھانچے میں خود اپنے ایجنڈے کی پیروی کی۔ بہرحال، لبرل افراد اور کانگریسی، نہرو نے لکھا، "دو الگ الگ دُنیاؤں میں رہ رہے تھے۔ مختلف زبانوں میں بات کررہے تھے اور ان کے خوابوں میں اگر انھوں نے (لبرل افراد نے) کبھی خواب دیکھے تھے کوئی چیز مشترک نہیں تھی"۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ تم یہ کہہ رہے ہو کہ کانگریس نے ایک ہمہ گیر تنظیم کی حیثیت سے ہر ایرے غیرے کو پناہ دی اور اسی وجہ سے مختلف ذاتوں، فرقوں اور مختلف علاقائی اور لسانی تعلقات کے لیے گنجائش پیدا کی۔

"جیتے رہو میرے یار"، عزیز نے پردیپ سے کہا۔

"شکریہ!"

"میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ کانگریس کی پہل اور سبقتوں کا مقصد ایک خفیہ

ایجنڈے کو آگے بڑھانا نہیں تھا بلکہ ان کا مطمحِ نظر ایک وسیع قومی اتحاد قائم کرنے کا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا، کیونکہ ایسی متعدد اور مختلف اکائیوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا جو کانگریس سے اپنی ضروریات کی تکمیل کی توقع رکھتی تھیں۔ لیکن، انگریزوں کے لیے تکلیف اور پریشانی کا سبب بننے کے باوجود اِس کے لیڈر ایک قومی محاذ کی تشکیل و قیام کی خاطر بھیڑ کو ساتھ رکھنے اور ان کے متنوع مفادات کی پرداخت کرنے میں کامیاب رہے۔ وہ لڑکھڑائے بھی اور پریشان بھی ہوئے۔ انھوں نے ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا اور برملا ایک دوسرے پر حملے بھی کیے مگر آخر میں ساتھ ہوگئے۔ ہر فریق اور ہر گروہ نے یہ محسوس کیا کہ کانگریس جو آہستہ آہستہ متنوع مصائب کی معروضی وضاحت کے مرکزی نکتے کی حیثیت سے ابھر رہی تھی وہ ان کے مقاصد کو پورا کرے گی اور مطلوبہ منازل کی طرف ان کو بڑھائے گی۔ نتیجتاً انھوں نے اپنے مطالبات کی طرف توجہ کرنے اور عوام کی نظروں میں جواز حاصل کرنے کے لیے حکومت پر خاصا دباؤ ڈالا۔ انھوں نے اپنے متزلزل اور نحیف اتحاد کو برقرار رکھا یہاں تک کہ سن 1919 نے ہندستان کے سیاسی منظرنامے پر ایک نئی شخصیت اور ایک بالکل مختلف شبیہ کے طلوع ہونے کی نوید سنائی۔ یہی وہ شخص تھا جس نے خواص کے ایک انبوہ کو ایک عوامی پارٹی میں بدل دیا۔

"جب ایک بار ساؤتھ افریقہ سے آئے ہوئے بیرسٹر موہن داس کرم چند گاندھی منظرنامے پر نمودار ہوئے تو اعتدال پسند اور انتہاپسند لوگ اِدھر اُدھر بھاگ بھاگ کر سر چھپانے لگے۔ ستمبر 1920 میں کلکتے میں ہونے والے خصوصی سیشن اور اسی سال ناگپور کانگریس کے اجلاس میں، مہاتما کی ذہین مداخلت نے ان لوگوں کا پتا بڑی خوبی سے کاٹ دیا۔ وہ تازہ ہوا کے ایک زبردست جھونکے کی طرح تھے، روشنی کی اس کرن کی طرح تھے جس نے اندھیروں کے دل چیر دیے ہوں، اس بگولے کی طرح تھے جس نے لوگوں کے سوچنے کے روایتی طریقوں کو اتھل پتھل کردیا ہو۔ وہ آسمان سے نہیں اترے تھے وہ تو ہندستان کے کروڑوں عوام کے اندر سے ابھرے تھے۔ ملک

میں بہت سی جگہوں پر انھیں طرح طرح کے معجزاتی واقعات سے جوڑا گیا اور سوراج سے بھی۔

"سوراج کا مطلب کیا ہے؟" پردیپ نے سوال کیا، "1909 میں 'ہند سوراج' میں انھوں نے لکھا تھا کہ ہندستانی، سوراج کی اصطلاح کو اس کی حقیقی اہمیت کو سمجھے بغیر استعمال کرتے ہیں؟"

"ہاں جناب، انھوں نے کہا تھا کہ حقیقی سوراج دراصل خود حکومتی (self-rule) اور خود ضابطگی (self-control) ہے اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ ستیہ گرہ سچائی اور محبت کی قوت ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ وہ اس اصطلاح کی کوئی واضح تعریف کریں تو انھوں نے کہا کہ اس اصطلاح کو کسی ایک لفظ سے نہیں سمجھایا جاسکتا ہے۔ بہرحال انھوں نے اس کا وہ مطلب بیان کرنا شروع کیا جو نیشنلسٹ تحریک کی ابتدا سے لیا جاتا رہا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق سوراج کے بنیادی معنی 'خود حکومتی' (Self-rule) تھے۔ انھوں نے سوراج کی تعریف یوں کی، ایک خود عائد کردہ منضبط حکومت۔ آزادی اور خودمختاری ایسی کوئی حدود نہیں رکھتی، اس کا مطلب اپنی خواہش اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی بھی ہوسکتی ہے۔ آزادی و خودمختاری، منفی تھی، اور سوراج ایک مثبت چیز۔ انھوں نے سوراج کی تاویل میں اِسے ایک مقدس لفظ قرار دیا۔ ایک ویدک شبد جس کا مطلب خودحکومتی، اور خود ضابطگی ہوتا ہے نہ کہ وہ آزادی جو ہر پابندی سے آزاد تمام حدود سے یکسر عاری ہو جیسا کہ آزادی سے عموماً سمجھا جاتا ہے۔

سیاست کی قلمرو میں اپنے سوچے سمجھے اور محتاط داخلے سے گاندھی جی نے اپنے معاصرین کو چونکا دیا۔ سوال یہ ہے کہ ان جیسا سیاسی ناآزمودہ کار اتنی جلدی اتنا بڑا اور اتنا اہم کیسے ہوگیا؟ جنوبی افریقہ کا میدانِ کارزار مختلف تھا، ہندستان کی سرزمین جدوجہد کے لیے مختلف تھی، گاندھی جی کے غیرمصنوعی اور کھرے طریقوں نے جن کو انھوں نے پہلے چمپارن میں اور بعد کو رولٹ ستیہ گرہ کے دوران استعمال کیا انتظامیہ میں خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ عام آدمی کے لیے، بہرحال صورت حال کے جمود میں

اتھل پتھل پیدا کرنے والا لیڈر ایسی مہارتوں کے ساتھ آگیا تھا جن کی عدم موجودگی کی وجہ سے تِلک اور اینی بسنٹ کی قیادت میں چلنے والی ہوم رول کی تحریک کچھ حاصل کرنے میں ناکام رہی تھی۔ بہرحال عوام کے لیے وہ مسیحا تھے، اپنے عہد کو پورا کرنے کے لیے آسمانوں سے اترے ایودھیا کے رام تھے۔ انھیں سیاست کے میدان میں ابھی بہت دن نہیں ہوئے تھے کہ بڑی تعداد میں عوام، زیادہ تر غریب کسان، پسماندہ اور افلاس زدہ مخلوق ضلع گورکھپور میں ان کے درشن کے لیے جمع ہوئی۔ ان کے درشن سے لوگوں کی اس دلچسپی نے ان کے مہاتما کے لقب کو مزید مستحکم کردیا۔ عقیدت مندی کا یہ احساس اس وقت صاف نظر آتا تھا جب 8/ فروری 1921 کو وہ گورکھپور گئے۔ ایک گورکھپوری تاجر نے کہا تھا:

> "ہم نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ گورکھپور جو سیاسی اعتبار سے اتنا بے جان تھا، وہ اچانک یوں جاگ جائے گا۔ گاندھی جی کے درشن کے لیے دو ڈھائی لاکھ لوگوں کا جمع ہوجانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مہاتما کے درشن کے لیے اتنا بڑا ہجوم اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا..... مگر کسی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ لوگوں کا یہ جم غفیر اندھی عقیدت سے سرشار بھیڑوں بکریوں کی طرح آیا اور خالی ہاتھ واپس گیا۔ آنکھ والا دیکھ سکتا ہے کہ گاندھی مہاتما کا درشن، بے کار نہیں گیا تھا، جنتا دلوں میں عقیدت لیے ہوئے آئی اور احساسات و نظریات لے کر واپس گئی۔ گرو گاندھی کا نام اب ضلع کے ہر ہر کونے میں پہنچ چکا تھا۔"

میں مزید اضافہ کروں گا اور وہ یہ کہ جب گاندھی جی نے یہ دعویٰ کیا کہ میرا سوراج غریب آدمی کا سوراج ہے اور خود اپنی شناخت غریبوں کے ساتھ کیے جانے پر زور دیا تو ان کی بات، ان کے خیال اور عمل کی ہم آہنگی اور استقلال کی بنا

پر صحیح مانی گئی

عزیز اپنی گفتگو میں عروج پر تھا۔

بعد کو جب، ضلع سورت میں باردولی تعلقہ کے 137 گاؤں 1922 اور 1928 کی کرایہ نہ ادا کرنے کی مہموں کی جائے وقوع بنے تو مشاہدین نے دیکھا کہ گاندھی جی نے جن گاوؤں کا دورہ کیا وہاں وہ ایک ہیرو، ایک رشی منی اور ایک درویش کی طرح پوجے گئے۔ انگریز سوشلسٹ ایچ این بریلفورڈ نے جب چالیس پچاس دیہاتوں کے ایک گروپ سے پوچھا کہ انھوں نے خطرات اور دشواریوں کا مقابلہ کیوں کیا تو عورتوں نے علی الاعلان یہ کہا کہ وہ اس وقت تک کوئی ٹیکس ادا نہیں کریں گی جب تک کہ ولبھ بھائی پٹیل ان سے ٹیکس دینے کے لیے نہیں کہیں گے۔ اس کے بعد مردوں نے آہستہ آہستہ اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ٹیکس اس لیے ادا نہیں کریں گے کیونکہ یہ غیر منصفانہ ہیں۔ انھوں نے صورت حال کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ قیمتوں کی موجودہ شرح کے تحت مالک کاشتکار کی حیثیت سے وہ ایک مزدور کی یومیہ اجرت سے بھی کم حاصل کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے ختم ہونے پر ان لوگوں نے کہا کہ وہ یہ سب سوراج حاصل کرنے کے لیے کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کھدرپوش نے رام دھن کو الاپنا شروع کردیا۔

رگھوپتی راگھو راجا رام
سب کو سمتی دے بھگوان

"سبحان اللہ! تم نے تو گویا قومی تحریک میں جان ڈال دی" اس کی جادو بیانی سے متاثر ہوتے ہوئے پردیپ نے کہا تم کتاب کیوں نہیں لکھتے ہو؟

کتاب؟ عزیز نے استعجاب کے ساتھ کہا "رولی بکس کے مالک پرمود کپور مجھ سے کتاب لکھنے کے لیے بار بار کہہ رہے ہیں، میں باوجود کوشش کے قلم کاغذ پر چلا ہی نہیں پاتا ہوں۔"

"عزیز بھائی، تم ابھی تک بدلے بالکل نہیں ہو" جگ موہن نے کہا، سوائے اس کے کہ اب تمھارے یہاں ایک عزم اور ایک شدت ضرور ظاہر ہوتی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ تم یونیورسٹی میں ایک لائقِ اعتراف حیثیت کے مالک ہو۔"

"مجھ میں شدت ہے؟ میں نہیں سمجھتا" عزیز نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تنقید نہیں کر رہا ہوں، میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ تم ماشاء اللہ انتہائی کامیاب اور کامران معلوم ہوتے ہو۔"

"جب عزیز بھائی نے کرزن کی حماقت اور اس کی وائسرائلٹی کے بارے میں گوکھلے کی رائے کی بات کہی تو پردیپ نے کہا "مجھے چرچل کے بارے میں بیرسٹر ویب کی بات یاد آتی ہے جس کا اِطلاق کرزن پر بھی ہوتا ہے۔ ویب کے مطابق جنگ کے زمانے کا یہ عظیم لیڈر، مضطرب، خودپسند، خردماغ، بے مغز و بے تہہ اور رجعت پسند تھا۔ پھر بھی عزیز بھائی مہربانی کرکے ہمیں یہ بتاؤ کہ آیا حلقۂ مورخین قومی تحریک سے متعلق تمھارے خیال سے اتفاق کرتا ہے؟

عزیز نے کرسی پر سیدھے بیٹھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ "اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ مؤسیسین کی منشا سے نامانوس کچھ اصولی سہل پسندیوں کو چھوڑ کر، ہندستانی نیشنلزم کے مسائل سے، فیشن ایبل منتخب روزگار متبادلوں کے مقابلے میں مارکسی رویہ زیادہ مفید اور زیادہ مناسب ہے۔

عزیز نے تاریخ نویسی کے مختلف مکاتب کی نظریاتی اساس اور اُن کے نظریاتی مطمحِ نظر پر تفصیلی گفتگو کی۔ دیسی ہندستانی سرمایہ دارانہ صنعت کے عروج و ارتقا سے کانگریس کے تعلق پر رجنی پام دت کے بصیرت افروز خیالات پر روشنی ڈالی، اس نے ٹیکس کے بوجھ اور دولت و سرمائے کے نکاس سے متعلق پرانے نیشنلسٹوں کی تحریروں کی روشنی میں ترمیم شدہ نقطۂ نظر کا ذکر کیا۔ اس نے بتایا کہ ان کا نقطۂ نظر سرمایہ دارانہ تھا مگر یہ اس لیے نہیں تھا کہ یہ لوگ سرمایہ دار طبقے کی نمائندگی کرتے

تھے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ سرمایہ داری کو فروغ و نشوونما کا حقیقی راستہ تصور کرتے تھے۔ انھوں نے صنعتی سرمایہ دار طبقے کی نمائندگی صرف اس لحاظ سے کی کہ ان کی اقتصادی سمجھ اور پروگرام اُن حدود سے باہر نہیں گئے جو سرمایہ دارانہ خطوط پر ہونے والی صنعت نے عملاً عائد کر رکھی تھیں اور پھر چونکہ یہ لوگ بحیثیت مجموعی اقتصادی نشوونما کے کٹر حامی تھے اس لیے اجمالی طور پر ان کا رویہ قومی تھا۔ اقتصادی نیشنلزم اور کیا ہے، یہی تو ہے۔

"اس قسم کی رومانویت سے کام نہیں چلے گا" یہ الفاظ تھے عارف رضوی کے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ اقتصادیات میں لکچرر ہیں۔

"تم ٹھیک ہوسکتے ہو" عزیز نے اتفاق کیا "علی گڑھ کی کیا خبریں ہیں؟ میں نے سنا ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد وہاں کے حالات خاصے خراب ہیں۔"

"آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہوسکتا ہے" عارف نے فوراً کہا "مگر ذاکر حسین کی موجودگی، آزاد کی توجہ اور پنڈت جی کی ہمارے ادارے سے محبت نے بہت سے طوفانوں کا مقابلہ کرنے میں ہماری مدد کی ہے۔ اس وقت حقیقی اور اہم مسئلہ ہے یونیورسٹی کا اچھے استادوں سے خالی ہونا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ پاکستان چلے گئے۔"

"پروفیسر حبیب، رشید احمد صدیقی اور ڈاکٹر ہادی حسن، یہ لوگ ہیں نا؟

تمھارے اعتراض کا جہاں تک سوال ہے"، عزیز نے بحث کو پھر سے شروع کرتے ہوئے کہا، "کانگریسی لیڈر ایک طرح کی بے ربطی کے شکار تھے، ان کے انفرادی معاشی حالات اور ہندستانی افلاس کے اسباب کی ان کی ذہنی تفہیم میں فرق تھا، وہ جانتے تھے کہ برطانیہ ہندستان سے سرمایہ کھسوٹ رہا ہے، ان کو یہ بھی یقین تھا کہ برطانوی پالیسیاں ہندستان کو صنعت سے دور رکھے ہوئے ہیں، مگر انھوں نے پھر بھی خود اپنی زندگیوں میں کافی یا خطیر آمدنیاں کیں اور اعلیٰ کامیابیوں اور کامرانیوں کی تکمیل سے لطف اندوز ہوئے۔ وہ بھوک اور فاقے کی دہلیز پر کھڑے لاکھوں

کروڑوں کاشتکاروں کی بدحالی سے ہمدردی اور ان کی ابتری کے احساس کو اپنا نہ سکے۔

دوسرا مسئلہ تھا جواز کی تمنا میں ہندو علامتوں اور ہندو روایتوں کا استعمال۔ تِلک، آربندو گھوش اور لالہ لاجپت رائے کا اصرار تھا کہ ہندو عوام کو، صرف قومی تاریخی قصے کہانیوں کو مقبول بناکر اور ہندو تہوار مناکر ہی مہمیز لگائی جاسکتی ہے۔ انھیں مسلمانوں کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ تِلک نے گنپتی کا تہوار شروع کیا، شیواجی کی یاد کو تازہ کر کے گزری ہوئی مراٹھا عظمت کی کہانیوں کو دہرایا۔ ان کی نیت، جمود کی شکار توانائیوں کو بیدار کرنا، فعال کرنا راستے پر لگانا ہوسکتی ہے مگر ان کے اس جوش و خروش کا نتیجہ مہاراشٹر کے شہری سماج کے فرقہ وارانہ اور متعصب خطوط پر اتحاد و یکجہتی کی شکل میں نکلا۔ تقریباً اسی وقت ان کی مذہبی شدت کی وجہ سے سودیشی کی تحریک میں مسلمانوں کی دلچسپی کم ہوگئی۔"

"کانگریس نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا؟ کیا یہ لوگوں کو اکٹھا اور متحد کرنے کے ناقص طریقے کا معاملہ نہیں ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

"پارٹی کے اتحاد اور امیر اور بارسوخ سرپرستوں کے تعاون کو بدستور رکھنے کے لیے" عزیز نے جواب دیا۔ "خود اپنے صوبے ہی کو دیکھو، کانگریس کی تنظیمی سرگرمیوں کا اک اہم عنصر، دیہی اور شہری غریبوں کو اپیل کرنے والے پروگراموں اور نعروں کی عدم موجودگی اور زرعی مسائل کی طرف سے گومگو کا رویہ تھا۔ اِس کا پرتو اُس زبان، اُس پروپیگنڈے، اُن اپیلوں میں دیکھا جاسکتا تھا جو کانگریسی لیڈروں کی طرف سے آتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریک کی سماجی گہرائی معدوم ہوتی گئی، اگرچہ مہم کی تنظیم اس کی قوت اور اس کا پیمانہ وسیع ہوگیا۔"

"یہ بات سمجھ میں آتی ہے"، پردیپ نے اظہار کیا، "تم نے پہلے ذکر کیا تھا کہ 1887-88 میں کانگریس نے اُن مسائل پر گفتگو نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا جن کی متفقہ یا نیم متفقہ طور پر ہندوؤں یا مسلمانوں نے مخالفت کی تھی۔ نتیجتاً کانگریس مسلم ڈیلیگوں کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے سامنے جھک گئی اور اس نے Punjab Alienation Bill پر غور نہیں کیا۔"

"میں نے اس بات کا تذکرہ بھی کیا ہوگا کہ کانگریس نے سماجی مسائل پر مباحثے سے احتراز کیا۔ اس کے اکثر بڑے لیڈروں نے دادا بھائی نوروجی کی اس رائے سے اتفاق کیا کہ کانگریس سیاسی تمناؤں کو پیش کرنے کے لیے ایک سیاسی تنظیم تھی اور اس کا کام سماجی اصلاحات پر غور کرنا نہیں تھا۔"

"تب تو کیا کانگریس سماج کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کے مفادات کے لیے کام کرنے والی ایک چنیدہ جماعت نہیں تھی؟" پردیپ نے پوچھا۔

"تمھاری اس بات میں دم ہے" عزیز نے کہا "انڈین نیشنلزم اور سیاست میں اعلیٰ اور ماتحت (elite and subaltern) حلقہ ہائے اثر کے تفاعل (interaction) اور بقائے باہم کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی جبلی اور غیر تاریخی وحدت پرستانہ (monism) خصوصیات کی تردید پر مبنی ایک متبادل راہ فراہم کرنے کی عالمانہ کوشش کی جارہی ہے۔ دلائل سیدھے سادے ہیں۔ نیشنلزم کی historiography پر elitism کا غلبہ رہا ہے۔ نوآبادیاتی elitism اور بورژوازی نیشنلسٹ elitism کی ان دونوں اقسام کا دعویٰ ہے کہ قومی شعور کا فروغ اور ہندستانی نیشنلزم کی تشکیل غالب طور پر elite کامرانیاں تھیں۔ اس لیے نیشنلزم کی تاریخ، ہندستانی elite کی روحانی سوانح کی طرح لکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نیشنلزم کی تشکیل اور اس کے فروغ و نشوونما میں elite سے الگ عوام کی خود اپنی دین نظرانداز ہوگئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ subaltern طبقات اور گروہوں کے اس کردار اور اِن کی اُن کارگزاریوں کی تحقیق و تفتیش کی جائے جو انھوں نے خودمختار قلمرو میں کیں۔"

پردیپ نے جو تاریخ سے متعلق مباحثوں کے مختلف پہلوؤں اور ان کی نزاکتوں سے واقف تھا ایسا محسوس کیا کہ اس کی نظروں کے سامنے سے قومی تحریک کے مناظر یکے بعد دیگرے گزرتے جارہے ہیں۔

"تم نے کتنے بہت سارے پیچیدہ موضوعات کو سمجھنا ہمارے لیے کتنا آسان کردیا، ہم تو تمھارے ذہن کی بیداری اور زرخیزی کے قائل ہوگئے۔"

"اس وقت تک تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا" جگ موہن نے اضافہ کیا "کہ ہمارے گرو اپنے مزاج کے اعتبار سے معروضی طور پر بیان کی ہوئی چیزوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

"حضور، ایک منٹ توقف" عزیز نے جگ موہن کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے مداخلت کی "علاقائی اور مقامی تناظر، ایک مختلف بلکہ حقیقتاً ایک زیادہ پیچیدہ تناظر پیش کرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ عارف اتفاق کریں گے۔"

سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے عارف نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہاں میں اتفاق کرتا ہوں۔ بڑے اور چھوٹے اداروں کے مابین رابطوں کے مواقع کی ہماری تفہیم کو علاقائی مطالعات آسان بناتے ہیں اور اس طرح سیاسی تبدیلیوں کے عمل اور ان کے پیچھے کام کرنے والی سیاست کی ہماری انڈر اسٹینڈنگ میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

برطانوی کلونیل تاریخ اور ہندستانی تاریخ بڑے اور چھوٹے سماجی و سیاسی ڈھانچوں کے درمیان باہمی روابط کے اتنے مقامات رکھتی ہے کہ انھیں صورت حال کو اچھی طرح سمجھنے میں ہماری مدد کرنا چاہیے۔

اس اہم مقام سے عزیز، 1880 کے احتجاج میں شامل مختلف گروہوں کے درمیان نازک تعلقات کا جائزہ لینے کے لیے 1887 میں ہونے والے کانگریس کے مدراس سیشن کی طرف رجوع ہوا۔ سرگرم کارکنوں میں اس نے پی آنند چارلو، ایس سُبرامنیا آیئر، جی سبرامنیا آیئر، سالیم راماسوامی مدلیار، ایم ویر راگھون اچاری اور کچھ دوسرے لوگوں کے نام گنوائے۔ ان میں سے ہر ایک مدراس شہر کے مغربی تعلیم یافتہ افراد کے کسی نہ کسی گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس سیشن میں ایک اور قابل شناخت مفاد مُفصّل کی کاروباری قوتوں کا تھا۔ اس میں کروڑپتی صنعت کار، بیلاری کے سبھاپتی مدلیار بھی شامل تھے جو اپنی مقدمہ بازی اور سماجی کاموں کے ذریعے شہر سے قریبی رابطے رکھتے تھے۔ فہرست میں مدراس شہر کے رسوخ و اختیار والے بڑے ہندستانی تاجر

افراد اور صوبے کے کئی متمول ترین زمیندار اور کمباکونم کے شنکر آچاریہ اور دھرم پورم کے پنڈارا سانڈھی جیسے مذہبی رہنما بھی شامل تھے۔

"بہت دلچسپ" پردیپ نے کہا۔

جنوبی ہندستان کے اکثر مسلمان معززین نے مدراس سیشن کی حمایت کی۔ 67 مسلمانوں نے اس میں شرکت کی، جن میں مدراس شہر کی بادشاہ کی ممتاز ایرانی فیملی اور تنجور کے کانگریسی ایجنٹ نیگاپٹنم کے مارائیکر مسلمان بھی شامل تھے۔ فرقہ وارانہ تقسیم سے، جس نے بعد کو صوبائی اور قومی سیاست کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا، 1880 میں بھی کانگریس اتنی ہی غیر متعلق تھی جتنا کہ وہ مقامی سیاست کے اکثر پہلوؤں سے ہمیشہ ہمیشہ غیر متعلق رہی تھی۔"

"very interesting" اپنے دوست کی حمایت کرتے ہوئے جگ موہن نے دہرایا۔

1887 کی مدراس کانگریس اس پریسیڈنسی کا سیاسی نقشہ فراہم کرتی ہے جس میں مقامی سیاسی حلقہ ہائے انتخاب کی حدود کھنچی ہوئی تھیں اور وہ لکیریں بھی دکھائی گئی تھیں جو ان حلقوں کو راجدھانی سے جوڑتی تھیں۔ بڑھتی ہوئی سرکاری داخلت کے خلاف کانگریس نے صوبے کے اکثر اہم سیاسی عناصر کی نمائندگی کی۔ چونکہ حقیقتاً ہر دیسی سیاسی قوت نے حکومت کے کچوکے محسوس کیے تھے اس لیے ہر اہم سیاسی عنصر نے کانگریس کے مطالبات کی حمایت کی۔

یہ یاد رہے کہ یہ خیالات دوسرے لوگوں کی تخلیقات سے اخذ کیے ہیں، اس لیے میں مدراس پریسیڈنسی کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا تم اسپین کی خانہ جنگی کے بارے میں جانتے ہو۔

"اس ستائش کا شکریہ" عارف نے کہا "کون کہتا ہے کہ ہم نے جنرل فرانکو کے بارے میں نہیں سنا ہے؟ کیا پنڈت جی نے اسپینش سول وار پر رائے زنی نہیں کی ہے؟"

"ہاں" پردیپ بول پڑا "23/جون 1838 کو نہرو نے کہا تھا کہ گاندھی جی اور کانگریس ایک ریپبلکن اسپین کی حمایت کرتے تھے۔ 12-10/ مارچ کو منعقد ہونے والے تری پوری سیشن میں کانگریس نے برطانوی خارجہ پالیسی کو نامنظور کردیا جس کا نتیجہ اسپین کی حکومت کو تسلیم کرنے کی شکل میں نکلا تھا۔

"اب جب تم نے نہرو کا ذکر کیا ہے تو آؤ ہم اب الہ آباد چلیں۔ پنڈت جی کے وطن۔ یہاں کانگریس بہت سے مقامی لیڈروں کے لیے بنیادی طور پر ایک ضمنی تنظیم تھی۔ اس سے ان کا تعلق مقامی اور برائے نام کل ہند تنظیم اور تمناؤں اور خواہشوں سے تھا اور انتہائی محدود مقامی اور فریقی مقاصد سے تھا جو نیچی سطح کی سیاست سے لیے گئے تھے اور جو چیز تمھیں بھولنا نہیں چاہیے وہ ہے سرپرست اور ماتحت کے باہمی رشتے کی توانائی اور اس سے منسلک سیاسی رشتوں کی دوسری اقسام کی کمزوری۔ الہ آباد میں سب سے زیادہ اثر و اختیار رکھنے والے لوگ تھے امیر ساہوکار اور معمولی تاجر۔ ان کے آسامیوں میں ملّا، پنڈت، پادری، وکلاء اور دوسرے لوگ تھے جو خاندانوں میں رسوم و رواج اور ان کی سماجی و سیاسی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے کام کرتے تھے۔ ان کے علاوہ اخبار نویس اور صاحب علم ہوتے تھے جو اپنے آپ کو تذکرہ نویسوں اور مشتہری کا کام کرنے والوں کی حیثیت سے شہر کے بڑے بڑے اور اثر و اختیار رکھنے والوں سے وابستگی رکھتے تھے۔ کبھی کبھی اس ربط و ضبط کے پیچھے مذہبی اور سیاسی منصوبوں میں اعانت حاصل کرنے کی توقعات بھی ہوتی تھیں۔"

عزیز نے ایش ٹرے کی تلاش میں کتابوں اور اخباروں کے ایک ڈھیر کو ایک طرف کھسکاتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

"مجموعی طور پر، اَپرانڈیا میں ابتدائی نیشنلزم کو، نوکر شاہی میں تبدیلیوں کی مخالفت میں متحرک گورنمنٹ سروس میں خودغرضانہ مفادات کی ہلکی سی آمیزش کی حیثیت سے دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں پر میں ایک انتباہ بھی کرتا چلوں۔ ان وسیع تبدیلیوں کو اگر متعین کر بھی لیا جائے یہ پھر بھی ثقافتی تاریخ کے عام اصولوں کے مقابلے میں، اہم مقامی گروہوں کے خصوصی سماجی رویوں کی اصطلاح میں ہوں گی۔

"تم میں ایک کو جس نے کلکتہ میں کچھ وقت گزارا ہے، میونسپل سیاست میں امپریل مفادات اور نیشنلسٹ ولولوں کے مابین بنیادی اختلاف کے بارے میں جاننے کی خواہش ہوگی" عزیز نے جگ موہن کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ یورپین اور دیسی مفادات کا اختلاف، انڈین نیشنلزم کی نمود اور فروغ کی توضیح میں مرکزی عنصر ہے۔ ایک بار جب اس کے نظریات اور اس کی تنظیم راج کی راجدھانی میں طے ہوگئی تو پھر اس نے دوسرے شہروں اور بستیوں پر اثرانداز ہونا شروع کیا۔ اگرچہ ہر شہر اور بستی میں تحریک کو عموماً مقامی اتحاد اور مقامی مخالفتوں نے شکل دی۔"

جگ موہن نے سوال کیا "آخر کلکتے کو ہندستان کی بوقلمونی اور تنوع کا نمونہ کیوں سمجھا جاتا ہے؟ ہارڈنگ نے 1911 میں دارالسلطنت دہلی میں کیوں منتقل کیا؟"

"مجھے نہیں معلوم" عزیز نے اس کے سوال سے کسی قدر صَرف نظر کرتے ہوئے کہا "چلو ہم وقت کے پھیلاؤ کو پُر کریں اور ناگپور چلیں۔ سنٹرل پراونس اور برار کی راجدھانی۔ یاد رہے کہ یہی وہ شہر ہے جہاں 1877 میں پارسی تاجر جمشید جی ٹاٹا نے Empress Mills قائم کیا تھا۔ صوبائی حکومت یہیں تھی، صوبے کے ممتاز تعلیمی ادارے (ہسلوپ اور موریس کالج) یہیں تھے، بڑے اخبار، مراٹھی ہفتہ وار، مہاراشٹر اور ایک انگریزی روزنامہ 'ہت واد' بھی یہیں سے نکلتے تھے۔ اپنے سنتروں کے لیے مشہور اسی ناگپور میں دسمبر 1920 میں ایک تاریخی اجتماع ہوا تھا۔

عزیز نے گاندھی کے بارے میں مزید تفصیلات فراہم کیں۔

مہاتما 19/دسمبر کو ناگپور پہنچے یہاں ان کا سامنا دس ہزار کے ایک مجمعے سے ہوا۔ انھوں نے طالب علموں، عورتوں اور آل انڈیا ویورس کانفرنس کو خطاب کیا۔ پھر انھوں نے این سی کیلکر کی قیادت میں جمع ہونے والے تِلک کے حامیوں کو الگ تھلگ کیا اور کانگریس سیشن کے لیے اپنے لوگوں کو جمع کیا۔ یہ واقعہ اہم اس لیے ہے کہ اس نے عدم تعاون کے ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا، کانگریس کے اندر قوت و اقتدار کے توازن کو بدلا اور گاندھی جی کی سیاسی آمد کو مستحکم کیا۔ سنٹرل پروانس کے چیف کمشنر نے تمام سیاسی لیڈروں اور عام حامیوں پر گاندھی جی کے اثر و رسوخ کے

یکساں غلبے کا ذکر کیا ہے۔ وہ بغیر کسی ترمیم و تنسیخ کے اپنی طے کی ہوئی پالیسی کو لے کر چلنے والے اور وقت کے آدمی تھے۔ ناگپور کے اعتدال پسندوں کی کسی نے نہ سنی، جی ایس کھاپردے اور بی ایس مونجے کی قیادت میں انتہاپسند مخالفین ایک کنارے کیے گئے۔ مدن موہن مالویہ کی سعی بے ثمر رہی، جناح کا کوئی اثر نہ ہوا، لاجپت رائے ڈگمگائے اور پھر خاموش ہو گئے۔

چمپارن میں اپنی ابتدائی کھوج اور اپنے تجربات کے بعد سے انھوں نے کانگریس کی تاریخ پر اپنا نشان ثبت کرنے کے لیے ایک طویل مسافت طے کی۔ رولٹ بل کے خلاف ان کی ستیہ گرہ کامیاب تھی، بالکل اسی طرح جس طرح اپنے عدم تعاون کے پروگرام کو طاقتور علاقائی لیڈروں اور گروہوں سے منوانے میں ان کی پرعزم کوششیں کامیاب ہوئی تھیں۔ یہاں پر میں یہ بھی بتا دوں کہ جہاں جہاں ستیہ گرہ ہوئی تھی وہاں وہاں مہینوں سے بارود سوکھ رہی تھی، گاندھی جی کی مہم نے چنگاری کا کام کیا اور آگ لگ گئی۔ بنیادی اشیا کی قیمتوں میں اضافے کے علاوہ انفلوئنزا کی وبا نے لاکھوں لوگوں کی جانیں لے لیں۔ بامبے مِلس میں پہلی بڑی اسٹرائک 19-1918 میں ہوئی، دوسرے الفاظ میں رولٹ ایکٹ کی پیدا کی ہوئی بے اطمینانی بہت سے ان مصائب کی کسوٹی بن گئی جو بصورت دیگر طاق نسیاں کی زینت بن جاتے۔

پردیپ کو جھنجھلاہٹ تھی، جگ موہن بے چین تھا، انھیں عزیز بھائی کے بیان میں کوئی بات غائب محسوس ہو رہی تھی۔

"ہم اس وقت کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں"؟ پردیپ نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "رولٹ ستیہ گرہ کیا تھی؟" اس نے ایک گہری سانس لی، "ہم نے عدم تعاون کے بارے میں کچھ نہیں سنا ہے۔"

عزیز کے ماتھے پر بھی شکن پڑی، "رولٹ کمیٹی نے" اس نے جواب دیا "حکومت کو انقلابی سرگرمیوں کی سرکوبی کرنے کے لیے من مانی گرفتاریاں کرنے اور فوری سزائیں دینے کا اختیار دے دیا۔ چنانچہ فروری 1919 میں امپیریل لیجسلیٹیو

کاؤنسل میں ایک بل پیش ہوا اور اسمبلی کے ہندستانی اراکین کی شدید مخالفت کے باوجود پاس ہوگیا۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ شروع کرنے کے اپنے فیصلے سے گاندھی جی نے وائسرائے کو 24/ فروری کو مطلع کیا۔ ستیہ گرہ کی مہم انھوں نے لکھا، "سیاست میں عظیم تبدیلیاں لانے اور اخلاقی قوت کو اس کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کی کوشش ہے"۔ دو دن بعد اپنے ہم وطنوں سے اس میں شامل ہونے کے لیے کہا گیا۔ 6/ اپریل کو سارے ہندستان نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، تمام شہروں اور گاؤوں نے مکمل ہڑتال کی۔

حکومت بہرحال گاندھی کو لائحہ عمل طے کرنے کی اجازت دینے والی نہیں تھی۔ 13/اپریل 1919 کو گولڈن ٹیمپل کے شہر امرتسر میں لیفٹیننٹ گورنر مائیکل ڈائر کے استبدادی اقدام کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے نہتھے لوگوں پر جنرل آر ای جی ڈائر نے اپنے فوجیوں کو گولی چلانے کا حکم دیا۔ سرکاری تخمینے کے مطابق مرنے والوں کی تعداد 379 تھی اور زخمی ہونے والوں کی تعداد 1337 تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ ملک کی بے حرمتی ہوئی تھی، جلیان والا باغ نے سارے ملک میں ایک آگ لگا دی۔ ٹیگور نے اپنے نائٹ ہڈ کے خطاب کو واپس کردیا۔ ایڈوِن مونٹیگو نے امرتسر قتل عام کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی بنائی، کانگریس نے بھی ایک ایسی ہی کمیٹی مقرر کی۔ پارلیمنٹ میں اکثریت نے ڈائر کے حق میں ووٹ دیا۔ اس سے یکجہتی کے اظہار کے طور پر چندے کی ایک بڑی مہم چلائی گئی۔ ہنٹر کمیشن کے سامنے گواہی دیتے ہوئے ڈائر نے کہا:

سوال: جب بارہ بج کر چالیس منٹ پر اس سوچی سمجھی میٹنگ کی تمھیں خبر ملی، تو تم نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ اگر جلسہ ہوا تو تم وہاں جاکر گولی چلاؤ گے؟

جواب: جب پہلی دفعہ میں نے سنا کہ وہ لوگ آرہے ہیں اور اکٹھا ہورہے ہیں تو پہلے تو مجھے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ واقعی آرہے ہیں، لیکن اگر وہ میرے حکم کی خلاف ورزی کرنے آرہے تھے اور اس ساری کارروائی کے باوجود جو میں نے اس صبح کی تھی وہ جلسہ کرنے والے تھے تو میں نے طے کرلیا تھا

کہ میں فوجی صورت حال کو بچانے کے لیے فوراً گولی چلاؤں گا۔ وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں ذرا بھی توقف نہیں کرنا چاہیے۔ اگر میں تاخیر کرتا تو میں کورٹ مارشل کی سزا کا مستحق قرار پاتا۔

سوال: فرض کرلو کہ راستہ ایسا ہوتا کہ مسلح گاڑیاں وہاں تک جاسکتیں تو کیا تم مشین گنوں سے فائرنگ کرتے؟

جواب: میرا خیال ہے، غالباً ہاں۔

سوال: اس صورت میں مجروحین و مہلوکین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی؟

جواب: جی ہاں

سوال: اور تم نے مشین گنوں سے فائرنگ صرف اس لیے نہیں کی کہ وہ وہاں پہنچ نہیں سکیں؟

جواب: میں جواب دے چکا ہوں۔ میں نے کہا ہے کہ اگر مشین گنیں وہاں ہوتیں تو امکان اسی کا ہے کہ میں نے اُن سے فائر کیا ہوتا۔

سوال: سیدھے مشین گنوں سے؟

جواب: مشین گنوں سے

سوال: تم نے اپنی رپورٹ میں جو کچھ لکھا ہے اسے دیکھ کر میرا عام تاثر یہی ہے کہ اس ایکشن کو لینے میں تمھارا اصل مقصد خوف و دہشت پیدا کرنا تھا؟ یہی تم کہتے ہو، یہ مجمعے کو ناخوش کرنے کا سوال نہیں تھا بلکہ اُن پر ایک اخلاقی اثر ڈالنا تھا۔

جواب: اگر انھوں نے میرے احکامات کی خلاف ورزی کی تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں قانون کی اعلانیہ نافرمانی تھی، وہاں اس سب کے پیچھے میرے تصور سے کہیں زیادہ سنجیدہ بات تھی۔ یہ لوگ باغی تھے اور میں ان پر پھول نہیں برسا سکتا تھا۔ اگر انھوں نے حکم عدولی کی تو وہ مجھ سے لڑنے آئے

تھے اور مجھے انھیں سبق سکھانا تھا۔

سوال : میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایکشن لینے میں تمھارا مقصد خوف و دہشت پیدا کرنا تھا؟

جواب : آپ اسے جو چاہے نام دیجیے، مجھے انھیں سزا دینا تھی۔ فوجی نقطہ نظر سے میرا مقصد وسیع پیمانے پر ایک عام اثر ڈالنا تھا۔

سوال : خوف و دہشت صرف امرتسر کے شہر میں نہیں بلکہ پورے پنجاب میں؟

جواب : جی ہاں، سارے پنجاب میں، میں ان کے حوصلوں کو پست کرنا چاہتا تھا۔ باغیوں کے حوصلوں کو۔

"کیا یہ سب" عارف نے دریافت کیا "کلونیل سمجھ کی نمائندگی کرتا ہے؟

"میرا گمان یہی ہے" عزیز نے جواب دیا۔

"کیا اب ہم عدم تعاون کی تحریک پر بات کریں گے؟

"کیوں نہیں اس عوامی شورش و بے اطمینانی کے بارے میں تم پنجاب کی غلطیوں اور خلافت کے معاملے میں مسلمانوں کی تشویش کو ذہن میں رکھے بغیر سوچ بھی نہیں سکتے ہو۔ ترکی کا خلیفہ رسول کا وائسرائے اور مقدس مقامات کا محافظ، یہی وجہ ہے کہ ہر بار جب ترکی کسی مصیبت میں پھنسا، مسلم دانشوروں کے ایک حلقے نے اس کی خیر و عافیت کی دعائیں مانگیں۔ یہی کچھ 19-1918 میں ہوا جب پہلی عالمی جنگ میں ترکی کی خوب خبر لی گئی تھی اور وہ خاصا مجروح ہوا تھا۔ مارچ 1919 میں ایک خلافت کمیٹی قائم کی گئی، ساتھ ہی ملک بھر میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہندستان، بحیثیت مجموعی ان کی اس حق بجانب جدوجہد میں ان کے ساتھ ہے۔ ان کے نزدیک خلافت کا سوال اہم ترین تھا۔ رولٹ ایکٹ کی منسوخی سے بھی زیادہ بڑا اور اہم کیوں کہ یہ لاکھوں مسلمانوں کے مذہبی احساسات پر اثرانداز تھا۔ 14/ مئی 1920 کو شائع ہونے والی امن کی شرائط ان کی شرکت پر منحصر تھیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ مسلمانوں کو لگائے گئے زخموں کو بھرنے کا واحد اور موثر علاج

عدم تعاون ہے۔ ایک معتبر ہندو کی حیثیت سے انھیں اس آزمائش کے موقع پر ان کے ساتھ کھڑا ہونا تھا۔"

جگ موہن جذبات سے عاری بیٹھا رہا مگر پردیپ نے حیرت کا اظہار کیا "یہ حیرت ناک ہے، ایک سیکولر تنظیم کا ایک قومی لیڈر ایسا کیوں کر سکتا ہے؟ میں نے پان اسلامزم اور جمال الدین افغانی کے بارے میں سنا ہے۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روسی گھس پیٹھ سے امپیریل مفادات کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں کی وفاداری کو یقینی بنانے کے لیے برطانیہ نے 1857 میں ترکی دوست جذبات کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ میرا سوال یہ ہے کہ ترکی ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے یا نہیں، میرے مسلمان دوستوں کے لیے کیا یہ واقعی اہم تھا؟ میں محسوس کرتا ہوں کہ اسلامیت پسندوں نے پان اسلامک جوش و خروش کو دانستہ ہوا دی اور گاندھی جی ان کی اس چال کو سمجھنے سے قاصر رہے۔

اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے عزیز نے کہا "ہاں پردیپ، کانگریس کے جلسوں میں ایسے مشکوک شبہات بڑے پیانے پر ظاہر کیے گئے، مگر گاندھی جی نے اپنے ساتھیوں کی ایسی تنقیدوں کو یکسر نظرانداز کیا، کیوں؟ ان کے سامنے مقصد تھا مسلمان لیڈروں سے تعلقات پیدا کرنا، انھیں قومی تحریک میں لانا اور ہندو مسلمان اتحاد کو مضبوط کرنا۔ انھوں نے کہا، ان کے دکھوں میں حصہ بٹانا ان کا فرض تھا۔ بہرحال، آزمائش کے وقت وہ ہندو مسلم اتحاد کی بات نہیں کرسکے اور اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے۔"

اپنی کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے اور چہرے پر ایسی سنجیدگی طاری کیے ہوئے جیسی پردیپ اور جگ موہن نے پہلے شاید ہی کبھی دیکھی ہو، عزیز نے کہا "ایک دوسرے مجمع کے سامنے گاندھی جی نے اعلان کیا کہ قوم کے چار اعضا میں سے اگر کوئی ایک عضو زخمی ہوجائے تو عوام اس کی طرف سے بے توجہ نہیں رہ سکتے۔ اسی لیے انھوں نے ہندوؤں سے اپنے آپ کو اپنے مسلمان بھائیوں سے جوڑنے کی ترغیب دی۔ خود ان کا عمل دُنیا کو یہ دکھانے کے لیے تھا کہ اہنسا کا مطلب کیا ہے اور

ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کے لیے تھا۔ بالآخر انھوں نے کانگریس سے مشورہ کیے بغیر عدم تعاون کی تحریک کا آغاز کردیا۔ خلافت ایمان و ایقان کا معاملہ تھا اور ایمان و ایقان کے معاملات میں اکثریت کے قانون کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

"پردیپ تم مطمئن ہو؟"

"مطمئن ہوں مگر قائل نہیں ہوا ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

اب میں جو کہہ رہا ہوں اسے جلی حروف میں لکھ دو۔ پردیپ، سب سے پہلے تو یہ کہ میں نے اپنی طبیعت کے خلاف، خلافت تحریک سے متعلق تمام معاصر تاریخی مواد پڑھا تاکہ میں آئیڈیالوجی کو اپنے تجزیے کے مرکز میں لا سکوں۔ میں تمھاری توجہ ایسے مسلم گروہوں کی موجودگی کی طرف مبذول کراؤں گا جنھوں نے اپنی روایات میں وہ نظریاتی سرمایہ پایا جس نے انھیں اپنے عقائد اور قومی تحریک کے مابین فرق کے احساس کو ختم کرنے کے لائق بنایا۔ یہ بات صرف حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا آزاد ہی کے بارے میں صحیح نہیں تھی بلکہ یہ دوسرے بہت سے افراد اور گروہوں پر بھی صادق آتی تھی۔

"شکریہ"، پردیپ نے کہا۔

"میں نے بات ابھی ختم نہیں کی ہے۔ عمومی سے خصوصی کی طرف بڑھتے ہوئے میں اپنے طالب علموں کو بتاتا ہوں کہ خلافت کی سرگرمی، اپنے اسلامک رجحان کے باوجود، کلونیل ازم کے خلاف ہونے والی عام جدوجہد میں مدغم ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ عموماً کانگریسی جماعتوں، والنٹیروں کے گروپوں، کسان سبھاؤں اور ہوم رول لیگوں وغیرہ سے الگ خلافت کمیٹیوں کی شناخت مشکل ہوتی تھی اور یہی وجہ تھی کہ متعدد علاقوں میں کسان بے چینی ان کے پروگراموں سے منسلک ہوگئی۔ خلافت، کسان ایکتا اور سوراج جیسے الفاظ کی مدد سے گاندھی جی نے عوام کے ذہنوں میں، اچھے لیڈروں کی رہنمائی میں ایک بہتر دنیا کو وجود میں لانے کے تخیل کو بٹھا دیا۔"

"کیا یہ صحیح ہے؟" پردیپ نے کسی قدر بے یقینی کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں ہاں، بہت سی جگہوں پر کسانوں کو یہ یقین تھا کہ موجودہ سوراج جلدی ہی قائم ہوگا اور ان کی اقتصادی نجات، ان کے عقیدے، خلافت اور مسلم دنیا کے مفادات کی بقا میں مضمر ہے، گلیوں اور بازاروں میں عام آدمی کانگریس اور سوراج اور پنجاب اور ترکی میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بات کرتا تھا، مگر دیہی علاقوں میں لفظ خلافت سے بڑا عجیب و غریب مطلب لیا جاتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ لفظ اردو کے لفظ اختلاف سے نکلا ہے جس کے معنی اختلاف اور مخالفت کے ہوتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اس کے معنی حکومت کے مخالف ہونے کے لیے۔

"یہ بہت دلچسپ ہے" پردیپ نے کہا۔

"میں سیاست میں مذہب کو داخل کرنے کے خلاف ہوں" عزیز نے اسے بتایا۔ یقیناً اس خلافت کے بارے میں جناح کے موقف کو پسند کرتا ہوں، لیکن تحریک کی توانائی، اجتماعی زندگی کے حسن کے اظہار کی اس کی صلاحیت میں پنہاں ہے، یہ نئے فیشن کے شرانگیز مقررین کے پیدا کیے ہوئے اضطراب میں نہیں بلکہ سنجیدہ لمحات کی شدت میں ہے۔ اپنی ہزار سالہ تلاش و جستجو سے سرشار خلافت کے لیڈر 1919-21 کے برسوں میں ایک نشے کی سی کیفیت میں رہے، توانائی، جوش و خروش اور ایک مسرور خوش امیدی سے شرابور۔

بہار کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پیدا ہونے والے جے پرکاش نرائن اس زمانے کے ان ہزاروں نوجوانوں میں سے ایک تھے جو :

> آندھی میں پتیوں کی طرح ہوا میں تھے اور تھوڑی دیر کے لیے آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگے تھے۔ ایک عظیم خیال کی آندھی میں آسمان سے باتیں کرنے کے اس مختصر سے تجربے نے ان کے داخلی وجود پر اپنے نشان ثبت کیے جو وقت اور حقیقت کی بدبختی کی واقفیت کے بعد باقی نہیں رہے۔

اگرچہ ان کی توقعات پارہ پارہ ہوچکی تھیں اور ان کے پیروؤں (حمایتیوں) کی

محبوس توانائی نے فرقہ وارانہ جھگڑوں کی شکل میں اپنے نکاس کا راستہ ڈھونڈ لیا تھا، لیکن تحریک خلافت کے اہم اراکین اس یقین میں مبتلا رہے کہ بہت دن نہیں ہوئے جب ایک انتہائی اہم واقعہ ہوا تھا اور یہ کہ ان کے ملک کی تاریخ میں قوت و اقتدار کا ایک لمحہ آیا تھا، لمحہ اتنا قریب اتنا قریب کہ گویا ان کی مٹھی میں۔

عارف یہ جاننا چاہتا تھا کہ عزیز نے علما کے رول کے بارے میں بات آخر کیوں نہیں کی۔

'میں اس موضوع پر تفصیلی بات نہیں کرنا چاہتا ہوں'۔ اور پھر عزیز نے دھیمے سروں میں اضافہ کیا۔

"ترکی اور مقدس مقامات سے متعلق مسلم تشویش میں علما مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ انھوں نے خلافت کے تصور پر اپنے پیروؤں کو جوش دلایا، خارجی اور داخلی دشمنوں کے خلاف لڑائی میں حقیقی اسلام کا پرچم لہرایا اور اینٹی کلونیل خواہشات کو جواز عطا کرنے اور انھیں مجتمع کرنے کی غرض سے اسلام کے ثقافتی اور دانشورانہ وسائل کو استعمال کیا۔ ان حضرات کی جذباتی لگن اور ان کا جوش و خروش زیادہ واضح طور پر یہ دیکھنے میں ہماری مدد کرتا ہے کہ اسلام نے سیاست میں کیا کیا کردار ادا کیے اور ساتھ ہی دوسری دہائی میں اسلام کے ثقافتی اور سماجی تصورات کے نفاذ کے متعدد طریقوں کا احساس دلاتا ہے۔"

"یہ مشکل موضوع ہے" جگ موہن نے اظہار خیال کیا " تم تو مہربانی کرکے عدم تعاون کی تحریک سے متعلق گفتگو جاری رکھو۔"

گاندھی جی نے عدالتوں، انگریزی سامان، حکومت کی امداد سے چلنے والے تعلیمی اداروں، اسمبلی اور صوبائی کاؤنسلوں کے انتخابات کے بائیکاٹ اور اعزازات و انعامات کو واپس کردینے کی اپیل کی"۔ عزیز نے وضاحت کی "ان کی اپیل پر کچھ جگہوں پر لوگوں نے لبیک کہا مگر ہر جگہ نہیں۔ لیجسلیٹیو کاؤنسل کے انتخابات کا جو ناگپور کانگریس کے انعقاد سے ذرا پہلے ہوئے تھے بائیکاٹ ہوا، خصوصاً مسلم حلقہ ہائے

انتخاب میں۔"

پردیپ کو حیرت نہیں ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ کلکتے اور ناگپور میں گاندھی جی کی کامیابی مسلمانوں کی زبردست موجودگی کی وجہ سے تھی۔ عزیز نے بہرحال مسلمانوں کی کانگریس سے دوری اور اس کے خلاف مہم چلاتے ہوئے سید احمد خاں کا بھی حوالہ دیا تھا۔

پردیپ ذہن میں یہی خیالات لیے ہوئے گھر گیا۔

یہ تینوں اس کے بعد کئی ہفتوں تک مل نہ سکے۔ جگ موہن اپنے چچا جے ایس گریوال سے ملنے گیا جو جنگ پورہ میں اپنے نئے مکان میں مزے سے رہ رہے تھے۔ گریوال ماما کی، بستی میں لوگ انھیں اسی طرح پکارتے تھے، اونگھتے ہوئے ریلوے اسٹیشن کے قریب نظام الدین ایسٹ میں ایک دکان تھی۔ اکثر جب سیٹی دیتی ہوئی کوئی ٹرین وہاں سے گزرتی تو ان کے اندر سیالکوٹ میں اپنے دوستوں سے ملنے کی خواہش بیدار ہوجاتی اور وہ ٹرین پر سوار ہوجانا چاہتے۔ پاکستان جانے والی ٹرین میں ایک سیٹ۔ ہی ان کی آرزو تھی۔ جب کبھی نظام الدین کی بستی سے ان کا گزر ہوتا، خصوصاً عید اور بقرعید کے موقع پر، تو انھیں وہ تمام تقریبات اور جشن یاد آجاتے جن میں وہ شریک ہوئے تھے، انھیں پڑوس کے بچوں نازی، ثمینہ اور سمیر کو تحفے اور عیدی دینا بھی یاد آتا، سیالکوٹ میں اپنے سب سے اچھے دوستوں، اللہ بخش اور نور محمد کے گھر پر اڑائی ہوئی ضیافتوں کی یاد بھی انھیں حسین ماضی میں پہنچا دیتی۔

عزیز محرم کے زمانے میں عموماً جلالی جاتا تھا مگر اس سال وہ نہیں جارہا تھا، اس کی بیٹی کسی اہم مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی اس نے بھی سوچا کہ وہ اس زمانے میں کچھ پڑھ لے۔ اس کے علاوہ اسے اپنے کچھ دوستوں کی میزبانی بھی کرنا تھی جو لکھنؤ کے محرم دیکھنے کے مشتاق تھے۔ ان لوگوں کا اس کے پاس کم از کم پندرہ دن رہنے کا ارادہ تھا۔

☆☆☆☆☆

چھٹا باب

میں وہ طریقہ سمجھنا چاہتا ہوں جو سیاسی معاملات میں میری قوم نہیں میرے ملک کے سارے باشندوں کو اختیار کرنا چاہیے..... اب فرض کرلو کہ سارے انگریز اور ساری انگریزی فوج، اپنی ساری توپیں، بندوقیں اور اپنے بہترین ہتھیار اور اپنی ہر چیز لے کر ہندستان چھوڑ دیں، تب ہندستان کا حکمران کون ہوگا؟ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہوگا کہ دو قومیں، محمڈن اور ہندو ایک تخت پر بیٹھیں اور اقتدار و اختیار میں مساوی رہیں؟ یقیناً نہیں۔

(میرٹھ میں سید احمد خاں کی تقریر 14/ مارچ 1888)

نمائندگیوں میں، وہ چاہے راست ہوں یا بالواسطہ، مسلمانوں کی حیثیت اور ان کے اثر و رسوخ پر اثرانداز ہونے والے تمام دوسرے طریقوں میں مسلم کمیونٹی کو جو مقام دیا جائے وہ صرف ان کی عددی حیثیت ہی کے مطابق نہیں بلکہ ان کی سیاسی اہمیت اور ایمپائر کے تحفظ میں ان کی دین اور ان کی اعانت کے بقدر ہونا چاہیے۔

(مسلم ایڈرس ٹو منٹو، یکم اکتوبر 1906)

لکھنؤ میں پٹاخوں کے دھماکے اور شاہ نجف کی مسجد میں موذن کی زوردار اور صاف آواز محرم کے متبرک مہینے کے آغاز کا اعلان ہے۔ لکھنؤ والے اگلے دس دن

انتہائی سنجیدگی اور وقار سے گزاریں گے اور ان اسلامی اصولوں سے اپنی مصمم اور استوار عقیدت کا اعادہ کریں گے جس کی خاطر امام حسین اور ان کے 72 ساتھیوں نے دریائے فرات کے کنارے اپنی جانیں دے دی تھیں۔ یہ لوگ ایک بار پھر، اپنے تخیل میں، کربلا کے جیالے مردوں اور جری عورتوں کے درد اور ان کے مصائب کا تجربہ کریں گے۔

ماہ محرم کی پہلی تاریخ آتے ہی لکھنؤ میں زندگی جیسے ٹھہر جاتی ہے۔ خوشبو اور تمباکو کی دکانیں سنسان ہوجاتی ہیں، تجارت میں وہ تیزی نہیں رہتی، سارے کاروبار سست پڑ جاتے ہیں، امین آباد اور نخاس کی بازاروں کا شور ختم ہوجاتا ہے چہل پہل اور بھاگ دوڑ تھم جاتی ہے۔ جیسے کسی نے لکھنؤ کا جوش و خروش چھین لیا ہو۔ ایک شیعہ میر حسن علی سے بیاہی ایک انگریز خاتون نے جو 1820 میں لکھنؤ میں رہ رہی تھیں ایک وسیع پیمانے پر آباد، دوسرے شہروں کی طرح پرشور اور ہنگامہ خیز لکھنؤ کا موازنہ ایسے گہرے سناٹے سے کیا تھا۔

آرام، عیش اور سہل پسندی قصہ پارینہ ہوجاتی ہے۔ خواتین، یہاں تک کہ نوبیاہتا دلھنوں نے بھی اپنے زیورات رکھ دیے، رنگین کپڑے تہہ کردیے گئے، چوڑیاں اتار ڈالی گئیں۔ چارپائیاں اور تخت ہٹا دیے گئے۔ اس کے بجائے، عورتوں نے وہ چاہے جس طبقے کی بھی ہوں کھجور کی چٹائی یا سادے سے فرش پر سونا شروع کردیا، مرد، سفید انگرکھے یا گہرے رنگ کی اچکنیں پہننے لگے۔ غزل کی بڑی بڑی محفلوں کے عادی اور رسیا شعرا نے مرثیے اور سوز لکھنے شروع کردیے۔ ان کے سرپرست راجاؤں اور نوابوں نے تفریحات ترک کیں اور ایک ثقہ زندگی گزارنے لگے۔ ان کے محلوں، ان کی حویلیوں اور ان کے قلعوں پر، محرم کے دوران ایک سوگوار فضا چھاگئی۔

چوک میں طوائفوں نے اپنے ساز، اپنے گھنگھرو اور اپنی پائلیں اٹھاکر رکھ دیں۔ امراؤجان ادا کی خانم، لکھنؤ میں دوسری طوائفوں کے مقابلے میں کہیں بڑے پیمانے پر امام حسین کی یاد مناتی تھیں، عزاخانے کو پرچموں، جھنڈیوں، فانوسوں اور ہنڈوں سے سجایا جاتا تھا۔ وہ خود بھی اتنی ماہر سوزخواں تھیں کہ اچھی اچھی پیشہ ور

سوزخواں خواتین کی ان کے سامنے سوز پڑھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

شہر کے سیاہ پوش مرد و زن، اپنے روزمرہ کے کاموں کو چھوڑ کر شہید امام اور ان کے ساتھیوں کے ماتم میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ وہ غم میں ڈوبے اور انتہائی لے اور سُر کے ساتھ، یا حسین یا حسین کہتے ہوئے، اپنے سینوں کو پیٹتے ہوئے جلوس کی شکل میں لکھنؤ کے گلی کوچوں میں چکر لگاتے ہیں، جلوس میں، تعزیوں کی شکل میں حسین کے مقبرے ان کے کفن، ان کے جھنڈوں اور نشانات کے چربے ہوتے ہیں، ان کا گھوڑا ہوتا ہے، یہ رسم ہر سال ادا کی جاتی ہے۔

امام باڑے، جن میں سے اکثر لکھنؤ کے شیعوں کے ماضی اور حال کی نشاندہی کرتے ہیں، ان تعزیوں کے انعقاد کے مرکزی مقام ہوتے ہیں۔ امام باڑے شہر کے عوام الناس کے اتحاد و یگانگت کے ٹھوس نمونے، فرقے کی یکجہتی کی علامتیں اور انفرادی اور اجتماعی تجربات کی وضاحتوں کے مراکز۔ یہاں ہونے والی مجلسیں اودھ کے شیعہ نوابوں کے چھوڑے ہوئے نمونوں کی پیروی کرتی ہیں۔ بیان شہادت ہوگا یا مرثیہ خوانی ہوگی۔ ابتدا سوز خوانی سے، سوز پڑھنے کا یہ انداز لکھنؤ کے اساطیری شہرت کے مالک مرثیہ گو شاعر میرانیس کی دین ہے۔ مجلس کا اختتام بین اور ماتم پر ہوتا ہے۔

وعظ میں واقعات کربلا کا الم انگیز بیان ہوتا ہے۔ حسین اور ان کے ساتھیوں کے درد، مصائب اور ان کی اذیتوں کا پراثر قصہ۔ سال بہ سال ذاکرین واقعات کربلا کی تفصیلات بیان کرتے ہیں۔ دشمنانِ اسلام کے ہاتھوں امام حسین اور ان کے ساتھیوں کے مارے جانے کا تقدیم و تاخیر کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، کربلا کے تپتے ہوئے ریتیلے میدانوں میں ان کی آزمائشوں اور مصائب کا ذکر سننے والوں کو افسوس کرنے، رونے اور ماتم منانے پر مجبور کردیتا ہے۔ لوگ اپنے سینوں کو پیٹتے ہیں اور خود اذیتی اور خود محرومی کے ذریعے ان شہیدوں کے مصائب کا تجربہ کرتے ہیں۔

عزاداری کے یہ دس دن معروف غفران مآب امام باڑے میں اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ وہاں آقائے شہدا کو آخری خراج عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ چہلم کے دن تقریبات آخری طور پر ختم ہوجاتی ہیں۔ تال کٹورہ کربلا میں تعزیے اٹھائے ہوئے

عورتوں کے ایک جلوس کا شرر نے ذکر کیا ہے۔ ساری خواتین ننگے سر تھیں، سب کے بال کھلے ہوئے تھے، ان کے بیچ میں ایک خاتون ایک شمع لیے ہوئے تھی، شمع کی روشنی میں ایک خوبصورت نازک سی لڑکی چند اوراق سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اس نے دوسری خواتین کے ساتھ ایک بین پڑھا۔ چاند کی روشنی، سکوت، برہنہ سر حسینائیں اور روح کو تھرّا دینے والی ان کی حزینہ لے سے متاثر سرشار نے امام باڑے کے دروازے سے گزرتی ہوئی خواتین کے ایک گروہ کو یہ مرثیہ پڑھتے ہوئے سنا:

صبر کہہ ان سے کہ دل اپنا سنبھالیں زینب
جتنے بھی درد ہیں سینے میں چھپالیں زینب
اشک سجاد کے آنکھوں سے لگالیں زینب
بکھرے اوراقِ شہادت کو اٹھالیں زینب
فرضِ سالاریٔ اربابِ نظر باقی ہے
کربلا اور مدینے کا سفر باقی ہے

کانگریس سے مسلمانوں کی علاحدگی اور ان واقعات پر کہ جنھوں نے خلافت احتجاج کی بناء ڈالی، تبادلہ خیال کرنے کے لیے عزیز، پردیپ اور جگ موہن محرم کے بعد اکٹھا ہوئے۔

عزیز نے سید احمد خان کے تذکرے سے سلسلۂ گفتگو شروع کیا۔ سید احمد خاں، جنھوں نے اپنے ہم مذہبوں سے، حکومت کی نظر میں اپنی شبیہ بدلنے، انھیں مغربی تعلیم کی اہمیت کا احساس دلانے اور انھیں سستی و کاہلی کی اپنی عادتوں کو چھوڑ دینے کی ترغیب دینے کا وعدہ کیا تھا۔ جاگیردار خاندان میں پیدا ہونے مغل سلطنت کی انحطاط پذیری کے زخم کھانے کے باوجود وہ اپنی تعیینِ سَمت اور اپنے رویوں میں انتہائی موقع شناس تھے اگرچہ ان کی تربیت اسلامی تعلیمات میں ہوئی تھی مگر وہ انتہائی کھلے ذہن اور پیش بیں تھے۔ مسلم احیاء نو کی جیتی جاگتی علامت، وہ سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے ایک زبردست محرک ثابت ہوئے۔

ایک دوست کے نام اپنے خط میں سید احمد خاں نے لکھا تھا کہ 1857 کے بعد جدید سائنس اور انگریزی زبان میں اپنے برادران کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی انھیں کتنی تشویش تھی۔ انھوں نے خود قرآن کریم پر یہ معلوم کرنے کے لیے غور و خوض کیا کہ جدید سائنس اور اسلام ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہوتے۔ ان کو بدنام کرنے والوں کے لگائے ہوئے الزامات کے برخلاف وہ اسلام کی ابدی صداقت کے عقیدے اور انسانی عظمت کی بلندیوں تک پہنچنے کی مسلمانوں کی صلاحیت پر اپنے بھروسے میں کبھی متزلزل نہیں ہوئے۔ وہ صرف اپنے عقیدے اور اس نئی سائنس کو باہم ملانے کے لیے ایک پل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ ان کے علم دین یا ان کی دینیات کی بدیہی بات تھی، خدا کا کام (فطرت اور اس کا متعینہ اصول) اور خدا کا کلام (قرآن) دونوں کا منتہا ایک ہے۔

سید احمد خاں کا کہنا تھا کہ سائنس ہمارے دائیں ہاتھ میں اور فلسفہ ہمارے بائیں ہاتھ میں ہونا چاہیے اور ہمارے سر پر **لا اله الا الله محمد الرسول الله** کا تاج ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک قرآن کا ہر لفظ، لفظ بھی تھا اور معنی بھی۔ اللہ کا یہ کلام پیغمبر اسلام پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا۔ ان کا عقیدہ ایسا تھا کہ انھوں نے اس میں جبریل علیہ السلام کے بیچ میں آنے سے بھی انکار کیا۔

بہت سے مسلم علمائے دینیات نے سرسید پر بدعتی، ملحد اور دہریہ ہونے کا الزام لگایا۔ انھیں 'نیچری' کہہ کر کوسا اور قرآن کو Demythologise کرنے کے الزام پر ان پر شدید حملے کیے۔ بدیسیوں اور منکروں کی تہذیب کی طرف سیّد احمد خاں کے نرم رویے کی وجہ سے ان کی ایک چچی نے ان کی صورت دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے ایک ممتاز مخالف نے ان کے مذہبی خیالات اور ہر اس شخص کے خلاف فتویٰ لینے کے لیے مکے کا سفر کیا جو ایک کالج شروع کرنے کے کام میں اس بدعتی کی مدد کرے گا۔ اس زمانے کے جہاں گرد اسلامسٹ جمال الدین افغانی پان اسلامزم کو رد کرنے پر ان کے پیچھے پڑ گئے۔

"سید احمد خاں کو بڑا دکھ ہوا ہوگا اور انھوں نے بڑی بے بسی محسوس کی

ہوگی۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ ان کا مشن ناکام ہوگیا؟" جگ موہن نے سوال کیا۔

"نہیں، ان کی کوششیں بارآور ہوئیں۔" عزیز نے جواب دیا۔ روشن خیالی اور جدیدیت کے ان کے ایجنڈے نے مسلمانوں کی ایک نئی نسل کو یہ یقین دلایا کہ جدید تعلیم کا حصول اسلام کے پیغام کی بیخ کنی نہیں صداقت کا اثبات کرے گا۔ ان میں سے کچھ قدامت پرستی کے بندھنوں سے آزاد ہوئے اور انھوں نے قدامت پرستانہ عقائد کی اصلاح اور تاویل نو کی حمایت کی۔ چنانچہ علی گڑھ کے اس مصلح کی پیروی کرتے ہوئے تاریخ داں امیر علی نے سماجی اور مذہبی اسلامی افکار کے تانے بانے کی تعیین نو کے لیے جدید تصورات پیش کیے۔"

"آزاد کے بارے میں کیا ہے؟" جگ موہن ایک بار پھر بولا۔

"انھوں نے سید احمد کا موازنہ رام موہن رائے سے کیا۔ ان کے مطابق سید نے روایتی اقدار اور فرسودہ عقائد کو چیلنج کیا اور کالج نے ترقی کی قوتوں کی فتح و نصرت کی تجسیم کی۔"

"تو تم یہ کہوگے" پردیپ نے پوچھا "کہ ہندو مسلم اتحاد سے مولانا کی دلچسپی کے پیچھے سید احمد کی مثال تھی۔ سید احمد کا یہ استعارہ تھا کہ ہندو اور مسلمان بھارت ماتا کے چہرے پر دو آنکھوں کی طرح ہیں۔"

"میرا خیال یہی ہے"

اقبال بھی ان سے مسحور ہوئے ہوں گے" ہوئے تھے نا؟" پردیپ نے پوچھا۔

"ہاں، انھوں نے کہا کہ سید احمد پہلے جدید مسلمان تھے جنھوں نے آنے والے زمانے کے مثبت کردار کی جھلک دیکھ لی تھی وہ پہلے شخص تھے جس نے اسلام کو نئی سمت دینے کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کے لیے کام کیا۔ میں اس نقطہ نظر کی تصدیق کرتا ہوں۔ سید احمد کی پائندہ دین ایم اے او کالج کا قیام تھا۔ کالج وہ سرزمین تھا جہاں برسہا برس تک مسلمان علماء و فضلاء کی ذہانت و طباعی کے پھول کھلتے

رہے۔ اسی سرزمین سے اصلاحات کی تحریکیں اٹھیں اور کامیابی سے سرفراز ہوئیں۔ یہی وہ سرزمین تھی جہاں دیوبند کے قدامت پسند رجحان کے برعکس اسلام میں اصلاح کے مخصوص علی گڑھ رنگ نے جنم لیا۔ دہلی سے 80 میل دور گرینڈ ٹرنک روڈ پر یہی خوابیدہ شہر تھا جہاں مسلم افکار کی تحقیق، تاویل اور تشکیل نو کے مدرسہ ہائے فکر قائم ہوئے۔"

"بالکل لکھنؤ والوں کی طرح تم مبالغے سے کام لے رہے ہو، ہے نا؟" پردیپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم جو بھی کہو ہم تو صرف ان کی کانگریس مخالف جدوجہد کو جانتے ہیں۔ یہی ہے جس کے بارے میں ہر کس وناکس بات کرتا ہے۔"

"اگر موقع ملے" عزیز نے پردیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "تو میں کسی عوامی پلیٹ فارم سے دو یا تین باتیں کہوں گا۔ سب سے پہلے تو میں ہندستانی اسلام کی انٹلکچول ہسٹری کو اپنے تعلیمی اداروں کے نصاب میں رکھے جانے کی اہمیت پر زور دوں گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسلامی سماجوں کے تاریخی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ہمیں جزیرہ نمائے عرب سے باہر کے علاقوں کی چھان بین کرنا چاہیے۔ اسلام اور اس کے ماننے والوں کی روایتی شبیہوں کو بدلنے کی خاطر ہمیں ساؤتھ ایشیا میں مسلمان کمیونٹیز کی تاریخ اور خصوصاً جدید نظریات اور روایتی افکار کے باہمی تعامل پر پڑے ہوئے پردوں کو اٹھانا چاہیے۔"

"مجھے نہیں معلوم کی جگ کا کیا خیال ہوگا مگر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔"

"مسلمانوں سے متعلق تحقیقات پر مقبول عام stereotypes کا تسلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید اور ان کے ساتھیوں کو علاحدگی پسند کہہ کر مسترد کردیا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ انھیں مسلم نیشنلزم کا معمار کہتے ہیں مگر بہت کم ہیں جو انیسویں صدی کے آخری ربع میں نشاۃ ثانیہ کی تشکیل میں ان کی دین اور ان کے حصے کو نمایاں

کرتے ہیں۔ ہم بنگالی نشاۃ ثانیہ کا چرچا تو سنتے ہیں مگر اس نشاۃ ثانیہ کا ذکر نہیں سنتے، جس کا اولین ہادی اور پہلا مہم جو علی گڑھ کا یہ عظیم بزرگ تھا۔"

"اس کا ذمہ دار کون ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

سید احمد کی فراہم کی ہوئی ذہنی توانائی سے فائدہ نہ اٹھانے کا کچھ الزام تو مسلم دانشوروں کو اپنے سر لینا چاہیے۔ وجود میں آتے ہوئے قوت کے نئے ڈھانچوں میں اشرافیہ نے اپنے اپنے دعوے تو پیش کیے مگر تعلیم اور سماجی اصلاح دونوں کو نظرانداز کردیا۔ متوسط طبقے کے ایک عام طالب علم کی تمنا جنتی لوگوں کی معیت تھی اور بس۔"

"اور نصاب تعلیم؟ میں نے سنا ہے کہ دیوبند میں یہ وہی ہے جو ادارے کی ابتدا میں تھا، پردیپ نے کہا۔

"بسا اوقات خود نصاب نے فرقہ بندی کی پرداخت کی، اسی لیے جب بنگال اور مہاراشٹر کا بورژوازی روشن خیال نظریات کو اپنا رہا تھا، ہمارا اشرافیہ، نام نہاد مقبول زمانہ شاہانہ طمطراق کی اقدار سے تسکین حاصل کر رہا تھا۔ علی گڑھ نے سبقت لے جانے والی جرات کے حامل چند مفکروں کے مقابلے میں محتاط مدرس زیادہ پیدا کیے۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مسلم اشرافیہ نے اپنی خودپیکری ایک کمیونٹی کے ایک عضو ایک حصے کی طرح کی، ایک کمیونٹی پتھر کی طرح سخت، امت جو زمان و مکان کی عظیم تبدیلیوں کے باوجود پہلے ہی جیسی رہی یا اس کے پہلے جیسی رہنے کی توقع رہی۔ وہ وقتاً فوقتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کبھی کم نہ ہونے والی ازلی دشمنی کی بات دہراتے رہے۔ وہ یہ بھی کہتے رہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے گروپوں میں داخلی اختلافات، ان کے مابین اساسی مذہبی دراڑوں کے مقابلے میں ثانوی بے جوڑ اور غیر متعلق تھے۔"

"یقیناً"، پردیپ نے رائے ظاہر کی، "بعض لوگوں نے دوسرے انداز میں سوچا ہوگا"۔

"مجھے شبہہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس طرح نہیں سوچا۔ اگر انھوں نے ایسا کیا ہوتا تو ان پر داخلی سیاسی، اخلاقی اور سماجی کشمکشوں کی موجودگی اور ان کشمکشوں کے تباہ کن تفرقہ انگیز اثرات کی موجودگی کا انکشاف ہوا ہوتا۔ اور اس طرح انھوں نے اپنے آپ کو بہتر طور پر سمجھا ہوتا اور اپنے رویّوں اور اپنے برتاؤ کو دوسروں کے لیے لائق فہم بتایا ہوتا۔ جس وقت سید احمد معروف و محترم ہورہے تھے وہ لوگ اسلام کی عظمت رفتہ کا مرثیہ پڑھ رہے تھے اور مغل سلطنت کے زوال پر تاسف کا اظہار کررہے تھے۔ کچھ نے انگریزوں کے خلاف بے مصرف مذہبی جنگ چھیڑی اور کچھ اس بحث میں الجھے کہ ہندستان دارالحرب تھا یا دارالامان۔ میں نے حاجی شریعت اللہ، سیّد احمد بریلوی اور شاہ عبدالعزیز کے فتوے کا تذکرہ کیا تھا۔ میرے زاویۂ نظر سے ان کی اکثر پریشانیاں ایک ایسے وقت میں بالکل بے معنی تھیں جب مغل سلطنت زوال کی اس منزل پر پہنچ چکی تھی جہاں کسی تلافی یا کفارے کا کوئی امکان نہیں تھا اور امپریل قلعہ مستحکم بنیادوں پر کھڑا ہوچکا تھا۔ ان کی بحثیں عموماً غیر منطقی ہوچکی تھیں کیونکہ مسلم اشرافیہ اور ان کے مخاطبوں کے سامنے راج کے ساتھ مفاہمت کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا اور وہ بھی کسی استحقاق کی بناء پر نہیں بلکہ ایک محکوم شہری کی حیثیت سے۔ دوسرے الفاظ میں، راج کے نمائندوں کے ساتھ ان کی دشمنی اور ان کے تعصبات سے صرفِ نظر کرکے بات کرنا تھی اور امپریل قوت کی حاکم و فرمانروا موجودگی کی حقیقت کو ماننا تھا"۔

"تم یہ کہہ رہے ہو"، پردیپ بولا، "سید احمد سے پہلے مسلم دانش ور طبقہ نوشتۂ دیوار کو پڑھنے کے لیے ذہنی طور پر کم مایہ تھا۔ میں تمھاری تاویل سے متفق نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں 19 ویں صدی کے وسط میں اپنے علما اور ان کے دشوار حالات کے بارے میں کچھ مزید جاننے کی ضرورت ہے۔

"انیسویں صدی کا صرف وسط ہی کیوں؟ کچھ لوگ ابھی تک ایک جمہوری نظام سیاست کو ہضم نہیں کرپائے تھے۔ کیا تم نے جماعت اسلامی اور اس کے قائد مودودی کے بارے میں نہیں سنا ہے؟ ان کا مقصد ریاست اور سماج پر قبضہ کرنا ہے

تاکہ وہ شریعت کا نفاذ کر سکیں۔ تاہم حیرت انگیز حقیقت یہ ہے کہ کچھ اسکالرز عوامی تہذیب کے نام پر، سماج میں اپنے کردار کو رومانی رنگ دیتے ہیں"۔

دوسرے دن عزیز اپنے ڈپارٹمنٹ گیا۔ سیشن شروع ہوئے ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے۔ ساتھیوں کے ساتھ خوش گپیاں کرنے کے بعد اس نے ساری سہ پہر لائبریری میں چند کتابوں کے مطالعے میں گزاری۔ لائبریری سے جب لوٹ کر پھر اپنے دوستوں میں آیا تو اس نے کہا:

"انیسویں صدی کے آخری ربع میں تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اپنی وسعت اور اپنے تصورات کے معاملے میں محدود تھیں۔ اکثر مصنفین اور publicists بشمول علی گڑھ کالج میں پروفیسر شبلی نعمانی نے بھی ہندستانی علوم کے حیرت انگیز تنوع اور اس کے تمول سے صرف نظر کیا ہے اور عرب کی تاریخ اسلام پر توجہ کی ہے۔ ایک عام مسلمان کو یہ یقین دلاکر گم کردہ راہ کردیا گیا کہ اسلام کا مستقبل خلافت کے تحفظ پر منحصر ہے"۔

"تم جو کہتے ہو"، پردیپ نے کہا، "اس سے تو میں یہ توقع کرتا ہوں کہ سید احمد پان اسلامزم کے بہ بانگِ دُہل ناقد ہوں گے"۔

"بالکل صحیح"، عزیز نے جواب دیا، "انھوں نے ترکی خلیفہ کے دعووں کو مشکوک پایا اور ان پر حجت کی۔ انھوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ پان اسلامک شورش، ہندستان میں انگریز اور مسلمانوں کے اتحاد کو تقویت پہنچانے کی ان کی کوششوں کو مزید نقصان پہنچائے گی۔ اسی لیے انھوں نے اس بندھن کو کاٹنے کی کوشش کی جس نے ان کے برادران کو نام نہاد بین الاقوامی ملاپ سے باندھ رکھا تھا، انھوں نے مسلمانوں میں پھیلنے والے ترکی کے مرض کے خلاف آواز اٹھائی، اور کہا کہ مسلمان کسی بیرونی خلیفہ کی فرمانبرداری کے پابند نہیں ہیں بلکہ وہ پابند ہیں برطانوی حکومت کے۔ ان کی اس دلیل کی منطق یہ تھی کہ مسلمانوں کو ہندستان کے اندر ہی اپنے مقدر کی تشکیل کرنا ہے نہ کہ مذہبی غذا کے لیے کسی بیرونی قوت اور اتھارٹی کی

طرف دیکھنا۔ یہ سب کہے جانے اور ہوجانے کے بعد مسلمان لیڈروں کو پان اسلامزم کے خلاف سیداحمد کے انتباہ سے کچھ سبق سیکھنے چاہیے تھے۔ مگر خلافتیوں نے اس انتباہ کو ہوا میں اُڑا دیا جو انھیں اپنے مشیر اور اپنے گرو سے ملا تھا۔

پردیپ اور جگ موہن نے مسکراتے ہوئے عزیز کی طرف دیکھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد عزیز بولا، ''ایسا لگتا ہے کہ میں نے اپنے آپ کو تم لوگوں پر مسلط کر رکھا ہے، مجھے معاف کردینا۔ بہرحال تصویر کو مکمل کرنے کے لیے مجھے یہ تو دیکھنا ہی ہوگا کہ آیا سید احمد ایک مسلم قوم کے مورث اور جدّ تھے۔

''ہاں عزیز بھائی''، جگ موہن نے پوچھا، ''ایسے آدمی نے نیشنلسٹ لہر کی مخالفت کیوں کی؟''

''کانگریس کی ملامت کرنے میں ان کی شعلہ بیانی کا مطلب سمجھنا بڑا مشکل ہے''، پردیپ نے اضافہ کیا۔

''تم نے ذکر کیا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد ان کے جی سے لگا تھا اور ان کی عوامی تقریروں کا ایک مستقل موضوع تھا''، جگ موہن نے یاد کیا۔

''یہی نہیں انھوں نے تو یہ بھی کہا کہ وہ مذہب کو قومیت کی علامت یا اس کے نشان کی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ باہمی فلاح کو یقینی بنانے کے لیے ایک مشترک علاقے نے ہندستانیوں پر باہمی تعاون کی ذمہ داری ڈال دی ہے''۔

''انھوں نے مذہبی اور سیاسی مسائل کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی بھی تو وکالت کی تھی؟'' جگ موہن نے پوچھا۔

''ہاں''، عزیز نے کسی قدر جوش کے ساتھ جواب دیا، ''روحانی اور مذہبی معاملات کا کوئی تعلق دنیاوی معاملات سے نہیں تھا۔ حقیقی مذہب، اخلاقی اقدار پر محیط بنیادی اصول بتاتا ہے اور دنیاوی معاملات میں شاذ و نادر ہی دخل دیتا ہے۔ انھوں نے یہ بات بالکل واضح کی کہ لفظ قوم سے ان کی مراد ہندو مسلمان دونوں سے ہوتی ہے۔ ان کی رائے میں مذہبی عقائد کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت جس بات کی تھی وہ یہ

تھی کہ یہ لوگ ایک سرزمین پر بستے ہیں، ایک حکمران ان پر حکومت کرتا ہے، فائدوں کے وسائل دونوں کے مشترک ہیں اور مصائب اور قحط سالی جیسی مشکلات میں دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

علی گڑھ کے اس مصلح نے سین ٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ برٹش انڈین ایسوسی ایشن اور یونائیٹیڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ کالج کے ان کے منصوبے میں فرقہ وارانہ ترجیحات نہیں تھیں، ان کی اسکیم کے دروازے تمام مذاہب، تمام فرقوں اور تمام ذاتوں کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ ہندو راجاؤں اور زمینداروں سے فراخ دلانہ امداد و تعاون ملنے کی وجہ سے انھوں نے اس بات کا خصوصی خیال رکھا کہ مینجنگ کمیٹی اور ٹیچنگ اسٹاف میں ان کی مناسب نمائندگی ہو۔ کالج کے ابتدائی زمانے میں تو ہندو طالب علموں کی تعداد مسلمان طلباء سے زیادہ تھی، ان کے مذہبی خیالات کے احترام میں ذبیحۂ گاؤ ممنوع تھا۔

سید احمد کے ابتدائی طریقہ کار اور ان کے رویّوں میں کوئی بات ایسی نہیں تھی جس سے نتیجہ نکالا جاسکتا کہ وہ مسلمانوں کے لیے کسی ترجیحی سلوک کے حق میں تھے۔ وہ پہلے آدمی تھے جنھوں نے کہا کہ 1857 کی شورش کے پیچھے، عوام کی اقتصادی زبوں حالی کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے توجہی اور ان کا کاؤنسل میں چند ہندستانیوں کو کسی نوعیت کی بھی مشاورتی نمائندگی نہ دینا تھا۔ انھوں نے لوکل سلف گورنمنٹ کی اور انگریز ملزمان کی سماعت کرنے کے ہندستانی ججوں کے حق کی حمایت کی۔ انھوں نے اقرار کردہ انڈین سول سروس میں ہندستانیوں کے داخلے کے دفاع میں لکھا اور علی گڑھ میں، برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کو ازسرنو شروع کیا تاکہ آئی سی ایس میں داخلے کے امتحانات کے لیے امیدوار کی انیس سے اکیس سال کی عمر کی شرط کو برقرار رکھنے کی مہم میں شرکت ہوسکے۔

"پھر آخر"، جگ موہن نے اپنا پچھلا سوال پھر دہرایا، "کانگریس کے خلاف ان کی شعلہ بیانی کا کیا جواز ہے؟"

"میری اپنی سمجھ یہ کہتی ہے کہ ایم اے او کالج کے پرنسپل Theodore Beck نے اُن کو گمراہ کیا۔ ٹرینٹی کالج کیمبرج میں ایک بنیادپرست رہنے والا بیک ہندستان میں آکر ایک بے حیا سیاسی قدامت پرست ہوگیا۔ یہاں اس کا مشن تھا سرکشی اور بغاوت کی سرکوبی اور امپریل اقتدار کو بچانا۔ سید احمد اس کے منصوبوں کے لیے بڑے کارآمد ثابت ہوئے"۔

عزیز نے بتایا کہ بیک کس طرح انتہائی فرمانبرداری کے ساتھ ہر اس جگہ موجود رہتا تھا جہاں اس کے سربراہ کانگریس پر نشانہ لگاتے تھے۔ اس نے ایک کانگریس مخالف اخبار کی مدد کی، یونائیٹڈ، پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں بکھرے ہوئے کانگریس مخالف عناصر کو مجتمع کیا، پارلیمنٹ کو پیش کی جانے والی ایک کانگریس مخالف تجویز پر دستخط کرانے کے لیے دہلی کی جامع مسجد میں جمع ہونے کے لیے مسلمان طالب علموں کی ہمت افزائی کی اور کانگریس کے خلاف کیے جانے والے مسلم مظاہروں کی خبریں شائع کیں۔ ایسی پیش قدمیوں سے، اس کے دعوے کے مطابق، لوگوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آگیا جو کانگریس کے دلائل کی مکاری اور جہ رٹ کو بے نقاب کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"مگر یقیناً سید احمد کے قدوقامت اور ان کی حیثیت والا آدمی ...."۔

"ہاں پردیپ، میں جانتا ہوں کہ تمھارا مطلب کیا ہے مگر کالج کو چلانے کے لیے حکومت پر انحصار کی ضرورت کو ہمیں نہیں بھولنا چاہیے۔ اس کے علاوہ برطانیہ کی طرف سے ملنے والے اعزازات اور استحسان کے لیے ان کی شکرگزاری اور احسان مندی کا جذبہ بھی کارفرما رہا ہوگا۔ 1878 میں انھیں والسریگل کاؤنسل میں نامزد کیا گیا، 1888 میں نائٹ ہڈ ایک سال بعد 1889 میں، ایڈمبرا یونیورسٹی سے ایک اعزازی ڈگری عطا ہوئی۔ ہوسکتا ہے کہ ان ہی سب چیزوں کی وجہ سے بیک انھیں سیاسی منظرنامے کے مرکز میں لانے میں کامیاب ہوا۔

"اچھا تو یوں ہے"، پردیپ نے سر ہلایا۔

"ہندو قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے بھی ان کے انداز فکر پر اثر

ڈالا ہوگا"۔

"ہندو قوم پرستی؟" پردیپ حیرت زدہ نظر آیا۔

"یقیناً، آخر انیسویں صدی کے ہندستان میں، گائے کشی پر پابندی اور ناگری کو حکومت اور عدالتوں میں رائج کرنے کی مہموں نے بہت زور پکڑا۔ پنجاب میں آریہ سماج ایک اصلاحی و احیاء پرست رجحان کی تشہیر و ترویج کی ہراول بنی، یہ سارے عناصر، ایک ہندو شناخت کے نئے اور ابھرتے ہوئے احساس کے خارجی مظاہر تھے۔ یہ یاد رہے کہ اٹھارھویں صدی کی چھٹی اور ساتویں دہائیوں میں مسلمانوں میں سید احمد بریلوی کا نظریاتی اثر وسیع پیمانے پر پھیلا۔ یونان- ترکی جنگ (1897) نے شمالی ہندستان کے بعض شہروں میں پان اسلامزم کے احساس کو مہمیز لگائی، ساتھ ہی بنگال اور اپر انڈیا کے بعض حصوں میں Islamization نے اتحاد پسندی کے عمل کو کمزور کردیا"۔

"ان اہم اور متضاد رجحانات کے درمیان"، پردیپ نے سوال کیا، "اگر کوئی فرق ہے تو وہ کیا ہے؟"

"یہ بتانا دشوار ہے، پھر بھی، پنجاب، یوپی، بنگال اور مہاراشٹر میں ہندو اصلاحی اور احیاء پرستانہ خیالات کا اجتماع بہت تھا، اسی طرح آریہ سماج، شدھی تحریک اور گائے کے تحفظ کی مہمیں ایک دوسرے کے قریب آرہی تھیں۔ بیسویں صدی کے اختتام تک یہ سب نیشنلسٹ سیلاب میں شامل ہوگئیں۔ ایسی صورت حال مسلمانوں کے یہاں نہیں تھی۔ احیا پرستی کی ان کی تحریکیں مقامی اور وقتی تھیں، یہی وجہ ہے کہ یہ بڑی تیزی کے ساتھ بکھر گئیں۔ انیسویں صدی کے اختتام تک پان انڈین، مذہبی یا اسلامی کوئی مسئلہ موجود نہیں تھا کہ جسے لیڈران اپنے پیرووں اور حمایتیوں کو اکٹھا کرنے میں استعمال کرسکتے"۔

"اس موضوع پر"، پردیپ نے تجویز کیا، "تم شاید پھر کسی وقت زیادہ تفصیل سے بات کرسکتے ہو"۔

"شاید"، عزیز اپنے خیالات کو مجتمع کرنے میں لگ گیا۔

"اس سے پہلے کہ تم آگے بڑھو"، جگ موہن بیچ میں بول پڑا، "ہم ذرا یہ سنیں کہ آخر یہ کیوں ہوا کہ آریہ سماج نے پنجاب میں تو قدم جما لیے مگر کسی اور جگہ اسے موقع نہیں ملا"۔

"مردم شماری کے مطابق"، عزیز نے جواب دیا، "1891 میں آریہ سماجیوں کی تعداد تقریباً چالیس ہزار تھی جو 1951 میں بانوے ہزار ہوگئی۔ 1907 میں ایک سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان کی بڑی تعداد نے خصوصاً یوپی اور اودھ میں، کانگریس کی حمایت کی اور یہ کہ ان کے رگ و پے میں بغاوت بھری ہوئی تھی۔ بسا اوقات انھوں نے اپنے احتجاج کے لیے آریہ پریس اور آریہ پلیٹ فارم کو بھی استعمال کیا۔

"اب"، پردیپ نے کہا، "تم سید احمد کے بارے میں اپنے ذاتی رائے ہمیں بتاؤ"۔

"ان کی کارگزاریوں میں، جو تین دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہیں"، عزیز نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "تم سید احمد کی عوامی حیثیتوں میں خاصی بے ربطی، عدم تسلسل اور ابہام دیکھوگے۔ انھوں نے اپنے مخالفین کے ساتھ رعائتیں کیں اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنے انگریز سرپرستوں کے سامنے بڑی آسانی سے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ مغربی تہذیب اور تمدن پر بے چوں و چرا ریجھے خصوصاً 70-1869 کے اپنے دورۂ انگلستان کے بعد۔ اور آخر میں یہ کہ وہ برطانوی کلونیل ازم کے تفرقہ انگیز کردار کی طرف سے کبھی حسّاس نہیں ہوئے۔ ملک کی دولت اور ملک کے عوام کا انگریزوں نے جس طرح استحصال کیا اور جس کے بارے میں اولین قوم پرستوں نے بہت کچھ کیا اور بہت کچھ لکھا مگر سید احمد نے .ں سب کی طرف سے اپنی آنکھیں بند رکھیں"۔

"لیکن ...."

"پھر بھی ان کی عوامی شبیہہ کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے"، عزیز نے

جگ موہن کا قطع کلام کرتے ہوئے کہا، "مسلم فرقے کی تعلیمی اور سماجی حالت کو بہتر کرنے میں ان کی لگن — وہ دہلی میں کسی عظیم الشان حویلی میں آرام کی زندگی گزار کر مغل ماضی کے شکوہِ رفتہ کی رنگ رلیوں کی داد دے سکتے تھے اور دہلی کی جاندار ثقافتی زندگی میں، غالب جیسے شاعر کی ہمراہی میں سکون و آرام کی سانس لے سکتے تھے۔ مگر اس کی بجائے انھوں نے ناملائم اور ناخوشگوار وادی کا انتخاب کیا اور شہر، صوبے اور ملک پر اپنی چھاپ چھوڑ جانے کے لیے علی گڑھ کی دھول بھری راہ کو اپنا لیا۔ خود اپنی آگ میں جلتے بھنتے اپنے ہم وطنوں کی توقعات کو بڑھاتے اور ان کی ہمتوں کو مہمیز لگاتے ہوئے انھوں نے ان لوگوں میں اعتماد پیدا کیا، انھوں نے وقت کے ساتھ قدم ملایا، ضرورت کی شدت کو سمجھتے ہوئے تبدیلیوں کی ہواؤں کا رخ پہچانا اور اپنے ہم مذہبوں کو برطانوی حکومت کے پیش کیے ہوئے موقعوں کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لینے پر اکسایا۔

"عزیز بھائی"، پردیپ نے کہا، "مجھے یقین ہے کہ تم نے یہ تقریر کہیں اور کی ہے۔ کیا خوش بیانی کتنی بلاغت، کیسی فصاحت۔ اور پھر دلائل کی خوبصورت روانی، واہ"۔

"ہمیں سید احمد کو اپنے معیاروں پر پرکھنے کی خواہش پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ علی گڑھ کا یہ مصلح نہ تو خود کوئی انقلابی تھا اور نہ ہی وہ زمانہ انقلابی تھا جس میں اس نے زندگی گزاری۔ اس کے ہندو، مسلمان اور سکھ ہم عصروں میں بہت سے اس سے زیادہ قدامت پرست تھے۔ بلا شبہہ، اس کا سماجی اور تعلیمی ایجنڈا محدود تھا، مگر ہمیں کچھ علمائے دینیات اور مسلم اشرافیہ کے ایک حلقے کی طرف سے مشترکہ مخالفت کو نہیں بھولنا چاہیے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے اسباب کی بناء پر سید احمد خاں نے تفوق و برتری کے اس مقام سے کام نہیں کیا جو رام موہن رائے یا ایشور چندر ودّیا ساگر جیسے سماجی مصلحین کو ملا ہوا تھا۔ کیا تم جاننا چاہتے ہو کہ حالی نے سید احمد کے بارے میں کیا لکھا تھا؟ حالی کے مطابق دنیا نے دیکھا تھا کہ کس طرح ایک فرد نے سارے ملک کو بیدار کر دیا، کیسے ایک تنہا آدمی نے پورے ایک قافلے کو تباہی

و بربادی سے بچا لیا۔ انھوں نے اُن لعل و جواہر اور ہیرے موتیوں کی بات کی جو مٹی میں ملے ہوئے تھے، اور سونے کے ان ذرّات کی بات کی جو ریت کا حصہ بن گئے تھے"۔

"یہ سب بہت عمدہ ہے"، جگ موہن نے کہا، "مگر انھوں نے کانگریس کی اتنی شدت سے مخالفت کیوں کی؟"

"میں تمھیں بتاؤں۔ ایسا کرنے والے سید احمد ایک اکیلے نہیں تھے۔ بمبئی اور مدراس میں نان برہمن تحریکوں سے وابستہ اچھوتوں کے کچھ گروپ تھے جنھوں نے کانگریس کے ساتھ مخالفوں جیسا سلوک کیا، ان کا ڈر یہ تھا کہ کانگریس کے اعلیٰ طبقے کے اشرافیہ کے اراکین کسی بھی ہندستانی نمائندہ جماعت پر اپنا تسلط قائم رکھیں گے۔ بنیادی طور پر سید احمد نے ایک اتنی متنوع، اتنی منقسم اور اتنی پیچیدہ سوسائٹی میں نمائندہ حکومت یا پارلیمانی حکومت کے اصول کے اطلاق کو منظور نہیں کیا۔ دسمبر 1887 کو لکھنؤ میں انھوں نے بہ بانگِ دہل کہا کہ کانگریس کے مطالبات سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچائیں گے اور زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ متمول بنگالی ہندوؤں کے غلبے کا سبب بنیں گے"۔

"اور اس outburst پر ردّعمل کیا تھا؟" پردیپ نے پوچھا۔

"1885 سے 1901 کے درمیان سالانہ سیشن میں ڈیلی گیٹوں کی حیثیت سے 1620 افراد نے دستخط کیے تھے، ان میں 596 یا یوں کہہ لو کہ ایک تہائی سے کچھ زیادہ یوپی کے مسلمان تھے۔ ان کی تعداد بتدریج بڑھتی رہی، 1886 میں یہ تعداد آٹھ فی صد تھی جو 1889 میں بڑھ کر 42 فی صدی اور 1890 میں 55 فی صدی ہوگئی"۔

"برا نہیں ہے"، پردیپ نے رائے زنی کی۔

"اور"، عزیز نے بات جاری رکھی، "1886 سے 1901 تک ہر دس ڈیلی گیٹوں میں چھ ڈیلی گیٹ ہمارے شہر کے تھے۔ 1888 اور 1892 میں جب الٰہ آباد میں کانگریس کے اجتماع ہوئے تو ان میں مسلمان شرکاء کی تعداد میزبان شہر کے مسلمانوں

کی تعداد سے زیادہ تھی۔ 1889 کے کانگریس سیشن میں 313 مسلمان شریک ہوئے تھے ان میں 288 صرف لکھنؤ سے تھے۔

"بڑھیا"، جگ موہن نے کہا۔

"ڈیلی گیٹوں میں سے کم از کم کچھ نے تو سو سے زیادہ علمائے دینیات کے دستخطوں سے جاری ہونے والے کانگریس کی حمایت کے فتوے کو پڑھا ہوگا"۔ عزیز نے مزید کہا، "فتوے پر دستخط کرنے والوں میں دیوبند کے ایک عالم رشید احمد گنگوہی بھی تھے۔ فتوے نے دیوبند کے علما کے لیے ایک سیاسی منشور کا کام کیا۔ جمیعۃ العلما 1919 میں اپنے قیام کے بعد سے ہی کانگریس دوست تنظیم تھی۔ حسین احمد مدنی اس کے ممتاز لیڈروں میں سے ایک تھے۔ انھوں نے دو قومی نظریے کی مخالفت کی۔ اس سے پہلے یقیناً بدرالدین طیب جی نے سید احمد کے دلائل کو مسترد کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے واضح مفادات کو مرتب کرنے میں کانگریس کو بھرپور کردار ادا کرنے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ اور مسلمان اپنے اجتماعی عمل سے کانگریس کو صرف اُن معاملات تک محدود رکھ سکتے ہیں جن کے زیر بحث لانے میں انھیں کوئی خدشہ نہیں تھا۔ ان کی پالیسی باہر رہ کر کچھ کرنے کے بجائے اندر رہ کر عمل کرنے کی تھی اور ہندستان کی عام بہبود و ترقی کو آگے بڑھانے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی فلاح کا تحفظ ان کا لائحۂ عمل تھا"۔

پردیپ نے کہا، "سید احمد تو بپھر گئے ہوں گے"۔

"ہاں، وہ بہت خفا تھے۔ انھوں نے طیب جی سے کہا کہ ہندستان، یا بحیثیت ایک قوم ہندستان کی عام فلاح جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ مختلف ذاتیں اور مختلف نسلیں ایک قوم سے تعلق نہیں رکھتیں، ان کے مقاصد، ان کی آرزوئیں اور ان کی تمنائیں ایک نہیں تھیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ غلط نام رکھنے والی نیشنل کانگریس کی کارگزاریاں نہ صرف مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھیں بلکہ بحیثیت مجموعی خود ہندستان کے لیے بھی مضرت رساں تھیں"۔

"تم نے کہا تھا کہ 1898 میں سید احمد کا انتقال ہوگیا تھا، ان کی موت کے بعد کیا ہوا؟"

"علی گڑھ کی پہلی نسل کے سب طالب علموں کا خمیر ایک نہیں تھا۔ ایک چھوٹے مگر بااثر گروپ نے سید احمد کے سیاسی ورثے کو تسلیم نہیں کیا اور کانگریس کی سرگرمیوں میں شریک ہوا۔ شاعر حسرت موہانی، عالم شبلی اور صحافی ظفر علی خاں ان ہی لوگوں میں تھے۔ علی گڑھ کے کچھ لوگ یہاں تک گئے کہ انھوں نے تو یہ کہا کہ ان کا انقلابی مزاج سید احمد کی نیتوں سے ہم آہنگ تھا۔

محمد علی نے اعلان کیا ۔

سکھایا تھا تمھیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

"یہ انحراف کیوں؟" پردیپ نے جاننا چاہا۔

"بڑا مسئلہ اپریل 1950 کا ناگری ریزولیوشن تھا۔ یوپی سرکار نے دیوناگری رسم الخط اور اردو کو برابر کا درجہ دیا اور سرکاری ملازموں کے لیے دونوں رسم الخط کی واقفیت پر اصرار کیا۔ مسلم اصحاب رائے کا کہنا یہ تھا کہ ہندی بولنے والوں نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کی طرح اپنی عام تعلیم میں ناگری رسم خط نہیں سیکھا ہے۔ اس لیے یقینی بات ہے کہ وہ بڑی آسانی سے سرکاری ملازمتوں سے علاحدہ کردیے جائیں گے۔ ان کا احتجاج اسی لیے ہے۔ اس خدشے نے بے اطمینانی پھیلائی، اینگلو مسلم یکجہتی کو کمزور کیا اور سیاسی ریڈیکلزم کو پروان چڑھایا۔ سید احمد کے دوست حالی نے اپنے دکھ کا اظہار یوں کیا ۔

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر
اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے

"مگر پھر، مسلم لیگ کی جگہ کہاں ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

"محمد علی نے الزام لگایا کہ 1906 میں کرسمس کے ہفتے میں مسلم لیگ سیشن

ایک مسلط کیا ہوا سیشن تھا۔ نواب محسن الملک اور ایم اے او کالج کے پرنسپل ڈبلیو اے جے آرک بولڈ نے یکم اکتوبر 1906 میں شملہ وفد کی تشکیل کی جزئیات و تفصیلات پہلے ہی سے طے کر رکھی تھیں۔ وہ کانگریس دوست جذبات کو ہلکا کرنا چاہتے تھے مگر ان کی کامیابی بڑی کم مدت کی کامیابی تھی۔ فروری 1907 میں طالب علموں کی ہڑتال کے دوران اور اس کے بعد خود علی گڑھ میں اس کی مذمت کی گئی اور اس کا مذاق اڑایا گیا۔ اور لیگ پر سے، جسے انھوں نے اتنے باجے گاجے کے ساتھ شروع کیا تھا، ان کا کنٹرول ختم ہو گیا"۔

"یہ ایک مسلط کی ہوئی کارگزاری کیوں تھی؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اہم بات یہ ہے کہ وفد نے پہلی پان انڈین مسلم تنظیم کے لیے راستہ کس طرح ہموار کیا۔ وائسرائے نے وفد کے اراکین سے نہ تو ان کے معتبر ہونے کی تصدیق چاہی اور نہ ہی اس نے ان کی حیثیتوں کی کوئی تحقیق کی۔ بس یہ فرض کرلیا کہ یہ لوگ اپنے روشن خیال برادران کے نقطۂ نظر اور ان کی تمناؤں کو پیش کررہے ہیں۔ یہ ایک آسان اور سہل پسندانہ رویّہ تھا، اور یہ انتظامیہ دوست ایک مسلم گروپ کو جواز بخشنے کے لیے انگریز کی مصلحتوں کے عین مطابق تھا۔ بہرحال، کیا تم کبھی ایک خودمختار مسلم تشخص کے وجود کو تسلیم کرنے کے سیاسی عواقب کا تصور کرسکتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہی ہے جس نے اقلیتی سیاست کو بڑھاوا دیا"۔

"فرقہ پرستی اور علاحدگی پسندی نے کیوں نہیں؟" پردیپ نے سوال کیا۔

"اس کا انحصار صورت حال پر ہے۔ بسا اوقات اس اصطلاح کو میں متبادل معنوں میں استعمال کرتا ہوں، لیکن یہ کلونیل یا majoritarian (اکثریت وادی) نقطۂ نظر کو ظاہر کرنے والے ہمہ معنی انداز اظہار ہیں۔ شروع شروع میں مجھے مسلم نیشنلزم کی اصطلاح کو استعمال کرنے میں تکلف ہوتا تھا، مگر آج نہیں ہوتا۔ چوتھی دہائی میں مسلم نیشنلزم اتنی ہی حقیقت تھی جتنی کہ ہندو نیشنلزم — تھی نا؟"

"تم نے کہا کہ لیگ کے قدامت پسند بازو نے اپنی فوقیت گم کردی۔

کیوں؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اسباب تھے، 1911 میں تقسیم بنگال کی تنسیخ، 1911 میں ترکی-اٹلی جنگ، 1913 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی اسکیم کا انکار اور اسی سال کانپور میں مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصے کی مسماری۔ چونکہ ان واقعات نے بڑے پیمانے پر تعلیم یافتہ حلقوں کو ناراض کیا اس لیے انھوں نے کعبے کے تحفظ کے لیے ایک تنظیم انجمن خدام کعبہ کے نام سے قائم کی اور دسمبر 1912 میں قسطنطنیہ کے لیے ایک طبی مشن منظم کیا۔ شبلی نعمانی نے ان کے اندوہ کو اپنی ایک نظم میں بڑے واضح طور پر پیش کیا ہے۔

بکھرتا جا رہا ہے شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک؟

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریضِ سخت جہاں کب تک؟

حریفوں کو گلہ ہے آسماں سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں گے ان کی کھیتیاں کب تک؟

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک؟

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو اب شبلی کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیروان کب تک؟
(شبلی)

جنگ ملتان نے کم از کم کچھ لوگوں میں 'اسلام خطرے میں ہے' کے نعرے کو مقبول بنایا اور ان کے جذبات کو پان اسلامزم کے گرد مرکوز کردیا۔ اس زمانے میں مسلم سیاسی زبان کی لفظیات کا زور اشرافیہ کے مفادات کے تحفظ کے بجائے مسلم جماعتی شناخت کی زیادہ جذباتی، زیادہ اجتماعی اور عوامی علامتوں پر ہوگیا"۔

"کیا تم اس کے لیڈروں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟" جگ موہن نے توجہ دلائی۔ میں نے آزاد، انصاری، اجمل خاں، علی برادران اور حسرتؔ موہانی کے بارے میں سنا ہے۔ میرے چچا پنجاب میں رولٹ ستیہ گرہ کے ایک ہیرو سیف الدین کچلو اور لاہور کے اخبار "زمیندار" کے اڈیٹر ظفر علی خاں کا ذکر کرتے ہیں"۔ مجھے اس وقت مولانا محمد علی کے چند اشعار یاد آرہے ہیں کہ جو انھوں نے جیل میں کہے تھے۔

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر آن تسلی ہے ہر آن تشفی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی ہر دم ہیں مداراتیں

کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں
ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر
ٹلتی نہیں یوں جوہرؔ اس دیس کی برساتیں

(محمد علی جوہرؔ)

اگر تمھارا اصرار ہے تو لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں اس وقت کیا ہو رہا تھا اس کو بتانے کے لیے مجھے اجازت دو کہ میں ایک نسبتاً کم مشہور مگر دلچسپ شخصیت کی زندگی کی کہانی سناؤں۔

"ایکسیلنٹ"، پردیپ نے خوش ہو کر کہا۔

"ولایت علی بمبوق، جنھیں میں ایک دھندلاتے ہوئے ماضی سے باہر لا رہا ہوں، سنجیدہ نیت والے ایک مزاح نگار تھے۔ یہ ایک ذہنی اور سیاسی ہیجان کی پیداوار تھے۔ ہیجان جو اس صدی کی پہلی دو دہائیوں میں شمالی ہند کے مسلم دانشوروں میں پھیلا ہوا تھا۔ علی گڑھ کالج کے گرد مرکوز اس ہیجان کو ہندستان اور ترکی دونوں جگہ کے

واقعات نے اور ہوا دی۔

ان کا زمانہ جدوجہد آزادی کی تشکیل کا زمانہ تھا۔ ہندستانی منظرنامے پر گاندھی جی کے پیش رو گوکھلے، سریندرناتھ بنرجی اور تلک، مختلف طریقوں سے نیشنلزم کو بلوغت کی منزل تک پہنچانے کی سعی میں لگے ہوئے تھے۔ سودیشی تحریک کے آغاز کے بعد، قومی اور بین الاقوامی منظر پر آنے والے ہر نئے واقعے نے قومی جذبات کو مہمیز لگائی۔ اسی کے ساتھ ہی اسلامی دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات مسلمانوں کو ہندستانی نیشنلزم کی مرکزی لہر میں دھکیل رہے تھے۔ 1909 میں نوجوان ترک انقلاب ترکی میں ہوا۔ ترکی، اسلام کی عظمت رفتہ اور آج اسلام کے دنیاوی مرتبے کی ان کی توقعات کی مسلم یادوں کا مرکز۔

اس کے دو سال بعد جب برطانیہ اور فرانس نے سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی اپنی کوششوں کو پھر سے شروع کیا، تو ترکی کے لیے شدید خوف و ہراس پیدا ہوگیا۔ 1911 میں برطانیہ نے مصر پر اپنا تسلط شروع کیا، اٹلی تری پولی کی فتح کے لیے چل پڑا، اگلے سال روس، انگلستان اور فرانس کی اعانت اور ملی بھگت سے چار بلقانی ریاستوں نے مقدونیہ میں اپنے کرسچن بھائیوں کو آزاد کرانے کے عہد کے ساتھ ترکی کے ساتھ جنگ کا اعلان کردیا۔

جنگ بلقان نے، جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا، ہندستانی مسلمانوں میں شدید بے چینی پیدا کردی۔ ترکی موقف کی حمایت میں مسلم پریس نے بڑے گرما گرم مضامین لکھے اور اردو شاعروں نے بلقان کے میدان جنگ میں ترکی جرنیلوں کی شجاعت و مردانگی کے گیت گائے۔ انصاری، بعد کو 1927 میں کانگریس صدر، ایک طبی مشن کے ساتھ قسطنطنیہ گئے۔ برطانیہ مخالف جذبات کی ایک زبردست جوالا پھوٹ پڑی، اس کا اظہار انتہائی سخت لب و لہجے میں محمد علی نے اپنے انگریزی اخبار ''کامریڈ'' میں اور مولانا آزاد نے اپنے اردو جریدے ''الہلال'' میں کیا۔ میں نے تمھیں شبلی کی نظم سنائی تھی، سنائی تھی نا؟ میں نے تمھیں جو بات نہیں بتائی وہ یہ تھی کہ ترکی جرمنی کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کے خلاف صف آرا تھا اور مسلمانوں اور نیشنلسٹوں دونوں کی

ہمدردیاں بنیادی طور پر جرمنی کے ساتھ تھیں۔ مسلم لیڈروں نے مغربی ایشیا کے مسلم ملکوں کو ہندستان پر حملہ کرنے پر راضی کرنے کے لیے متعدد ناکام منصوبے بنائے۔ اسی طرح کے مشن پر ہندو نیشنلسٹ لیڈر بھی ہندستان سے جرمنی اور جاپان کی طرف فرار ہوئے۔ علی برادران اور آزاد جنگ کے زمانے میں نظربند تھے"۔

میرا قیاس ہے کہ ان واقعات نے دوستی کے ان معاہدوں کو دریا بُرد کردیا جو سید احمد مسلمانوں اور ان کے حاکموں کے درمیان کرانا چاہتے تھے"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو، مسلمان نوجوانوں کے ایک روز افزوں گروپ نے، جس میں بمبوتی بھی شامل تھے۔ مسلم لیگ کو کانگریس سے قریب لانا شروع کیا۔ اس کا ایک بیّن نتیجہ دسمبر 1916 کا "لکھنؤ پیکٹ" تھا۔ اس معاہدے کی ضرورت اِن توقعات کی بنا پر پیدا ہوئی کہ اتحادی جو آزادی اور حریّت کے لیے لڑ رہے تھے وہ اپنی اپنی نوآبادیوں میں سلف گورنمنٹ کے موقف کو فروغ دیں گے۔ اس کا قابل ذکر پہلو یہ تھا کہ کانگریس نے علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب کو منظور کرلیا تھا"۔

"اس کے معمار جناح نہیں تھے کیا؟" پردیپ نے سوال کیا۔

"ہاں"، عزیز نے جواب دیا، "اور تِلک بھی۔ لیکن ہندو مہاسبھا کی پیش رو ہندو سبھاؤں نے الگ حلقہ ہائے انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی کی مخالفت کی۔ ہمارے صوبے میں احساس شدید تھے جہاں مسلمانوں کو تیس فی صدی نشستیں دی گئی تھیں حالانکہ وہاں ان کی تعداد چودہ فی صدی سے زیادہ نہیں تھی۔ لکھنؤ پیکٹ نے مدن موہن مالویہ اور سی.وائی. چنتامنی کو بہت مضطرب کردیا"۔

"ہمیں اتنی ہی معلومات کی ضرورت تھی، میرا خیال ہے کہ اب ہمیں آگے بڑھنا چاہیے"، جگ موہن نے مشورہ دیا۔

لکھنؤ پیکٹ کے بعد سے کانگریس اور مسلم لیگ نے مل کر کام کرنا شروع کیا۔ ان کے مشترکہ اجلاس روایت بن گئے اور انھوں نے گاندھی اور ان کے خلافت کے ساتھیوں کو اپنی مہم کے لیے زیادہ وسیع پلیٹ فارم مہیا کردیے۔ ان کی زیرقیادت

ہندو اور مسلمان عدم تعاون کی تحریک میں ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھے۔ آریہ سماجی شردھانند کو دہلی کی جامع مسجد میں بلانا ہندو مسلم اتحاد کا نقطہ عروج تھا۔ بموق اس دن کو دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے۔ 1918 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ قضا نے تینتیس سال کی عمر ہی میں شمع گل کردی"۔

"عزیز بھائی، ایسا لگتا ہے کہ تم کانگریس اور مسلم لیگ کے معاہدے کو مناسب سمجھتے ہو، سمجھتے ہو نا؟" پردیپ نے سوال کیا۔

"ہوں، فرقہ وارانہ نمائندگی کو مان لینا کانگریس کے موقف سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اگر ہمارے ملک میں مسلمانوں کے مفادات یکساں نہیں تھے تو مذہب کی بنیاد پر کسی علاحدہ کیٹیگری میں انھیں کیوں کر رکھا جاسکتا تھا؟ کانگریس کو وقتی سیاسی فائدوں کی خاطر جلدی میں کیے گئے معاہدوں کو قبول نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے اسے ایک مصمم نظریاتی مہم کے ذریعے اکثریت واد اور اقلیت واد دونوں کو دبانا چاہیے تھا۔ اسے ہماری سیاست میں ایک الگ مسلم شناخت کی تخلیق کی مخالفت کرنا چاہیے تھی۔ میرے یہ کہنے کا سبب یہ ہے کہ علاحدہ حلقہ انتخاب اور ریزرویشنز نے بالآخر ہندوؤں سے الگ کلونیل شبیہہ میں ایک متحد اور مربوط مذہبی - سیاسی اکائی کو جنم دیا۔ مزید یہ کہ انھوں نے مذہب پر مبنی سیاست کے لیے جگہ پیدا کی اور اشتمالی (communitarian) شناختوں کو بڑھاوا دیا۔ دعائیں دیجیے برطانوی پالیسیوں کو جنھیں کانگریس نے اپنے لیڈروں اور کارکنوں میں جواز بخشا اور مسلمان، ذاتوں اور قبیلوں کے مماثل قرار پائے اور سیاسی اسکیموں میں انھیں جگہ ملی۔ اس صورت حال نے، وقت گزرنے کے ساتھ خود ساختہ مسلم لیڈروں کو ایک معروضی طور پر متعین کمیونٹی کی نمائندگی کرنے اور سرپرستی، ملازمت اور سیاسی ذمہ داریوں کو حاصل کرنے میں دوسروں کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کی۔

اس موضوع پر مزید کچھ کہنے کے لیے ہوسکتا ہے کہ آئندہ میرے پاس اور کچھ ہو، اس وقت تو میں اس فضا اور اُس ماحول کو پیش کرنا چاہتا ہوں جس میں بموق علی گڑھ میں پلے بڑھے اور اپنے مختصر عرصۂ حیات میں، بعد کو جس ماحول میں انھوں

نے لکھا۔ وہ ایک ایسی تحریک سے متعلق تھے جس کے سامنے بہت سے مقاصد تھے۔ بہر حال اگر ان کے معاصرین اور ان کے دوستوں نے عوامی پلیٹ فارموں پر لچھے دار تقریریں کیں تو انھوں نے برطانوی راج پر قہقہے لگائے اور اپنے خاکوں اور اپنے ڈراموں میں ان کا مذاق اڑایا"۔

1887 میں مسولی گاؤں میں پیدا ہونے والے بموق بارہ بنکی ضلعے کے قدوائی شرفا سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ اپنا سلسلہ ترکی کے ایک تارک وطن سے ملاتے ہیں جو شہاب الدین غوری کے حملے کے زمانے میں ہندستان آئے۔ ان ترکی تارک وطن کا نام قدوۃ الدین تھا اور وہ روم کے سلطان اور قلمرو کے قاضی کے بھائی تھے۔ انھیں بہرحال ان کی بیوی اور بیٹے کے ساتھ جلاوطن کردیا گیا۔ مختلف ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد وہ اجمیر کے ولی خواجہ معین الدین چشتی کے پاس پہنچے۔ خواجہ صاحب کے اثر و فیض سے انھیں دہلی کی سلطنت میں ترجیحی حیثیت ملی۔ ان کے بیٹے نے دربار کے ایک رئیس کی بیٹی سے شادی کی۔ خود قدوۃ الدین نے بہار کے سرکش سرداروں کے خلاف اودھ کی طرف جانے والی ایک مہم کی قیادت کی۔

1201 میں انھوں نے جگدیوپور، بارہ بنکی میں آج کا جگور کے بہار راجہ پر چڑھائی کی اور 52 گاؤں کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کیا جو ان کی جاگیر ہوگئی۔ قاضی قدوائی نے، بعد کو وہ اسے نام سے جانے جاتے تھے۔ 1207 میں ایودھیا میں انتقال کیا۔

بموق کے بیٹے انور جمال قدوائی نے مجھے بتایا کہ قاضی قدوائی کے اسلاف دہلی کے سلاطین اور اودھ کے نوابوں کے زیرسایہ بڑے خوشحال اور متمول ہوئے۔ ایک زمانے تک اس سلسلے کے نوجوان نواب کی فوج کے اعلیٰ دستوں میں بھرتی ہوتے رہے۔ لیکن بکسر کے مقام پر برطانوی توپوں نے قدوائی اشرافیہ کے پھولوں کو تہس نہس کردیا۔ اس کے بعد، قدوائیوں کے اثر و رسوخ میں کمی آئی اور وہ بارہ بنکی ضلع میں محدود ہوکر رہ گئے مگر یہاں کے زمین دار اشرافیہ میں یہ لوگ پھر بھی ایک موقر عنصر رہے۔ ان میں سے بعض ضلعے کے سب سے بڑے جاگیرداروں میں تھے، باقی لوگ بہت بڑی تعداد میں اجداد کی چھوڑی ہوئی اور ہمہ وقت تقسیم ہوتی ہوئی زمینوں

کے مالک ہوئے اور چھوٹے چھوٹے زمین دار بن گئے اور ایک اچھی خاصی برادری بنالی۔ انگریزوں کے عہد کے دوران، یہ لوگ زوال آمادہ جاگیردارانہ نظام میں، نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ انحطاط کا شکار ہوتے رہے"۔

حسن اتفاق دیکھیے، اس نظام کا جس سے ان کی روزی روٹی وابستہ تھی، آخری اور قطعی خاتمہ ایک قدوائی ہی کے ہاتھوں ہوا۔ یوپی کی کانگریسی وزارت میں رفیع احمد قدوائی ریوینیو منسٹر تھے انھوں نے 1939 میں ٹینینسی ایکٹ بنایا جس نے زمین داری کے نظام کو بالکل مفلوج و معذور کردیا۔ اس کے بعد 1946 میں انھوں نے وہ تاریخی ریزولیوشن پیش کیا جو زمین داری نظام کی موت کا اعلان تھا۔ رفیع، ببوق کے چہیتے بھانجے تھے۔

قدوائی سلسلے کی یادیں، ببوق کے دادا شجاعت سے آگے شاذ ہی گئی ہوں گی۔ وہ مُفصِّلات کے ایک جفاکش اور تندمزاج تعلقدار تھے۔ وہ 1857 سے قبل نوابان اودھ کے آخری پُر آشوب زمانے میں تھے۔ وہ لاقانونیت کا زمانہ تھا، جب چور زمیندار، حریص ریوینیو افسر اور لٹیرے فوجی چھوٹے زمین داروں کی ریاستوں کو لوٹتے کھسوٹتے، ان کی جائدادوں کو ہڑپ کرتے اور ان کے مطالبات کو نہ ماننے والے گاؤں کو تاراج کرتے تھے۔ شجاعت علی نے ایسے دراندازوں سے مدافعت کی خاطر مسلح سپاہیوں کی ایک جماعت رکھ رکھی تھی۔ اسی وجہ سے ان کی متلاطم زندگی کا زیادہ حصہ، پڑوسی زمین داروں اور لگان وصول کرنے والوں سے، آم کے باغوں اور دیہی شاملات میں ہونے والی جھڑپوں میں صرف ہوا۔ فتح و کامرانی کی یہ جھڑپیں دیہات کے لوگوں کی یادوں میں بڑی بڑی لڑائیوں کی شکل میں موجود ہیں۔ آلہ اودل کے طرز پر اودھی بولی میں لکھی ہوئی آم کے باغوں میں ہوئے ان معرکوں کی ایک کہانی، گاؤں کا ایک لوک گائک گاتا پھرتا تھا۔

ببوق کے والد، ممتاز علی اودھ کے برطانوی تسلط کے بعد کے پُرسکون دنوں سے ہم آہنگ ایک شریف اور نرم دل آدمی تھے۔ وہ بہرحال اپنے فینس کی پہنچ والی دنیا سے آگے کی دنیا سے بھی واقف تھے۔ وہ لکھنؤ سے اخبار منگوانے والے پہلے

شخص تھے اور مسولی کے واحد تعلقدار تھے جس نے اپنے بچوں کو مغربی تعلیم کے لیے بھیجا۔ ان کے چھوٹے بیٹے ولایت علی اپنے ایک ایسے خاندان میں عجیب و غریب اور غیر معمولی نکلے جس میں نہ تو پچھلی نسلوں میں اور نہ ہی موجودہ نسل کے کسی فرد میں ذہنی صلاحیتوں کی کوئی غیر معمولی علامت نظر آتی ہو۔ پندرہ برس کی عمر میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں دسویں کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد انھیں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ جلدی ہی اپنے قلمی نام بمبوق کے نام سے مزاحیہ مضامین اور طنزیہ خاکے لکھنے والے کی حیثیت سے جانے جانے لگے۔ بہت دن نہیں لگے کہ وہ ظریف طبع، انقلابی دانش وروں اور محفل، اچھے کھانے اور ذہین گفتگو کے رسیا لوگوں کے ایک زندہ دل گروہ کا مرکز توجہ بن گئے۔ یہاں ان سب نے سیاسی احتجاج کو شگفتہ مزاجی، تمسخر، طنز اور ہجوگوئی سے ہم آمیز کیا۔ ان کے معبود مجازی تھے، محمد علی اور ڈاکٹر انصاری اور ینگ ٹرک ریولیوشن کے لیڈر جنھوں نے سلطنت عثمانیہ کی اصلاح کرنے اور اسے توانا کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔

ڈاکٹر انصاری کی عوامی زندگی کا قابلِ توجہ پہلو یہ تھا کہ ان کی پان اسلامی دل چسپیوں نے پہلی عالمی جنگ سے قبل ان کے بڑھتے ہوئے نیشنلزم کی نفی نہیں کی۔ بعد کو بھی انھوں نے مسلمانوں میں قوم پرستی کے احساسات کو فروغ دینے کی بہت سی کوششوں کی سرپرستی کی اور 1929 میں نیشنلسٹ مسلم پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پارٹی نے اپنے انتہائی مفاہمت پسندانہ اور سیکولر موقف میں فرقہ وارانہ تحفظات کو ایک آزاد اور متحد ہندستان کا ابطال یا اس کی تردید قرار دیا۔ اور سماجی انصاف کو کمیونٹی کے مفادات پر ترجیح دی۔ ان رجحانات کو انصاری نے بہت بڑھاوا دیا خصوصاً 1927 میں کانگریس کے صدر کی حیثیت سے اور کانگریس کے سکریٹری کی خدمات انجام دیتے ہوئے متعدد بار۔ ان کے عروج کا سنجوگ فرقہ پرستی کے سیلاب کا رخ موڑنے کی بہت سی دوسری کوششوں سے ہوا، کوششیں جو کامیابی کی چند مثالوں کے باوجود عام طور پر ناکامی پر ختم ہوئیں۔

"میں یہ کہہ رہا تھا کہ محمد علی اور ڈاکٹر انصاری ہی بمبوق گروپ کے ہیرو

نہیں تھے۔ ان لوگوں نے اکبر الہٰ آبادی سے بھی تحریک و ترغیب حاصل کی۔ اکبر الہٰ آبادی نے مغربی امپریل ازم پر رائے زنی کی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کی حکومت کی چالوں پر تنقید کی — اقبال کی نظموں کا بھی چرچا ہوا۔ پنجاب کے اس منکسر المزاج، شرمیلے اور گوشہ نشین بیرسٹر کا نام اردو دنیا میں بڑا مانوس نام تھا۔ انھوں نے اُس اقبالؔ سے محبت کی، جس نے عوام کو عمل کے لیے کھڑے ہوجانے پر اکسایا، اقبالؔ جس نے مسلمانوں ہیروز کو ان کی حقیقی عظمت و شکوہ کے ساتھ متعارف کرایا، اقبال جس نے اپنی نئی تاویلات سے ان احکام قرآنی میں جان ڈال دی جو فلسفیانہ تخیلات پر مبنی تھے۔ اقبالؔ کی حب الوطنی کی نظمیں اور اسلام دوست اشعار بمبوق کی موت کے بعد بھی بہت دنوں تک اُن کے دوستوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔ 'بانگِ درا' میں صقلیہ کے عنوان سے اقبال کی ایک نظم جزیرۂ سسلی کے بارے میں ہے۔ سسلی جو کبھی یورپ میں مسلمانوں کا مضبوط قلعہ ہوا کرتا تھا۔ یہ نظم اسی کی نیرنگیوں اور اس کے نشیب و فراز کے بارے میں ہے"۔

پردیپ نے عزیز سے اصرار کیا کہ وہ نظم سنائے۔ عزیز نے نظم کے پہلے بند کو چھوڑ کر باقی اشعار بغیر کسی تکلف کے نظم سنا دی۔

آہ اے سسلی! سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو

زیب تیرے حال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلّی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام
موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی
ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں
تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا
(اقبالؔ)

بمبوق کے زمانے میں علی گڑھ، انصاری اور علی برادران کے لیے جو نیشنلزم اور پان اسلامزم کے ایک امتزاج کی تبلیغ کررہے تھے، stumping ground تھا۔ یہ ایسے غیر معمولی نوجوان لوگوں کا گہوارہ تھا جن کے بارے میں سیاست، ادب اور صحافت وغیرہ کے میدان میں آنے والی دہائیوں میں بہت کچھ سُنا جاتا تھا۔ بمبوق کے معاصرین میں سید محمود تھے جو بعد کو کانگریس کے جنرل سکریٹری ہوئے اور آزادی کے بعد ایک وزیر۔ خلیق الزماں اور شعیب قریشی تھے جو 1930 تک اہم حیثیتوں میں

کانگریس کی ہمنوائی کرتے رہے مگر بعد کو مسلم لیگ میں شامل ہوگئے۔ راجہ غلام حسین، گروپ کے ذہین ترین صحافی محمد علی کے ولولہ خیز اخبار "کامریڈ" کے نائب مدیر ہوئے اور بعد کو لکھنؤ سے نکلنے والے "نیوایرا" کے اڈیٹر بنے۔ اودھ پنچ کے اڈیٹر سجاد حسین، لیگ کے انقلابی بازو کے ایک ممتاز فرد، عبدالرحمٰن بجنوری، ان حضرات کے علاوہ سجاد حیدر یلدرم اور عبدالماجد دریا آبادی جیسے ادیب، جاگیردار خاندانوں کے لڑکے، جن کی پچھلی نسلوں نے کبھی اپنی روزی نہیں کمائی، وہ خالی پیٹ بھی نہیں تھے کہ برطانوی راج کے خلاف جذبات سے بھڑکے ہوئے ہوتے۔ نیشلسٹ احتجاج ابھی تک تعلیم یافتہ مڈل کلاس کا مسئلہ تھا۔ جنگِ آزادی ابھی تک الفاظ سے لڑی جارہی تھی۔ یہ سیاسی منظرنامے کی ایسی قسم تھی جس میں ادیب اور مقرر بہت جلدی سامنے آئے۔ بمبوق نے ایک ادیب کی حیثیت سے بڑی تیزی کے ساتھ اپنا مقام پیدا کرلیا۔ جب راجا غلام حسین "کامریڈ" کے باقاعدہ نائب مدیر ہوئے، بمبوق ان کے اخبار میں اپنے قلمی نام سے مزاحیہ کالم بڑی باقاعدگی سے لکھتے رہے۔ بمبوق اور محمد علی میں دوستی بھی بہت گہری ہوگئی۔

بمبوق علی گڑھ سے بارہ بنکی منتقل ہوئے مگر دوستیوں کے یہ بندھن بدستور رہے۔ وہ بارہ بنکی سے 18 میل دور لکھنؤ کی ادبی اور سیاسی زندگی میں سرگرمی کے ساتھ شریک رہے۔ وہ "کامریڈ" کے علاوہ دو اردو رسالوں میں بھی لکھتے رہے۔ "اودھ پنچ"، اور "معلومات"۔ "اودھ پنچ" سجاد حسین کی ادارت میں نکلتا تھا اور معلومات کے اڈیٹر تھے عبدالوالی۔ جنگ کے زمانے میں علی برادران چھندواڑہ میں نظربند کردیے گئے اور "کامریڈ" بند ہوگیا۔ بمبوق چھندواڑہ گئے اور محمد علی سے گفتگو کے دوران لکھنؤ سے ایک دوسرا انگریزی اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح راجہ غلام حسین کی زیرادارت، 1916 میں "نیوایرا" کی اشاعت کا آغاز ہو۔ اخبار کی مالی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بمبوق اور ان کے دوستوں نے اپنے اپنے پاس سے فنڈ فراہم کیا۔ یہ رسالہ شان سے نکلا مگر بہت کم دنوں تک چلا۔ لیکن پھر بھی اس مختصر عرصے میں اس رسالے نے 1917 میں "کامریڈ" کے بند ہونے سے مسلم صحافت میں جو خلاء پیدا ہوگیا تھا

اُسے ضرور پُر کردیا۔ 1917 میں غلام حسین سڑک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہوگئے۔ حکومت نے "نیوایرا" سے ایک نئی ضمانت کا مطالبہ کیا جو یہ دے نہیں سکا اور نومبر 1917 کے آخری دنوں میں رسالہ بند ہوگیا۔

ان تعلقات اور ان رابطوں کی بناء پر، بارہ بنکی میں بمبوق کا گھر مسلم سیاست کی سرگرمیوں کا ایک مرکز بن گیا۔ لکھنؤ میں سرگرم، ان کے علی گڑھ کے پرانے دوست اکثر سنیچر اتوار کے روز یہاں جمع ہوتے۔ یہ سب نوجوان تھے اور ادب اور سیاست کے افق پر اپنی آمد کا اعلان کرنے والے تھے۔ بارہ بنکی میں پریکٹس کرنے والے، بمبوق کے وکیل دوست عزیز انصاری، کے وسیلے سے، ان کے چچازاد بھائی ڈاکٹر انصاری بھی اس حلقے میں شامل ہوئے۔ یہاں کے سیاسی مباحثے لطیفوں، چٹکلوں اور قہقہوں سے پُر ہوتے تھے۔ یہیں کانگریس اور مسلم لیگ کے آئندہ جلسوں کے لیے تجاویز لکھی جاتیں اور منشور تیار ہوتے۔ یہ سب کے سب جاگیردارانہ حسنِ اخلاق رکھ رکھاؤ اور جدید تعلیم سے آراستہ وجیہہ اور خوبصورت نوجوان تھے۔ یہاں یہ لوگ آرام کرسیوں پر دراز رہتے، نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ حقّوں کے دم لگاتے، ہوا میں خوشبودار تمباکو کا دھواں اڑاتے، اردو اور فارسی کے اشعار سنتے اور سناتے، اپنی کہی ہوئی نظمیں اور غزلیں پڑھی جاتیں، اپنے لکھے ہوئے افسانے اور کہانیاں سنائی جاتیں یا پھر گرماگرم سیاسی بحثیں ہوتیں۔

ان سب کے درمیان ایک چھوٹا سا، موٹا سا اور شرمیلا لڑکا میزبانی کے فرائض انجام دیتا، زنانے مکان سے مردانے تک بھاگ بھاگ کر کام کرتا۔ ان لوگوں کو یہ گمان بھی نہیں تھا کہ یہی لڑکا آزادی کی راہ پر ایک دن ان کا ہم سفر ہوگا اور جب ان میں سے اکثر راہ میں تھک تھک کر بیٹھ چکے ہوں گے، یہ لڑکا خاموشی اور عزم کے ساتھ منزل پر پہنچ جائے گا۔ یہ چھوٹا سا، موٹا سا شرمیلا لڑکا تھا رفیع احمد قدوائی۔

عزیز نے اپنی بات کو جاری رکھنے سے پہلے تھوڑا توقف کیا۔

بمبوق کا گھر ایک کے بعد ایک سیاسی ہنگامے اور جوش و خروش کا گھر تھا۔

ینگ ٹرک ریولیوشن کے وقوع پر بموق کے جذبات ایسے بھڑکے، جوش و خروش رگ و پے میں کچھ ایسا سرایت ہوا کہ انھوں نے اپنے لڑکوں اور اپنے بھانجوں بھتیجوں کے نام ترکی جرنیلوں کے نام پر رکھے۔ جنگ ملتان کے زمانے میں وہ اقبال کی مشہور نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ پڑھتے اور روتے تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن کے لیے چندہ بھی جمع کیا، پہلی عالمی جنگ شروع ہونے پر ان کا سارا گروپ جنگ میں جرمنی کے نشیب و فراز کا بڑی دلچسپی سے جائزہ لیتا، جرمن کامیابیوں پر خوش ہوتا اور اس کی ناکامیاں اُسے مغموم کردیتیں۔ شریف حسین کے حملے کے وقت 1916 میں یہ اپنے خاص سرپرست راجہ آف محمود آباد کے یہاں جانے والے ایک وفد میں شریک ہوئے اور انھیں اپنی مایوسیوں اور دل شکستگیوں سے آگاہ کیا۔ 1916 میں کانگریس اور لیگ کے لکھنؤ سیشن کے دوران بموق اور ان کے دوستوں نے ایک میمورنڈم پر بہت بحث کی جو وہ جناح کو بھیجنا چاہتے تھے اور جس میں انھوں نے اُن کے صدارتی خطبے کے لیے کچھ مشورے دیے تھے۔ بہت عرصے بعد، اس گروپ کے چند اراکین نے جو بقید حیات تھے، دعویٰ کیا کہ جناح نے ان کی بہت سی تجاویز کو اپنی تقریر میں شامل کیا تھا۔ آخر میں، جب بارہ بنکی کے ضلع مجسٹریٹ نے اینی بسنٹ کی نظربندی کے خلاف ہونے والے احتجاجی جلسوں پر پابندی لگائی تو بموق کا گھر سیاسی سرگرمیوں کا اڈّا بن گیا۔

لکھنؤ کے سیاسی اور ادبی خواص کے درمیان بموق کا صرف ایک پاؤں تھا، ان کا دوسرا پاؤں، بڑی مضبوطی کے ساتھ اپنے خاندان کے ماضی میں تھا، انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں اُن اقدار اور نجی خوبیوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی جو انھیں اپنے خاندان کے ماضی سے ملی تھی۔ مہمان نوازی، سعادتمندانہ پرہیزگاری دوستی میں استواری اور اُن روایات سے انحراف سے انکار جن میں ان کی پرورش ہوئی تھی۔ ان کا گھر مہمانوں اور غریب رشتہ داروں سے بھرا رہتا تھا۔ مقامی ہائی اسکول میں، گاؤں کے ہر لڑکے کے لیے ان کے گھر کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور قیام و طعام کا مفت انتظام تھا۔ ضلع کی عدالتوں میں مقدمات اور دوسرے کاموں کے سلسلے میں آنے والے

جوار کے دیہاتیوں کے لیے ان کا گھر مفت سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کا گھر مقامی نیشنلسٹ احتجاجیوں کا اڈّا تھا اور لکھنؤ سے آنے والے سیاست دانوں اور صحافیوں کے لیے قرارگاہ۔ اس گھر میں دیہی کھردرے پن اور شہری نفاستوں کا چولی دامن کا ساتھ تھا اور دیہاتوں کے گنوار اور قصبے اور شہر کے نفاست پسند شرفاء ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔

انور جمال قدوائی کے بڑے بھائی مِدحت کامل قدوائی اکثر بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ان کے والد نے کس طرح ہر اس رشتے اور دوستی کو انتہائی گرم جوشی سے اپنایا اور نبھایا جو انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ اپنے شہری حال میں، اپنے دیہی ماضی کے در آنے پر انھیں کبھی ندامت یا شرمندگی نہیں ہوئی۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ ذہین اور زیرک علیگ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہیں، شعر و شاعری کا چرچا ہے، یا کسی سنجیدہ سیاسی مسئلے پر گرماگرم بحث چھڑی ہوئی ہے کہ کوئی گنوار، گھٹنوں تک دھوتی اٹھائے ہاتھ میں اپنے قد سے بڑا لٹھ لیے داخل ہوتا ہے۔ بمبوق اسے دیکھتے ہی لپکتے ہیں اور اسے گلے لگا لیتے ہیں، اور اپنے ساتھیوں کو بتاتے ہیں کہ یہ فلاں فلاں رشتے سے میرے چچا یا چچازاد بھائی لگتے ہیں۔ ان کی فیاضی اور فراخ دلی راز تھی۔ اس کا انحصار ان کی آمدنی اور قرض حاصل کرنے کی ان کی صلاحیت پر تھا۔ وہ جوں ہی اپنے خستہ حال مہمان کو کونے میں لے جاکر اس کے کان میں کچھ کہتے تو گھر والے سمجھ جاتے کہ کچھ روپے اسے دیے جارہے ہیں۔ ان کی سخاوت کے بہت سے قصّے ان کی موت کے بعد آبدیدہ بیواؤں کے ہونٹوں پر آئے اور بہت سے لوگوں کو معلوم ہوئے''۔

پردیپ کو یاد آیا کہ اسے خاندان کی ایک شادی میں جانا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ چلا گیا اور پھر جگ موہن بھی۔

عزیز ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی ٹھہرا رہا، سگریٹ پیتے ہوئے اور سوچتے ہوئے۔

''جہاں ذہن خوف و ہراس سے پاک ہوتا ہے اور سر اونچا رہتا ہے
جہاں دنیا ذاتی دیواریں بنا کر ٹکڑے ٹکڑے نہیں کردی گئی ہوتی ہے''۔

اپنی آزادی کی تڑپ کے ٹیگور کے اس اظہار کے چھ سال بعد جولائی 1918 میں بمبوق کو کالرا ہوا، ڈاکٹر انصاری جو اس وقت لکھنؤ آئے ہوئے تھے، بھاگ کر بارہ بنکی گئے، مگر وہ بمبوق کو بچا نہ سکے۔ دو دن بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ بیگم انیس قدوائی، خود جن کے شوہر شفیع احمد قدوائی اکتوبر 1947 کے فسادات میں مار دیے گئے تھے، مسولی میں اپنے والد کی خاموش تجہیز و تکفین کو بیان کرتے ہوئے آب دیدہ تھیں۔

بمبوق کے مضامین، زبردست ذاتی سحر، حسن مزاح اور انتہائی انسانیت کی حامل شخصیت کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ ہیں۔ ان کے سیاسی معرکے انتہائی سنجیدہ تھے مگر ان کا اظہار مزاحیہ اور طنزیہ تھا۔ اپنے خاکوں اور اپنے چھوٹے چھوٹے اسکیٹس میں انھوں نے اس دوغلی تہذیب کا بہت مذاق اڑایا جو ہندستان میں انگریزی راج کے تحت جنم لے رہی تھی۔ ان کے خاکوں کے نگار خانے میں اپنے 'صاحبوں' کی نشست و برخاست کے طریقوں اور ان کے انداز گفتگو کی نقل کرنے والا انگلینڈ پلٹ بیرسٹر ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ انگلینڈ کے چند مہینوں کے قیام میں وہ خود اپنی زبان بھول گیا ہے۔ پٹواری سے لے کر ڈپٹی کلکٹر تک کے ہندستان کے بابو کلچر کے اُن نمونوں کو دیکھیے۔ جو گوری چمڑی والے اپنے آقاؤں کے سامنے اپنی کمتری کے اظہار اور عام آدمی کے ساتھ بددماغی سے پیش آنے میں مُضحک لگتے ہیں۔

ایک اعلیٰ ادبی حیثیت رکھنے والے ان خاکوں نے بمبوق کو ان مسلم دانشوروں میں مقبول و معروف بنادیا جو مغربی تعلیم کے افق پر دیر سے آنے والوں میں تھے اور جنھیں ان کے درمیان انگریزی زبان کی صحافت کی بہتات نے اپنے احساس کمتری سے نجات دلائی تھی۔ اپنی بقا کے ان کے دعوے کی بنیاد، اس عہد کی سماجی تاریخ کا ان کے ایک جزو ہونے پر ہے۔

"کامریڈ" میں بمبوق کے کالم "گپ" کے تین اقتباس دیکھو:

پٹواری

پٹواری دوپایہ انسان کا ایک ایسا نمونہ ہے جو اخلاقی تانے بانے

اور جسمانی ساخت کی ایسی انوکھی خصوصیات اور ایسی پیچیدگیاں پیش کرتا ہے جنھیں نظرانداز کردینا سوسیالوجی کے کسی طالب علم کے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ ایک ارتقائی عمل کا انجام ہے، اور اپنے دور افتادہ مورث بے ڈُمے بندر کی ناتکمل طور پر ترقی یافتہ جہتوں اور خصوصیتوں کو انتہائی تکمل صورت میں پیش کرتا ہے۔ اس کی اخلاقی اور ذہنی چستی، اس کی بیدار ذہانت، خطرات کا احساس، اس کی حاضر دماغی، اس کے مورث اعلیٰ کا عطا کیا ہوا قابل فخر ورثہ ہے۔ یہ اس وعدے کی حیرت انگیز تکمیل ہے جو بندروں نے کیا تھا۔

ریوینیو ایجنٹ

ریوینیو ایجنٹ قانونی پریکٹس کرنے والوں کی ایک قسم ہے جو اودھ کی کچہریوں اور عدالتوں میں جھنجھناتی رہتی ہے۔ یہ صوبے میں مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کے طلوع سے زیادہ قدیم ہے۔ اس کا جنم، جاں بہ لب نوابی عہد کی غالباً آخری تڑپ تھی۔ وہ انگریزی اسکولوں یا کالجوں کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ تعلیم کے مکتبی نظام کی عطا ہے، ایک فاتحانہ جواز ملا کے انکل پچو طریقہ تدریس کا، ایک ٹھوس ثبوت اُس تربیت کے فائدوں کا جو کتاب پڑھنے کے بے کیف اور تھکا دینے والے کاروبار کے مقابلے میں حقے کے دم لگاتے ہوئے، افیون کھاتے ہوئے، منڈے سر، داڑھی سے مزین چہرے اور میلے کچیلے لباس والے مولوی کے ذاتی آرام و آسائش پر زیادہ زور دینے پر اصرار کرتی ہے۔ یہ گنجلک قانونی علم کا ذہنی دیواروں کی بنیادوں پر کھڑا کیا ہوا ایک ڈھانچہ ہے۔ اسے بڑے

اطمینان سے آئینی (فقہ) خرافات کا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ نوجوان پٹواری کے ولولوں کی انتہا کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ اس زمانے کی ایک شاندار تاریخی غلطی ہے۔

دی آنریری مجسٹریٹ

آنریری مجسٹریٹ، ایک برملا، اگرچہ ناقابلِ یقین وفاداری کی فتح ہے۔ "بڑے صاحب" کو ہفتہ وار سلام کرنے کی توثیق و تائید ہے اور 'ڈالیوں' کی انتہائی اثر انگیزی کا مظہر، وہ ذہنی دیوالیے پن کا مقدس نمونہ ہے اور دیسی حماقت کا سرکاری اعتراف۔ اور بے حس اور غبی عوام کے ساتھ لفٹنٹ گورنر کا کیا ہوا ایک عملی مذاق۔

"آنریری مجسٹریٹ صاحب پچاس برس کے ہوں گے۔ مگر وہ اپنی ساری زندگی کے تجربوں اور اپنی عمر کے ایک ایک سال کی چڑھی ہوئی فربہی کو بڑے آرام سے اٹھاتے ہیں۔ ان کے ایک لمبی داڑھی ہے جسے وہ اس بے نیازی کے ساتھ لگائے پھرتے ہیں جو کسی کرسچن بشپ یا دیوبند کے کسی مولوی کو زیب دیتی ہے۔ مذہبی اعتبار سے وہ مسلمان ہیں مگر ایک کٹر مسلمان کے عقائد میں وہ کلکٹر سے لے کر نام نہاد 'صاحب'، یعنی ٹکٹ کلکٹر تک سب کے لیے ایک شرمناک عقیدت کو بھی شامل کر لیتے ہیں۔

مؤخرالذکر اس کا خصوصی دوست ہے۔ اور اکثر اس کی مہمان نوازی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، انتہائی بے رحمی کے ساتھ اردو کو مسخ بلکہ قتل کرتا ہے تاکہ اس کے یورپ نژاد

ہونے کے بارے میں میزبان کے دل میں رہے سہے شکوک و شبہات کو بھی باقی نہ رہنے دیا جائے۔

☆☆☆☆☆

ساتواں باب

میری زندگی میں بہت سے متنوع واقعات نے بہت سی ذاتوں اور بہت سے فرقوں کے لوگوں سے قریبی رابطہ قائم کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اور ان سب سے ملنے کا میرا تجربہ مجھے یہ کہنے پر اکساتا ہے کہ میں نے رشتہ داروں اور اجنبیوں میں، ملکی لوگوں اور غیر ملکیوں میں، گوروں اور کالوں میں، ہندوؤں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والے ہندستانیوں میں، وہ چاہے مسلمان ہوں، پارسی ہوں یا کرسچن اور یہودی ہوں، کسی امتیاز یا تفریق کا مجھے کبھی کوئی احساس نہیں ہوا۔ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ میرا دل کوئی ایسا امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی سے عاری ہے۔

(ایم۔ کے۔ گاندھی، آٹوبائیوگرافی، صفحہ 221)

یہ دسمبر 22-23 کی بات ہے۔ اکثر لوگ، ایودھیا کے ہنومان گڑھی مندر کی دن بھر کی دھارمک تقریبات میں شرکت کرنے کے بعد سو چکے تھے۔ ہر طرف سکون تھا، ایک سناٹا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے کہ اچانک رات کا سناٹا ایک شیشے کی طرح چھن سے ٹوٹ گیا۔ کیسری لباس پہنے کچھ سادھو، ترشول، لالٹین اور فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر لیے ہوئے بازو کی ایک گلی سے نکلے۔ یہ لوگ دائیں طرف مڑ گئے، گلی کے کیچڑ سے بچتے ہوئے وہ بابری مسجد کی طرف بڑھے جو ایک اونچے ٹیلے پر 1528 سے یقیناً موجود تھی۔ ایک ایسے کام کو انجام دینے آئے تھے جس سے وہ بہت کم واقف تھے اور اسی وجہ سے گھبرائے گھبرائے اور پریشان سے تھے۔ دروازے پر پہنچ

کر انھوں نے اپنی چپلیں اتاریں، اپنے سروں کو کاغذ سے ڈھکا اور جھک کر زمین کو دو دفعہ اپنے ہاتھوں سے چھوا، اور نہایت عقیدت کے ساتھ جے سیارام، جے سیارام کہا۔

تھوڑی دیر بعد، گروپ کا سب سے معمر سادھو مسجد کے مرکزی گنبد کی طرف جھپٹا، اس کا یہ فعل ایسا تھا کہ جسے دیکھ کر پُر جلال سلیمان کی فوجوں کے دلوں میں خوف خدا بیٹھ جاتا۔ اس نے وہاں پر دیوی دیوتاؤں کے کچھ بُت رکھ دیئے۔ اپنا یہ فرض پورا کرنے کے بعد وہ جلدی سے واپس ہوا، لالٹین بجھادی، ڈھیلی دھوتی کو کس کر باندھا اور رات کی تاریکی میں غائب ہوگیا۔

اسی وقت ایودھیا میں کہیں بجلی گری۔ گرج چمک کے ساتھ موسلادھار بارشیں آئیں۔ بجلی، شاہراہ پر بنے ہوئے ایک مندر پر گری تھی۔ بچّے سوتے سے جاگ گئے، جیسے ان کے خواب ٹوٹ گئے ہوں۔ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر سونے والے شردھالو پناہ لینے کے لیے بھاگے۔ بڑے بوڑھے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ہنگامہ کاہے کا ہے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ وہ غصے اور ناراضگی کی اونچی اونچی آوازیں سنتے ہوئے بے حس و حرکت کھڑے ہوئے تھے۔ سرجو ندی کا پانی ہمیشہ کی طرح، اپنے روایتی سکون کے ساتھ بہے جارہا تھا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

اگلی صبح جب سورج نکلا اور سارے سیاہ بادل چھٹ گئے۔ لوگوں نے سنا کہ رام اپنے جنم استھان پر پرکٹ ہوئے ہیں تو ہزاروں لوگ بابری مسجد پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائیاں اور پھول لائے۔ قریب ہی لکھنؤ یونیورسٹی کے گریجویٹ احمد دین اور نور محمد، آزاد ہندستان کے دو بیٹے، سارے تماشے کو خاموشی کے ساتھ مگر گھبرائے ہوئے دیکھتے رہے۔ ایودھیا، فیض آباد اور یوپی کے دوسرے شہروں میں تناؤ پیدا ہوگیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے۔کے۔ نیّر نے مورتیوں کو ہٹانے کے چیف سکریٹری اور انسپکٹر جنرل آف پولس کے حکم کو ماننے سے انکار کردیا۔ وزیراعلیٰ گوبند بلبھ پنتھ نے بھی کسی قطعی کارروائی سے احتراز کیا۔ یوپی کی حکومت نے بڑی بہادری دکھائی مگر کیا کچھ نہیں۔ اکتوبر 1950 میں نہرو نے سمپورنانند سے کہا کہ مسئلے کو حل کرنے میں انتہائی کمزوری دکھائی گئی اور بعد کو ہونے والے واقعات اسی کمزوری کا نتیجہ تھے۔ بہرحال خود

نہرو کا رول، فرقہ پرستی کے خلاف ان کے عموماً سخت رویے کے مطابق نہیں تھا۔ وہ مداخلت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس معاملے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کیا۔ وہ تو ایودھیا گئے بھی نہیں، پنتھ نے انھیں وہاں جانے نہیں دیا۔

"یہ بکواس ہے"، پردیپ نے غصے میں کہا، "ملک کا وزیراعظم بے بس کیوں کر ہوسکتا ہے؟"

تینوں دوست خاموش بیٹھ کر 15 اگست 1947 کے بعد کہ جب سے انھوں نے باقاعدہ مل بیٹھنا شروع کیا تھا، ہونے والے واقعات کا جائزہ لینے لگے۔ اب یہ 1950 کا موسم سرما تھا۔ بے اطمینانی کا گرمیوں کا طویل موسم ختم ہوچکا تھا۔ ہڑتالیں اور مظاہرے جو گرمیوں کے موسم میں لکھنؤ کے لیے روزمرہ کا معمول تھے، ختم ہوچکے تھے کہ شدید سردی میں سڑکوں پر آنا اور دھرنوں پر بیٹھنا آسان نہیں تھا۔ ایودھیا کا مسئلہ تو مہینوں سے موضوع گفتگو تھا، وہ اب جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتا تھا۔

بنگال، 7 فروری کو پھوٹ پڑنے والے زبردست فرقہ وارانہ فسادات سے جانبر ہونا شروع ہوگیا تھا مگر پناہ گزینوں کے ترک وطن کا سلسلہ ابھی تھما نہیں تھا۔ امن و شانتی کی بحالی کتنی تکلیف دہ تھی۔ نہرو نے پارلیمنٹ کو بتایا کہ 7 فروری اور 8 اپریل 1950 کے درمیان 857579 ہندو ہندستان آئے اور 278778 مسلمان پاکستان گئے۔ دوسرے الفاظ میں، دو دہائیوں سے زیادہ کے ظلم و جور اور جوابی پاگل پن کی یادیں، 1918 میں کلکتے کے فسادات سے لے کر اکتوبر 1946 کے نواکھالی ہنگاموں کی یادیں بنگال میں ابھی بھی تازہ تھیں۔ دوسری تمام جگہوں پر بھی، مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں، سب ہی کے جذبات یکساں طور پر پھوٹ پڑنے کی حد تک بھڑکے ہوئے تھے۔

"عزیز بھائی"، پردیپ نے کہا، "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کانگریس کی ایودھیا پالیسی کسی زیادہ گہری الجھن کی محض علامت ہے۔ کیا ہم لوگ اس مسئلے کو سلجھا سکتے ہیں؟"

عزیز نے کسی قدر بے دلی کے ساتھ سر ہلایا، وہ اس کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا، اس کا دل تو خلافت کے بعد کے منظرنامے میں اٹکا ہوا تھا۔

"ذہن میں دو اہم سنگ میل ضرور رکھو"۔ عزیز نے کسی قدر بلند آواز میں کہا، "پہلا، گاندھی جی نے 5 فروری 1922 کو سول نافرمانی کو منسوخ کرکے اپنا دھماکہ کیا۔ دوسرا، 21 نومبر 1922 کو ترکی نیشنل اسمبلی نے خلافت کو سلطنت سے علاحدہ کرنے اور مارچ 1924 کو اسے قطعی طور پر ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ گاندھی جی کا یہ غیرمتوقع فیصلہ، سبب تو نہیں تھا مگر ہندو مسلم فسادات اور کانگریس سے مسلمانوں کی کشیدگی سے مل ضرور گیا۔ لوگوں نے کہا کہ عوام کی محبوس توانائی نے فرقہ وارانہ فسادات میں اپنے نکاس کی ایک راہ ڈھونڈ لی۔ یہ بات صحیح ہوسکتی ہے۔ اگرچہ بین فرقہ تنازعے تو چورا چوری کو ہلا کر رکھ دینے والے تشدد سے بہت پہلے شروع ہوئے تھے۔ اسی طرح پان اسلامزم کے حامیوں کے جوش و خروش پر کانگریس کی بے اطمینانی اور تشویش سے سب ہی واقف تھے۔ اور پھر ہر شخص جانتا تھا کہ ان کے ساتھ گاندھی جی کے کمزور اتحاد میں مختلف مواقع پر ٹوٹ پھوٹ ہوچکی تھی۔ بہت برسوں بعد پنڈت جی اور دوسرے متعدد لوگوں نے متضاد بے اطمینانیوں کی بناء پر قائم کیے ہوئے مصنوعی اتحاد کی بات کی"۔

"گاندھی کو کبھی نہ کبھی اپنے فیصلے پر افسوس ضرور ہوا ہوگا"، پردیپ نے رائے ظاہر کی۔

"بالکل نہیں۔ 13 اگست 1931 کو "ینگ انڈیا" میں لکھتے ہوئے انھوں نے 1922 میں جو کچھ باردولی میں کہا تھا، اس کا دفاع کیا۔ انھوں نے اپنے اس خیال کو پھر دہرایا کہ تیسری دہائی کی بیداری اس فیصلے ہی کی وجہ سے تھی۔ مسئلہ بہرحال یہ نہیں ہے۔ قابل غور خود کانگریس کے اندر پڑنے والی دراڑیں ہیں۔ 1922 کے اختتام تک، سول نافرمانی انکوائری کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ملک ابھی سول نافرمانی کے لیے تیار نہیں ہے، پھر بھی 'کوئی تبدیلی نہیں' (No changers) کے ماننے والوں نے کاؤنسل میں شرکت سے اتفاق نہیں کیا۔ گیا میں دسمبر 1922 میں کانگریس بٹ گئی۔ سوراج

پارٹی قائم ہوئی اور اس کی سربراہی کی دیش بندھو، سی آر داس اور موتی لال نہرو نے۔ لیجسلیٹیو کاؤنسلوں کے انتخابات میں ان کے امیدواروں نے اچھی کامیابیاں حاصل کیں۔ سنٹرل پراونس میں واضح اکثریت ملی۔ بنگال میں انفرادی گروپ مضبوط ترین تھے۔ یوپی اور بمبئی میں خاصی تعداد میں ان کے امیدواروں نے کامیابیاں حاصل کیں۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ کاؤنسلیں ہی وہ اکھاڑے تھے جہاں فرقہ وارانہ سیاست کی تشکیل و توضیح ہوتی تھی"۔

"مگر کیوں؟" جگ موہن نے بڑی معصومیت سے پوچھا، "میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے سیاست دانوں نے انتظامیہ اور فیصلے لینے والی تنظیموں میں زیادہ حصے کا مطالبہ بڑے تسلسل سے کیا"۔

"تم ٹھیک کہتے ہو"، مگر پھر، تفویض اختیارات کے ہر قدم نے ہندو مسلم نفرتوں کو بڑھا دیا۔ اس صورت حال کے پیچھے، مختلف علاقوں میں فرقوں کے مابین غیر مساوی فروغ و ترقی کا بڑا ہاتھ ہے۔ جب مارچ 1923 میں 1919 کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد چند ممتاز کانگریسیوں نے پنجاب کا دورہ کیا تو انھوں نے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کو منقسم پایا۔ دوسری دہائی کے وسط میں عموماً نیشنلزم سے پسپائی اور کمیونلزم سے مسلم علاحدگی پسندی اور جارح (عسکری) ہندو قوم پرستی کی طرف تیز رفتار پیش قدمی ہوئی۔

"کیا یہ غیر معمولی تھا؟" پردیپ نے پوچھا۔

"یقیناً، تفرقے اور تقسیمیں تھیں مگر مذہبی خطوط پر نہیں۔ یونینسٹ پارٹی کے وجود میں آنے کی کوئی اور کیا توضیح کرسکتا ہے؟ جناح کے خبط کے سامنے 1945 میں اُس سے پہلے نہیں، ہتھیار ڈالنے کی وضاحت اس کے علاوہ اور کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ بنگال میں بھی کچھ ایسا ہی قصہ تھا۔ ہر جگہ، 1919 کے ایکٹ نے ذات اور فرقہ وارانہ سیاست کا دائرہ وسیع کردیا۔ ہر گروہ نے وہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اقتدار اور اتھارٹی کے محکموں تک رسائی کے لیے اپنی تعداد اور اپنے اثر و رسوخ کو استعمال کیا۔ کمزوروں نے

رعایتوں اور تحفظات کے مطالبے کیے، استحقاق یافتہ لوگوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال کانگریس نے، 1922 میں بنگالی مسلم سیاست دانوں کے ساتھ دیش بندھو، سی آر داس معاہدے کو قبول نہیں کیا۔ بعد کو، زمین داروں کے غلبے والی بنگال کانگریس نے اُن لگان داری قوانین کو مسترد کردیا جنھوں نے مسلمان کاشتکاروں کو راحت دلا دی ہوتی۔ فضل الحق کی پرجا کرشک پارٹی نے اپنا اثر و رسوخ کچھ بڑھا لیا کیونکہ کانگریس نے غریبوں کی پارٹی کا اپنا کردار ترک کردیا تھا۔ فضل الحق کو جو کسی طرف سے بھی کٹر فرقہ پرست نہیں تھے، بالآخر فرقہ پرستی کی سیاست کے گرداب میں دھکیل دیا گیا۔

"پنجاب کا کیا ہوا؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"یہاں شہری ہندو تاجر اور کاروباری لوگ یونینسٹ پارٹی کے بین کیمونٹی اتحاد کو دربدر کرنے کے لیے متحد ہوگئے۔ ہندو سبھائیں ان کی خاص حمایتی اور مددگار تھیں۔ فضل حسین جیسا روشن خیال سیاست داں بھی ان کے قہر و غضب کا ہدف بنا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے، عوامی عہدوں اور پیشوں میں کم نمائندگی رکھنے والے مسلمانوں میں، اپنی حیثیت اور اپنے منصب کو استعمال کرکے کچھ مراعات تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ مختصراً یہ ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ ہرخیال اور ہر رنگ کے سیاست داں، مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کی فراہم کی ہوئی عوامی جگہوں پر قبضہ کرنے کے لیے بے قرار تھے۔ اس عمل میں یہ لوگ دوسرے مختلف گیئر میں پڑ گئے۔ اکثر نے احتجاج کا میدان چھوڑ کر آئینی سیاست کو اپنا لیا۔ مختلف سطحوں پر ہمہ پیوند اتحاد کیا اور پارٹی کے داخلی اور بین پارٹی اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ نتیجہ اگست 1928 کی نہرو کمیٹی رپورٹ اور لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس سے قبل کی پرپیچ گفت و شنید کی شکل میں سامنے آیا"۔

"اور سوراج پارٹی کا احیاء؟" پردیپ نے استفسار کیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے یاد دلادیا۔ یہ بہت بعد کو ہوا۔ 1933 کے

وسط تک، گاندھی جی کے ڈانڈی مارچ کے بہت بعد کانگریس کے لائحہ عمل پر نظرثانی کے برملا مطالبے ہونے لگے کیونکہ سول نافرمانی ایک طریقہ کار کی حیثیت سے اپنی افادیت کھو چکی تھی اور قومی توانائیوں کو مفید سرگرمیوں میں لگانے کے عملی منصوبے بنانے کی ضرورت تھی۔ پہیہ پورا گھوم چکا تھا۔ 23-1922 میں 'کوئی تبدیلی نہیں' کی وکالت کرنے والے اب کاؤنسل میں داخلے کے حمایتی بن گئے تھے۔ ابتدا میں گاندھی جی راضی نہیں ہوئے اور انفرادی سول نافرمانی کی بات کی۔ مگر مارچ 1934 کے وسط تک انھوں نے اپنے موقف کو معتدل بنایا۔ اپریل کے اوائل میں جب انصاری اور بی۔ سی۔ رائے ان سے ملے تو انھوں نے سوراج پارٹی کے احیاء کی حمایت کی اور سول نافرمانی کو منسوخ کردیا۔

"یقیناً، دوبارہ نہیں"، جگ موہن نے اپنی خاموشی توڑی۔

"ہاں، یہ ایک غیر مقبول فیصلہ تھا۔ پنڈت جی کے دل میں ایک ٹیس اٹھی کہ اطاعت و جانثاری کے وہ بندھن جنھوں نے برسوں سے انھیں مہاتما سے باندھ رکھا تھا ٹوٹ گئے تھے۔ انھوں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کیا۔ ایک سنسان جزیرے میں بالکل بے یار و مددگار۔ سوشلسٹوں کا خیال تھا کہ دہلی اسمبلی میں داخل ہونے کا فیصلہ 1929 کے اُس لاہور ریزولیوشن کی خلاف ورزی تھا جس نے لیجسلیٹو اسمبلیوں کے بائیکاٹ کی اپیل کی تھی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مکمل آزادی سے کم کچھ نہیں۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قومی تحریک یقینی طور پر آئینی نظام اور انگریزوں کے ساتھ مفاہمت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس زمانے سے متعلق ایک تذکرے میں ہے کہ کانگریس ہائی کمانڈ کی بین بین پالیسیوں اور ان کے اقتصادی اور سماجی پروگراموں کی وجہ سے نوجوانوں میں شدید مایوسی تھی۔ یہ صورت حال پارٹی میں دہشت پسند لیڈروں اور حکومت دشمن عناصر کی تعداد میں اضافہ کررہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں دہشت گرد شورشوں کے اِکا دکا واقعات نے نوکرشاہی جبر کی گرفت کو مضبوط کردیا۔

"کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد کب پڑی؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"اشوک مہتا، مینو مسانی اور جے پرکاش نرائن کے 1933 میں جیل سے رہا ہونے کے فوراً بعد۔ جے پی (جے پرکاش نرائن) نے نہ تو کیمبرج میں پڑھا تھا نہ ہی آکسفورڈ میں، وہ لندن اسکول آف اکنامکس میں ہیرالڈ لاسکی کے زیراثر بھی نہیں آئے تھے۔ لندن میں کسی اور جگہ بھی انھوں نے تعلیم نہیں پائی تھی۔ ان کی تعلیم امریکا میں ہوئی تھی اور اگر قطعی طور پر کہیے تو یونیورسٹی آف ویکان سن میں۔ جے پرکاش 1929 میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ایک حمایتی دانش ور کی حیثیت سے ہندستان واپس آئے۔ وہ جلدی ہی کانگریس کے لیبر ریسرچ ڈیپارٹمنٹ میں لے لیے گئے۔ مگر بہت دن نہیں لگے کہ گاندھی جی اور نہرو سے ان کے بڑے سنجیدہ اختلافات پیدا ہوگئے تب انھوں نے کانگریس کے اندر ہی کانگریس سوشلسٹ پارٹی قائم کی"۔

"اگر میں پوچھوں کہ اختلافات کیا تھے؟" جگ موہن نے جاننا چاہا۔

"سوشلسٹ حکمت عملی یہ تھی کہ کانگریس کے اندر رہ کر اس کی پالیسی کو سخت بنایا جائے، جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ 1932 کی سول نافرمانی کی تحریک میں ابتری میں تیزی اسی کی وجہ سے آئی۔ ان لوگوں نے اُن شرائط پر بھی اعتراض کیا جن کو مان کر کانگریس 1936 کے انتخابات میں شریک ہونے کی خواہش رکھتی تھی۔ جے پی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا"۔

"بس اتنا ہی؟" جگ موہن متاثر نہیں ہوا تھا۔

1939 میں دوسری عالمی جنگ چھڑی، جے پی اور سوشلسٹ جنگ مخالف لوگوں میں تھے۔ اسی لیے وہ لوہا بنانے والے شہر جمشید پور میں ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیے گئے۔ ایک سال بعد انھیں رہا کیا گیا مگر جیل کے گیٹ ہی پر انھیں دوبارہ حراست میں لے لیا گیا، ان کو سزا ملی اور انھیں دیولی کے عظیم راجپوت قلعے میں قید کردیا گیا"۔

"یہی وہ جگہ ہے جہاں انھوں نے سنسنی خیز جیل بریک کیا تھا؟"

"نہیں" عزیز نے پردیپ کو جواب دیا۔ وہ واقعہ نومبر کے مہینے میں ہزاری

باغ سنٹرل جیل کا تھا۔ جب وہ اور ان کے ساتھی جیل کی اپنی کوٹھریوں سے بھاگے تھے اور دھوتیوں کو آپس میں باندھ کر بنائی گئی سیڑھی کی مدد سے جیل کی اونچی دیواروں کو پار کرکے آزادی حاصل کی تھی۔ یہ سال تھا 1942۔ برما کو تاراج کرنے کے بعد جاپانی ہندستان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ حکومت گھبرائی ہوئی تھی، بہرحال کانگریس اپنے پچھلے موقف پر قائم رہی اور برطانیہ کے فوجی مقاصد میں اعانت کرنے سے انکار کردیا۔ اس سیاسی فضا میں کانگریس نے معروف "ہندستان چھوڑو" سول نافرمانی کی تحریک کی گاندھی جی کی تجویز کو منظور کرلیا۔ گاندھی اور دوسرے لیڈر گرفتار کرلیے گئے۔ عوامی ردّ عمل زبردست تشدد اور توڑ پھوڑ کی شکل میں سامنے آیا جس میں سوشلسٹوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا"۔

"لاجپت رائے نے بھی تو امریکا میں وقت گزارا تھا، گزارا تھا نا ؟" جگ موہن نے دلچسپی لینا شروع کیا۔ مگر سوالات کی اس کی بوچھار سے پردیپ کو بہت جھنجھلاہٹ ہوئی۔

"ارے کچھ خیال نہ کرو یار"، عزیز نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا، "ہاں، 1907 میں ملک بدر کیے جانے کے بعد لالہ نے 1914 سے 1919 تک امریکا کو اپنا گھر بنالیا۔ جب وہ واپس آئے تو انھیں 1920 میں کلکتے میں منعقد ہونے والے کانگریس کے خصوصی سیشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ 1922 میں وہ قید کرلیے گئے اور 1928 میں، لاہور میں سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے میں پولیس لاٹھی چارج میں ان کی موت ہوگئی۔ وہ ایک شعلہ بیان سوشلسٹ تھے مگر ہندوتوا (Hindutva) کے لیے ایک نرم گوشہ رکھتے تھے۔ یوں تو انھوں نے آزادی اور خودمختاری کے لیے اپنے آپ کو وقف کررکھا تھا مگر ان کا تعلق کانگریس کے اس چھوٹے سے انتہاپسند حلقے سے تھا جس کو مسلمانوں سے بڑی نفرت تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں، اپنے دوسرے آریہ سماجی دوستوں کی طرح مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہندومہاسبھا اور سنگھٹن کی تحریکوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ پنجاب کی فرقہ پرستی کو تم اس وقت تک سمجھ نہیں

سکتے جب تک کہ لاجپت رائے، لالہ ہردیال اور سوامی شردھانند کو اپنی توجہ کا مرکز نہ بناؤ۔

"میرے چچا"، جگ موہن نے کہا، "شیر پنجاب لاجپت رائے کے بارے میں بہت مختلف باتیں کہتے ہیں"۔

"مجھے یقین ہے .... تم لوگوں کو کچھ معلوم ہے؟ اس انحراف کے لیے معافی چاہوں گا لیکن میں تمھیں بتاؤں کہ دو قومی نظریے کو سیداحمد خاں سے جوڑ دینا بہت عام ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آریہ سماج سے شروع ہوکر، ویرساورکر اور گروگولوالکر کی تحریروں، اور ہندو قوم اور ہندو شناخت کی اَن تھک تلاش و جستجو نے دو قومی نظریے کو سہارا بھی دیا اور استحکام بھی۔ جناح کے منظرعام پر آنے سے بہت پہلے، 1925 میں لالہ ہردیال نے کہا تھا کہ ہندستان اور پنجاب کی ہندو قوم کا مستقبل چار باتوں پر منحصر ہے۔ ہندو سنگھٹن، ہندو راج، مسلمانوں کی شدھی اور افغانستان اور سرحدوں کی فتح۔ ان کا دعویٰ تھا کہ ہندو نسل کی تاریخ ایک ہے اور اس کے ادارے ہم رنگ اور یکساں ہیں۔ دوسری طرف، مسلمان اور عیسائی ہندوازم کے دائرے سے بہت باہر ہیں۔ اسی لیے، جس طرح آنکھ میں پڑی ہوئی کسی چیز کو نکالنا ضروری ہوتا ہے اسی طرح اسلام اور عیسائیت کی شدھی ضروری ہے۔ عیسائیت 'ور اسلام کی نوعیت کی اس تعیین کو پیش نظر رکھتے ہوئے ساورکر نے لکھا کہ جب سے مسلمانوں نے ہندستان میں گھس پیٹھ کی اسی وقت سے موت اور زندگی کا تنازعہ شروع ہوا۔

"ہم ہندو کی خفگی کی طرف لوٹیں گے؟" پردیپ نے کسی قدر تکلف کے ساتھ استفسار کیا۔

"ارے ہاں، گاندھی جی نے یہ کہہ کر کہ وہ Complete Independence کے حقیقی معنوں کے مطابق مکمل آزادی چاہتے ہیں، نہرو کی ناراضگی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ دھاکے کے بعد وہ تعمیر چاہتے تھے۔ چند مہینوں کے بعد انھوں نے پٹیل کو مطلع کیا کہ انھوں نے کانگریس سے اپنا ؟؟ توڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے

محسوس کیا کہ ان کی پالیسیاں، پارٹی میں بہت سے لوگوں کو قائل نہیں کرپائی تھیں مگر اس کے باوجود اُنھوں نے 17 ستمبر کو واردھا سے اپنا سیاسی منشور جاری کیا۔ جس میں مستقبل میں کانگریس کی سرگرمیوں کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ بمبئی کے کانگریس سیشن میں اس کے آخری دن 28 اکتوبر کو انھوں نے شرکت کی جہاں اسّی ہزار افراد نے ان کے ساتھ اپنے اتحاد اور یکجہتی کا اعلان کیا۔ اس اعلان نے ان کی حکمت عملی کی صحت کی توثیق کردی۔ اور ان کے مخالفین یہ جان گئے کہ وہ اب بھی اپنے احکامات چلا سکتے ہیں۔

"یقیناً، ایک منقسم کانگریس کی کارگزاری اسمبلی کے انتخابات میں کچھ بہت اچھی نہ ہوتی"۔

"نہیں بھائی، کانگریس نے اچھی کارگزاری دکھائی، 88 سیٹوں میں سے 44 نشستیں اس نے جیتیں"۔

"اگر تم بُرا نہ مانو تو ہمیں پھر نہرو رپورٹ کی طرف رجوع کرنا چاہیے"۔ پردیپ نے مشورہ دیا۔

"کیوں؟" جگ موہن نے حیرت کا اظہار کیا۔

"میں نے سنا ہے کہ اس کی سفارشات نے فرقہ وارانہ تنازعات کو اور گہرا کردیا"۔

"ہاں انھوں نے کیا"، عزیز نے جواب دیا۔ یاد رکھو کہ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے ہندستان میں اہم مسلم لیڈروں نے کچھ کلونیل ایڈمنسٹریٹرز کے ساتھ مل کر، اگرچہ ایسا کرنے کے دونوں کے اسباب مختلف تھے، اس خیال کو فروغ دیا کہ مسلم شناخت اساسی ہونے کی وجہ سے لازمی ہے۔ نتیجتاً بنگال اور پنجاب میں مسلم اکثریت کے لیے الگ حلقہ ہائے انتخاب، ان کی حیثیت و اہمیت، weightages اور ریزرویشنز کی نامنظوری نے مسلم سیاستدانوں کو بہت گڑبڑا دیا۔ بیشک، نہرو رپورٹ نے کانگریس کے خلاف محمد علی کی طلاقت بیانی کے بند کو توڑ دیا۔ انھوں

نے ڈومنین اسٹیٹس کی سہولت کو اسلام کی آزاد و خودمختار روح سے غیر مطابق قرار دیا۔ اس کے عواقب، ان کے خیال کے مطابق تھے کہ تخلیق خدا کی، ملک وائسرائے یا پارلیمنٹ کا اور حکومت ہندو مہا سبھا کی۔ جس بات پر انھیں سب سے زیادہ ناراضگی تھی وہ یہ تھی کہ مرکزی لیجسلیچر میں مسلمانوں کی نمائندگی تینتیس کے بجائے پچیس مقرر کی گئی تھی اور علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب اور weightages ختم کر دیے گئے تھے۔ ان کے خیال میں، علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب اس بات کی ضمانت تھے کہ اکثریت کسی اقلیت کو اپنی تعداد کی بنا پر بالکل غرقاب نہ کردے اور weightages اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ اکثریت، تعداد کے کسی قانونی جبر کو مستقل طور پر جاگزیں نہ کردے۔

"میں جناح کا موقف معلوم کرنا چاہتا ہوں"، پردیپ نے کہا۔

"جناح نے دسمبر 1928 کو منعقد ہونے والے آل پارٹیز نیشنل کنونشن میں تین ترمیمیں تجویز کیں۔ پہلی یہ کہ انھوں نے مرکزی لیجسلیچر میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی نشستوں کا ریزرویشن چاہا، یہ یاد رہے کہ یہ بات تقریباً دو دہائیوں سے مسلم سیاست کی بنیادی اینٹ رہی تھی۔ جناح چاہتے تھے کہ بالغ رائے دہندگی کے عدم نفاذ کی صورت میں بنگالی اور پنجابی مسلمانوں کے لیے دس سال تک ریزرو نشستیں ہونی چاہئیں۔ انھوں نے مزید یہ مطالبہ کیا کہ باقی ماندہ اختیارات صوبوں کے پاس ہونے چاہیے۔ دوسرے ملکوں کی کہ جہاں سیاسی توازن آبادی کی بنیاد پر نہیں بلکہ انصاف کے اصول پر قائم کیا گیا تھا، آئینی روایات کا حوالہ دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک سنجیدہ معاہدے کی بات کی۔ افسوس ہے کہ ان کی بات کو کسی نے اہمیت نہیں دی۔ ان کا مذاق اڑایا گیا، ان کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور ایک معاندانہ اسمبلی نے ان کی تجویزوں کو رد کر دیا۔

اپنے کاغذات کو الٹتے پلٹتے ہوئے عزیز ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا اور پھر پردیپ سے مخاطب ہوا۔

"کچھ دن قبل تم نے مجھ سے فرقہ پرستی کے بارے میں کانگریس کے

موقف کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس سوال کے جواب کا یہ بہت اچھا موقع ہے۔ مگر اس سے پہلے ہم ایک پیالی چائے پی لیں۔ اور ایک سگریٹ۔ میں اپنا پائپ آج ڈیپارٹمنٹ ہی میں بھول آیا"

آدھی رات ہونے والی تھی۔ عزیز نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دکانوں کے شٹر بند تھے۔ جوشؔ اور مجازؔ کا وہ زمانہ گیا جب لوگ رات کو سڑکوں پر گھومتے تھے۔ لکھنؤ اب بے لطف نوکرشاہوں کا شہر ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہاں یہ کہنے والا کوئی مجازؔ نہیں تھا:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

پردیپ اور جگ موہن اب بھی محفل کو ختم کرنے پر تیار نہیں تھے۔

"نہرو کمیٹی نے"، عزیز نے کہا، "یہ فرض کرلیا تھا کہ لوگ علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی کے بغیر بڑے سیاسی اور اقتصادی مسائل کی روشنی میں سوچنا شروع کردیں گے۔ بہت سے وجہیں تھی جن کی بنا پر یہ نہیں ہوا۔ متعدد صلح ناموں اور معاہدوں، لکھنؤ پیکٹ، انصاری- لاجپت رائے تجاویز (1923) اور بنگال پیکٹ کو پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ آیا ان سب سے کوئی قابل لحاظ فائدہ ہوا یا نہیں۔ کانگریس نے شاید عہدوں اور ملازمتوں کے پیچھے بھاگنے والے تعلیم یافتہ طبقوں کی بے چینی اور بے اطمینانی کو کم کرنے کا موقعہ تو حاصل کرلیا ہو مگر یہ بات کافی نہیں تھی۔ نشستوں کے تناسب اور فی صدی کی بنیاد پر لیڈروں سے گفت و شنید مسلم عوام کو پارٹی کی طرف لانے والی نہیں تھی۔

"یہ کیا ہی کیوں گیا تھا؟" جگ موہن نے پوچھا۔ ظاہری منطق دو مفروضوں پر مبنی تھی۔ ایک یہ کہ مسلمان عام طور سے ایک ہی جیسے مسائل رکھنے

والی ایک کمیونٹی تھے۔ دوم، ان کے سیاسی اور اقتصادی مفادات دوسری کمیونٹیز سے متنازع یا مختلف تھے۔

"مگر پھر"، جگ موہن نے خیال ظاہر کیا، "یہی بات تو مسلم لیڈران بار بار اور بہت دن سے کہہ رہے تھے"۔

"یقیناً، اور یہ اس لیے کہ یہ ان کے واسطے اپنی اور اپنی کمیونٹی کی ایسی شبیہ کو قائم رکھنے کے لیے مفید تھا۔ حقائق یقیناً بہت مختلف تھے۔ ایک مسلمان کسان اور ایک مسلمان زمیندار کے مفادات یکساں کیسے ہوسکتے ہیں؟ کیرالا کا ایک مسلمان ایک بنگالی مسلمان کے ساتھ اپنی پریشانیوں کو بانٹ سکتا ہے؟ لیگ اور آل انڈیا مومن کانفرنس ایک پلیٹ فارم پر ساتھ کیسے آسکتے ہیں؟ حقیقت بھی یہی ہے، یہ لوگ ساتھ نہیں آئے۔ مومن کانفرنس نے عبدالقیوم انصاری کی قیادت میں، لیگ کے مطالبہ پاکستان کی شدید مخالفت کی۔ پیغام صاف اور واضح تھا۔ ہمیں، عوامی فرقہ پرستانہ، لفاظی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے جس کی رو سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ امن و شانتی اور ہم آہنگی کے ساتھ مل کر رہنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے ہیں"۔

"یہ تم نے ہمیں بتایا ہے"، جگ موہن نے کہا، "کہ یہ نہرو کا ٹیپ کا مصرعہ تھا۔ تھا نا؟"

"ہاں، انھوں نے ایک ایسے سماج میں، کہ جو ثقافتی اور مذہبی کثرت پر ٹکا ہوا ہو مسلم نیشنلزم کی عِلّت و توجیہہ پر سوال کیا، اور اسلام کے بھیس میں مسلم شناخت کی تخلیق پر تنقید کی۔ انھوں نے نشستوں کے تناسب اور فی صد کے مسائل کو نیشنلزم اور کلونیل ازم کے زیادہ بنیادی تضادات سے الگ رکھنا چاہا۔ اور توقع کی کہ جناح اپنے حلقہ انتخاب کو، ترجیحی مذہبی سیاسی اجتماع کی طرح نہیں بلکہ ساتھی باشندوں کی حیثیت سے اس صحیح اور جائز جدوجہد میں لائیں گے۔ اس بات کے کہنے میں کوئی خرابی نہیں تھی کہ مذہبی یکجہتی کو سیاسی عاملیت (activism) کی بنیاد نہیں ہونا چاہیے یا یہ کہ عدم اتحاد کی مذہبی علامتوں کو عوامی زندگی سے نکال دیا جانا چاہیے۔ کوئی خرابی تھی کیا؟"

"تم نے اس سے قبل ذکر کیا تھا نا"، پردیپ نے عزیز کو یاد دلایا، "کہ انھوں نے 1927 میں کہا تھا کہ جب لوگ سیاسی سطح پر آئیں تو یکجہتی فرقہ وارانہ نہیں، قومی ہونا چاہیے اور جب وہ اقتصادی میدان میں داخل ہوں تو یکجہتی کی تعمیر اقتصادی بنیادوں پر کی جانا چاہیے"۔

"ہاں، میں نے ذکر کیا تھا۔ تلک اور بنگال میں سودیشی لیڈروں کی تیار کی ہوئی متبادل حکمت عملیوں نے آزادی کی جدوجہد میں تفرقے (دراڑیں) ڈالے، مسلمانوں کے احساسات کو ٹھیس پہنچائی اور کانگریس کے سیکولر مقاصد کو کمزور کیا۔

"کیا غلطی ہوئی؟" پردیپ نے پوچھا۔

"تم بھیا اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو کانگریس نے راج کی بتائی ہوئی فرقہ وارانہ کٹیگریز کو قائم رکھا۔ عام بات کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ پارٹی کے عہدے دار اور عام کارکن نے اول اول سوچا اور عمل کیا مسلمان کی حیثیت سے، ہندو کی حیثیت سے اور سکھ کی حیثیت سے۔ مسلم علاحدگی پسندوں نے 1920 میں خود اپنی رفتار پکڑی۔ مسلم لیڈروں کے، جن میں سے بہت سے مانٹیگو-چیمسفورڈ اصلاحات سے فائدے اٹھا چکے تھے، نہرو کمیٹی کے ریاکارانہ دلائل سے متاثر ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اسی لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ انھوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے جھنڈے تلے منظم کرلیا۔ اس بات پر بھی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ انھوں نے حکومت کے ساتھ اپنے رشتوں کو مضبوط کیا۔ میں زور اس بات پر دینا چاہتا ہوں کہ ان لوگوں نے یہ سب صرف اپنے طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے کیا نہ کہ نام نہاد مسلم مفادات کی خاطر"۔

جگ موہن کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا، "تو تم اب یہ کہہ رہے ہو کہ کسی کو لیڈروں کی مسلم یا اسلامی لفاظی کے سحر میں کھو نہیں جانا چاہیے"۔

"بالکل — پھر بھی 1928 کے بعد کی دہائی نے ایک منظم بولنے اور اپنی بات کہنے والی مسلم سیاسی کمیونٹی کی تخلیق کی اور ابھی تک کی عارضی کوششوں کو مستحکم

کردیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پاکستان ناگزیر تھا بلکہ تمھیں سیاسی اشرافیہ کے مابین بڑھتے ہوئے تفرقے سے آگاہ کرنا ہے جو اثر و رسوخ اور طاقت کے لیے دھوکا دھڑی کررہا تھا۔

"یہ لوگ کس چیز میں سبقت لے جانے کے لیے مقابلہ کررہے تھے؟" جگ موہن کا دوسرا سوال تھا۔

"اوہ اس چیز کی بقا کے لیے جسے وہ سمجھتے تھے کہ ان کی ہے، اور اقتدار کے ڈھانچے میں مزید اصلاحات کے لیے اپنے سیاسی وسائل کو مجتمع کرنے کی خاطر"۔

"اور" جگ موہن نے استفسار کیا، "حکومت کا رول؟"

"لندن میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کیونل ڈیڈلاک کو ختم کرنے میں ناکام ہوئی۔

"حل کی تلاش کی گاندھی جی نے کوئی کوشش نہیں کی؟" جگ موہن نے پھر پوچھا۔

"نہیں، کانگریس نے نومبر 1930 میں افتتاحی سیشن میں شرکت نہیں کی کیونکہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں کسی مباحثے سے قبل ڈومینین اسٹیٹس دیے جانے کی شرط کو ماننے سے حکومت کے انکار کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلا رہی تھی۔ فروری- مارچ 1931 میں گاندھی-اِروِن مذاکرات کے بعد گاندھی جی نے، پارٹی کے واحد نمائندے کی حیثیت سے 14 ستمبر اور یکم اکتوبر 1931 کے درمیان دوسرے سیشن میں شرکت کی۔

"ہوا کیا؟"

"جگ موہن، یہ کوئی جاسوسی قصہ نہیں ہے"، پردیپ نے پانی پیتے ہوئے کہا۔

"تم اپنا کام کرو"، جگ موہن نے کسی قدر تلخی کے ساتھ کہا۔

"نہیں، میں جک کو تو بعد میں جواب دوں گا پہلے مجھے کانگریس کی لوگوں کو اکٹھا کرنے کی حکمت عملی سے متعلق اپنی دلیل پیش کرنے کی اجازت دو۔ لیکن کیا ہم آج کی گفتگو اب ختم نہ کردیں؟"

"نہیں، نہیں، باتیں ابھی ختم نہ کیجیے"، پردیپ نے اور پانی پیتے ہوئے اصرار کیا۔

"ٹھیک ہے۔ کانگریس نے مسلمان سیاست دانوں سے گفت وشنید کرکے، ان کی سیاسی حیثیت کو جس کی کوئی تنظیمی اساس نہیں تھی، بحیثیت مجموعی پوری کمیونٹی کی ترجمان ہونے کا جواز بخش دیا۔ ایک ایسا جواز جو زیادہ تر ان تنظیمی اور سیاسی ڈھانچوں سے نکلتا تھا جن سے کانگریس خود اہتمام کو پہنچی تھی۔ ان نام نہاد لیڈروں کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کے بجائے کہ جن میں وہ اپنے مضمر تعاون کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوتے، مگر کانگریس نے ایسے مقابلے کے حالات پیدا کرنے سے مسلسل انکار کیا، کانگریس کے اس رویّے کے پیچھے بظاہر قومی تحریک کی کلّی اور متحدہ نوعیت کو کمزور ہونے سے بچانے کی ان کی خواہش تھی۔

"بس کیا ساری بات یہی ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

"نہیں"، عزیز نے جواب دیا، "ہمارے لیڈروں کو ڈر تھا کہ ایسے مقابلے کے نتائج ایسے گہرے افتراق کو ظاہر کردیں گے کہ جس کا مداوا دشوار ہوگا۔ چونکہ قومی یکجہتی بنیادی مفروضہ تھا اس لیے لیڈرشپ نے اس سے بچنا چاہا"۔

"یقیناً"، پردیپ نے اظہار خیال کیا، "پنڈت جی کو اس لائن سے کبھی بھی اطمینان نہ ہوتا"۔

"وہ مطمئن نہیں تھے، مگر خود ان کی سمجھ ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ فرقہ پرستی کے پاؤں مٹی کے ہوتے ہیں اور چونکہ یہ ایک خرافات ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ باقی نہیں رہے گی۔ اپنے اس عقیدے میں وہ غلطی پر تھے۔ عدم تعاون کے جوش و خروش کے ختم ہونے کے بعد، فرقہ پرستی،

سیاست میں ایک اہم عنصر کی حیثیت سے سامنے آئی۔ ان کے والد موتی لال نہرو کو 1926 کے انتخابات میں اس کا مزہ چکھنے کو ملا تھا جب مدن موہن مالویہ اور دوسروں نے ان کے مسلم دوست میلان طبع کے لیے ان کی مذمت کی۔ فرقہ وارانہ نفرت اتنی بھڑکائی گئی تھی کہ موتی لال کو سیاست سے تیاگ لینے کے بارے میں سوچنا پڑا تھا۔ خود نہرو بھی، اکتوبر 1937 میں مسلم ماس کانٹیکٹ کمپین شروع کرنے پر ہدف بنے تھے۔

"گاندھی کے رول کے بارے میں کیا ہے؟"

"جیسا کہ میں نے غالباً وضاحت کی تھی کہ سول نافرمانی کی منسوخی نے ان کے اور ان کے سابق مسلمان حمایتیوں کے درمیان دوری کو بڑھا دیا۔ ایک دفعہ جب خلافت کے غبارے سے ہوا نکل گئی اور ہندو مسلمان فسادات نے برطانوی ہند کے بہت سے حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو مسلمان سیاست دانوں نے مہاتما پر نام نہاد مسلم مفادات کو ایک طرف کرتے ہوئے اور لوگوں کو جمع کرنے کے لیے خصوصی طور پر ہندو علامتوں کو استعمال کر. تے ہوئے ہندو دائیں بازو کی طرف داری کرنے کا الزام لگایا"۔

"یہ تو"، پردیپ نے کہا، "ایک نامنصفانہ تنقید تھی"۔

"ہاں، بڑی حد تک تھی"۔ عزیز نے جواب دیا، "لیکن پھر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غلط مفروضات کی بنیاد پر سلوک کیا۔ ساؤتھ افریقہ سے واپسی کے بعد انھوں نے ان کے ساتھ ایک الگ پان انڈین اور پان اسلامک اکائی کی حیثیت سے برتاؤ کیا اور ان کی امتیازی سماجی، ثقافتی، لسانی اور اقتصادی خصوصیات کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ اسلام کی عظیم الشان روایات پر زور دیتے ہوئے اور ہندستانی اسلام کو عرب کے اسلام کے مساوی رکھتے ہوئے انھوں نے مسلمانوں کو ایک سنجیدہ مذہبی کمیونٹی کی حیثیت سے یکجا کیا۔ انھوں نے اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور آزاد جیسے لبرل اور سیکولر ذہن والے مسلمانوں کے ساتھ متعدد برس گزارے مگر اسلام کی ان کی جدید تاویلات سے صرف نظر کیا۔ روایتی نقطہ نظر، جو خود مہاتما کے اخلاقی اور روحانی فلسفے کو زیادہ

اپیل کرتا تھا، ہندستانی مسلمانوں کو معتبر اور مستند آواز کا نمائندہ نقطۂ نظر معلوم ہونے لگا"۔

اب جگ موہن کی باری تھی یہ پوچھنے کی کہ مسلم ماس کانٹیکٹ مہم آخر کیا چیز تھی۔

عزیز نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ "اس مہم کو صوبائی کاؤنسلوں کے فروری 1937 کے انتخابات میں کانگریس کی کامیابیوں کے پس منظر میں رکھنا چاہیے۔ گیارہ صوبوں میں سے پانچ صوبوں میں کانگریس نے واضح اکثریت حاصل کی۔ بمبئی میں پارٹی نے حکومت بنائی، شمال مغربی سرحدی صوبے میں، سرحدی گاندھی خاں عبدالغفار خاں کی قیادت میں ان کے ریڈ شرٹ اتحادیوں نے اکثریت حاصل کی۔ دو قابلِ ذکر مستثنیات تھے بنگال اور پنجاب۔ بنگال میں فضل الحق نے ایک اتحادی وزارت بنائی۔ پنجاب میں سکندر حیات خاں کی سربراہی میں یونینسٹ پارٹی سریرِ حکومت پر براجمان ہوئی۔ اس میں چھوٹو رام کی قیادت میں ہندو جاٹ اور سکھ کسان شامل تھے۔

سیاسی منڈی میں کانگریس کے مراتب بہت اونچے تھے۔ ان کا تذکرہ بھی دوسری چیزوں کے ساتھ لوک گیتوں اور رزمیوں میں بھی ملتا ہے۔ بھوج پور کے علاقے کے کویوں نے گاندھی، سول نافرمانی اور رضاکارانہ اسیری کے گُن گائے۔

گاندھی کا آئل جمانا
دیور جیل نہ اب گئی لے
جب سے ٹاپے سرکار بہادر
بھارت مَرے بنو دانہ رے

دوسرا گیت جس میں ایک بھوج پوری عورت اپنے شوہر سے کام کی تلاش میں کہیں بہت دور نہ جانے کی درخواست کرتی ہے۔

اب ہم کربی چرکھا پیا متی جاہو بدیسوا
ہم کاتی چرکھا ساجن تم ہو لاؤ

ملی ابھی سے سورج وا
پیا متی جاہو بدیسوا
دیسوا کی لاج رہے چرکھا سے
گاندھی کے مانو سنیسوا
پیا متی جاہو بدیسوا

"تم نے میرے سوال کا جواب ابھی تک نہیں دیا"، جگ موہن بے صبری سے بیچ میں بول پڑا۔

"ہاں، اپنے انتخابی دوروں میں مسلمانوں کے ردّ عمل سے نہرو کی بہت ہمت افزائی ہوئی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ مسلم ماس کانٹیکٹ اسکیم تھی۔ ان کو اکسانے والی اصل بات جو تھی وہ یہ تھی کہ وہ مسلم عوام کو یہ سمجھانا چاہتے تھے کہ وہ ایک قوم نہیں ہیں اور انھیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کا مقدر ان کے برادران کے ساتھ نہیں بلکہ دوسری کیمونیٹیز کے ان کے ساتھی دستکاروں، کسانوں اور کامگاروں کے ساتھ ہے۔ مختصراً یہ کہ اس سے پیدا ہونے والی تحریک میں مسلمانوں سے براہِ راست اپیل کرنے کی حکمتِ عملی کی جگہ ایک زیادہ خود آگاہ، اور سیکولر اپیل اور تعاون حاصل کرنے کی بلاواسطہ حکمتِ عملی نے لے لی۔ بہرحال اس کے آغاز کے دو سال کے اندر اندر یہ پہل ناسازگار حالات کا شکار ہوگئی۔

"کیوں؟" جگ موہن کے سوالات جاری تھے"

"پہلی، یہ کوشش گاؤں اور سہولتوں سے یکسر محروم گروہوں کی طرف ہونے کے بجائے زیادہ تر شہری علاقوں تک محدود رہی اور اس طرح مسلمان کسانوں کو مسلمان زمین داروں سے الگ کرنے کا نہرو کا مقصد کھٹائی میں پڑ گیا۔ دوسرے : ایک منقسم کانگریس، ہندو قوم پرستوں اور ایک گاندھیائی گروپ کی مخالفت جسے یہ خدشہ تھا کہ مسلمان سرگرم ورکروں کی آمد پارٹی پالیسی پر ایک تشویش ناک اور ناقابل قبول اثر ڈالے گی"۔

"مگر کیوں؟" جگ موہن نے عزیز سے ایک ایک بات پر سوال پوچھنے شروع کر دیے تھے۔

"بعض لوگوں کا کہنا تھا"، عزیز نے اپنے مخصوص سکون کے ساتھ وضاحت کی، "کہ پروگرام کسی سماجی اور اقتصادی مواد سے خالی تھا اور یہ کہ فائدے کم تھے اور تاخیر سے تھے۔ دوسروں کا خیال تھا کہ پروگرام زیادہ تر کاغذ پر تھا اور سیکولر انقلابی بیانات نے عوام کو ساتھ لیے بغیر بالآخر مسلم مفاد پرستوں کو چونکا دیا۔ میں پھر بھی اس بات پر اصرار کروں گا کہ مہم کو ختم ہو جانے دینا ایک غلطی بلکہ ایک تاریخی حماقت تھی۔ کئی برس بعد تاریخ داں کے ایم اشرف نے اس خیال کا اظہار کیا کہ لیگ کے اثر کے بڑھنے کا ایک سبب یہ تھا کہ کانگریس نے وزارت سازی کی خاطر عوامی رابطے کی سعی ترک کر دی۔ کیا تم اس بات سے واقف ہو کہ اشرف اس مہم میں شامل تھے؟"

"ہاں واقف ہوں۔ یہ وزارت سازی کیا ہے عزیز بھائی؟" پردیپ نے استفسار کیا۔

"جلدی ہی معلوم ہو جائے گا، ذرا یاد کرو کہ الیکشن لڑنے کا فیصلہ مختلف دھڑوں کے زور بازو کے مظاہروں کے درمیان 7 اپریل 1936 کو موتی نگر لکھنؤ میں لیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد صدر کانگریس، نہرو نے لکھنؤ کی میٹنگ کو تنازعوں کی کانگریس قرار دیا تھا۔ چھوڑو ہمیں ایک بار پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کی طرف رجوع کرنا چاہیے"۔

"پلیز"

"سارے کام کا مجموعی نتیجہ — اعداد و شمار کی بھرمار اور لاتعداد تقریریں، مثبت سمجھ عنقا یا برائے نام۔ 25 اکتوبر تک مختلف پارٹیوں کے مابین گفت و شنید مسدود۔ ذہن میں یہ بات رکھو کہ گاندھی جی اپنے ساتھ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کی بنیاد پر الگ نمائندگی کا کانگریس کا پلان لائے تھے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے

لیے ان صوبوں میں جہاں وہ آبادی کے پچیس فی صدی سے کم تھے، ساتھ ہی مزید نشستوں پر انتخاب لڑنے کی سہولت بھی تھی۔ اس کا لازمی پہلو بالغ رائے دہندگی تھا۔ بہرحال ایک بحث ہوئی، بال کی کھال نکالی گئی باریکیاں پیدا کی گئیں اور دلائل زیادہ سے زیادہ تجریدی ہوتے گئے۔ بالآخر گاندھی جی نے معاملے کو حل کرنے میں ناکامی کا اعلان کیا۔ تیسری کانفرنس بھی کسی حل کے بغیر ختم ہوئی۔ اس طرح پہلی گول میز کانفرنس حقیقتاً ایسی گول رہی جیسے ایک دائرہ۔ دوسری ایک اور زیادہ مکمل دائرہ اور جب تیسری کانفرنس ختم ہوئی تو پتہ چلا کہ یہ تو ایک بالکل گول صفر رہی"۔

"نتیجے نے یقیناً"، پردیپ نے رائے ظاہر کی، "حکومت کے اس موقف کی تصدیق کردی کہ ہندستانی سیاست داں خود اپنے تنازعات کو حل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے ہیں"۔

"بالکل!" سکریٹری آف اسٹیٹ برکن ہیڈ نے 8 نومبر 1927 کو برٹش اسٹیچوری کمیشن کا اعلان کرتے ہوئے یہی کہا تھا۔ پانچ سال بعد، برطانوی وزیراعظم رامے میکڈانلڈ نے بیان دیا کہ چونکہ کمیونل نمائندگی کے معاملے کو طے کیے بغیر کوئی آئینی پیش رفت نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لیے متنازعہ دعووں کو خود وہ طے کرے گا۔ نتیجہ تھا 16 اگست 1932 کا کمیونل اوارڈ"۔

"عزیز بھائی، اب گھر چلنے کا وقت ہوگیا"، پردیپ نے اچانک اعلان کیا۔

وہ کسی رکشے والے کے انتظار میں تھے جو انھیں کسی ایسی جگہ چھوڑ دے جہاں سے وہ اپنے اپنے گھروں کو پیدل جاسکیں کہ ان کی نظر ایک فقیر پر پڑی۔ فقیر کا کتا اس کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، فقیر چائے کی ایک پیالی کے لیے پیسے مانگ رہا تھا۔ عزیز کو فقیروں کی دولت کی کہانیاں یاد آئیں۔ اسے چارلس لیمب کے وہ اشعار بھی یاد آئے جن میں کہا گیا تھا کہ ان کہانیوں میں سے آدھی کہانیاں کنجوسوں کے گڑھے ہوئے بہتان ہوتے ہیں۔ قدیم ہندستان کی اساطیری دولت کی کہانیاں جنھوں نے شاعروں کو متحیر کردیا تھا اور فاتحین کی نظریں ہندستان پر جمادیں تھیں، قصہ پارینہ بن

چکی تھیں۔ ایچ این بریلس فورڈ نے لکھا تھا کہ "آج وہاں غربت و افلاس کا وہ پاتال ہے کہ جس کی گہرائی معلوم کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوتی ہے"۔ عالمی کسادبازاری کی وجہ سے یہ انتہائی اقتصادی بے اطمینانی کا زمانہ تھا۔ وائی ڈی گندیوا نے جن کی پوسٹنگ مشرقی یوپی میں گونڈے میں تھی، علاقے میں میلوں سفر کرنے کے بعد دیکھا تھا کہ وہاں کے کھیت اتنے ہی بھوکے تھے جتنے کہ ان کے جوتنے والے - زرعی پیداوار کی قیمتوں میں تباہ کن گراوٹ کسانوں کے مصائب میں مزید اضافے کا سبب تھی۔ فصلوں کی قیمت ہر بار آدھی یا ایک تہائی ہوجاتی تھی۔ گنگا کے میدانوں میں تین برس کی مدت میں گیہوں کی قیمت سات روپے سے چار اور پھر دو روپے من ہوگئی۔ بنگال کے جوٹ اگانے والے بھی ایسے ہی تجربات سے گزر رہے تھے۔ 1930 کے موسم خزاں اور موسم سرما میں گاؤں کے دورے کے بعد بریلس فورڈ نے کہا تھا کہ اس علاقے کے کسانوں کے ذہنوں میں ویسے ہی خیالات موجزن تھے جیسے خیالوں نے 1905 اور 1918 میں روسی، Muzhiks کو اپنے زمین داروں کو اس طرح روندنے پر اکسایا تھا کہ ان کے لیے راہ فرار صرف جلاوطنی تھی۔

1930 میں ملک میں بے چینی اور جوش و خروش تھا۔ آگرہ سے تھوڑی دور، فیروز آباد کے چھوٹے سے شہر میں، انگریزی سامان کا بائیکاٹ کرانے کے لیے دکانوں پر دھرنا دینے کے جرم میں دس کانگریسی جیل میں ٹھونس دیے گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لوہے کی ہتھکڑیاں تھیں، اور انھیں دو رسیوں کے بیچ میں جیل تک لے جایا گیا تھا۔ ان کے پیچھے سیدھی سیدھی قطاروں میں ان کے ہمدردوں کا قافلہ تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے، ہر شخص غصے میں تھا اور جھنجھلایا ہوا تھا۔ وہ سب مل کر کانگریس کے نعرے لگا رہے تھے کبھی کبھی کوئی گیت بھی شروع کردیتے تھے۔ یہی منظر برصغیر میں ہر جگہ تھا۔ مثلاً بمبئی میں، سول نافرمانی کے دوران سارا شہر دعائیں مانگتا رہا، گیت گاتا رہا۔ علی الصباح بلکہ اس سے بھی پہلے، سفید کھادی میں ملبوس لوگوں کے جلوس ہر گلی سے نکلے۔ مردوں کے سروں پر سفید کھدر کی گاندھی ٹوپیاں تھیں۔ کچھ لوگوں کے پاس ڈھول اور تاشے تھے۔ سب ہی گا رہے تھے۔

یہ تحریک انگریزی میں چند تعلیم یافتہ افراد ہی سے بات کرسکتی تھی، جو لوگ صرف اپنی مادری زبان پڑھ سکتے تھے۔ اِس کے پاس اُن کے لیے مقامی زبانوں کے اخبار تھے۔ مگر اِن اَن پڑھ عوام کو حُب الوطنی کے گانے اور رزمیہ گیت زبانی یاد تھے۔ گیت لیڈروں کی ہمت افزائی کے، اور جان کا نذرانہ دے کر آزادی حاصل کرنے کے اعلان کے گیت۔

نمک ستیہ گرہ، عظیم کسادبازاری کے ساتھ، کانگریس کی تاریخ کا ایک شاندار لمحہ تھا۔ جب ساٹھ سال کے ایک نحیف و نزار آدمی نے، اپنے اٹھہتر ساتھیوں کے ساتھ، اپنے سابرمتی آشرم کو چھوڑ کر، گجرات کے کنارے ایک چھوٹے سے ساحلی گاؤں ڈانڈی کا رخ کیا۔ یہ ایک تاریخی اور قابلِ دید مارچ تھا۔ اس مارچ میں دوسو میل کا سفر طے کیا گیا، اس میں چوبیس دن لگے۔ ٭س مارچ نے سارے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے گاؤں میں عوام کو اُن کی طاقت کا احساس دِلا دیا۔ اب ان کو تنہا ہونے کا احساس نہیں تھا۔ بنگال نے سنا کہ گجرات ٹکس دینے سے انکار کررہا ہے، یہ کیوں پیچھے رہے؟ حرکت و عمل کے اس انوکھے تصور نے بقول بریلس فورڈ "سارے غیرمنقلب افق کا احاطہ کرایا تھا"۔

مزاحمت کی جگہ اور اس کے طریقوں کا ولولہ اور جوش 1928 میں گجرات کے ایک شہر باردولی کے No Tax مہم سے ملا تھا۔ یہاں سردار پٹیل نے نہایت کامیابی کے ساتھ ستیہ گرہ کو منظم کیا تھا۔ گاندھی جی نے سی ایف اینڈ ریوز کو بتایا تھا کہ باردولی کی جیت سچ اور عدم تشدد کی جیت تھی۔ اور یہ کہ اس نے سیاست کے میدان میں عدم تشدد پر لوگوں کے ٹوٹتے ہوئے اعتماد کو بحال کردیا۔ دوسرے نمک ٹکس کو ختم کیا جانا کانگریس کا پرانا مطالبہ تھا۔ نمک پر ٹکس لگانا، گاندھی جی نے "ہند سوراج" میں لکھا، کوئی چھوٹی ناانصافی نہیں تھا۔ ستیہ گرہ شروع کرنے سے ایک دن قبل انھوں نے لکھا کہ یہ ٹکس انتہائی غیر انسانی پول ٹکس ہے جسے آدمی کی اختراعی صلاحیتوں نے ایجاد کیا ہے۔ یہ ٹکس کسی فروعی شے (چائے) یا کسی عطا (زمین) پر نہیں بلکہ ایک بنیادی ضرورت کی چیز پر، ایک ایسی شے پر ہے جو ہوا اور پانی کی طرح ضروری

ہے اور جس پر سب کا حق ہے اور اسے استعمال کرنے کا ہر فرد کو اختیار حاصل ہے۔ حکومت چوری کرتی ہے اور پھر استحصال، عوام کو اپنا حق جتانا ہوگا اور اُس شے کو اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کھڑا ہونا پڑے گا جو ان کی اپنی ہے۔

بالآخر دو سو میل کے فاصلے کو پیدل چل کر طے کرتے ہوئے درجنوں گاؤں سے پیدل گزرنے اور جگہ جگہ رک کر جلسے کرنے کا گاندھی جی کا منظم طریقہ ایک عظیم سیاسی مہم بن گیا۔ اس لیڈرشپ کی بڑھتی ہوئی اجتماعی قوت نے رضاکاروں کے ان جتھوں کو جو اس کے چاروں طرف جمع ہوگئے تھے ایک انسانی سیلاب میں بدل دیا جس نے تحریک کو سمندر سے ملا دیا۔ یہ سیلاب اپنے ساتھ ایسے متنوع عناصر کو ساتھ لے کر بڑھا کہ حیرت ہوتی ہے۔

نمک ستیہ گرہ کا آغاز ملک کے مختلف حصوں میں متعدد عوامی تحریکوں کی شروعات ثابت ہوا۔ اس میں بہت سے جراتمندانہ کام سامنے آئے۔ جیسے 1930 میں چٹاگانگ آرمری ریڈ اور کلکتے میں حکومت کے دفاتر کی عمارت رائٹرس بلڈنگ پر تین نوجوانوں کا حملہ۔ حکومت نے استبداد کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین موجود درار کو مزید چوڑا کرنے کی ایک اسکیم بھی تشکیل دی اور یہ اسکیم کمیونل اوارڈ تھا۔

ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے لیے الگ حلقہ ہائے انتخاب کے ساتھ ہی اس اوارڈ نے اس نظام کو دبے کچلے طبقوں تک بڑھا دیا۔ 1909 کا ایکٹ اگر شروعات تھی تو یہ اوارڈ مسلمانوں کا زیادہ سے زیادہ سہارا لینے اور انھیں ایک ممتاز سیاسی شناخت عطا کرنے کی حکومت کی حکمت عملی کا نقطہ عروج تھا۔ اس اوارڈ نے چونکہ ہندوؤں اور سکھوں کو مشترکہ طور پر بھی پنجاب میں نشستوں کی اکثریت نہیں دی تھی، اس لیے ہندو مہاسبھا اور سکھ دونوں کو غصہ تھا۔ کانگریس کا ردِّ عمل کمزور اور بین بین تھا۔ اس نے اوارڈ کو نہ تو منظور کیا تھا نہ ہی رد۔ نتیجہ علاحدگی کی شکل میں نکلا۔ مالویہ اور ایم ایس اینے نے کانگریس نیشنلسٹ پارٹی بنائی، بنگال کانگریس نے بھی اختلاف کیا، ٹیگور نے ایک عرض داشت پر دستخط کیے جس میں لندن سے اوارڈ میں ترمیم کے لیے

کہا گیا تھا۔

مسلمان لیڈر اس ردِّ عمل پر خفا تھے۔ مگر گفت و شنید کے دروازے پھر بھی کھلے رہے۔ جناح 1933 میں پارلیمنٹ میں سیموئل ہور کے پیش کیے ہوئے قرطاس ابیض کی مخالف قوتوں کے ساتھ مل گئے اور کانگریس سے بات چیت کے لیے تیار ہوگئے۔ اسمبلی میں مسلمان آزاد امیدواروں نے متعدد مسائل میں کانگریس کے ساتھ تعاون کیا۔

سرکاری برطانوی مورخ ریجنالڈ نے لکھا کہ قومی حزب اختلاف نے حکومت پر اس ہندو مسلم تعاون کے زمانے میں جتنا دباؤ ڈالا اس سے پہلے کبھی نہیں ڈالا تھا۔ اس صورت حال نے جناح اور راجندر پرساد کے جنوری 1935 کے مذاکرات کے لیے راہ ہموار کردی۔

اس طرح، ایک مایوس کن صورت حال میں امید کی ایک کرن دکھائی دیتی تھی۔ جناح اور راجندر پرساد نے ایک فارمولا تیار کرنے میں کامیابی حاصل کی جس کی توثیق گاندھی، بھولا بھائی ڈیسائی اور پٹیل نے کی مگر پنجاب اور بنگال میں ہونے والی مخالفت کا مقابلہ یہ لوگ نہ کرسکے۔ اگرچہ پرساد اور پٹیل اتفاق نہ کرنے والوں سے صرفِ نظر کرنے کے لیے تیار تھے مگر جناح نے مہاسبھا اور سکھ لیڈروں کی منظوری پر اصرار کیا۔ اس مرحلے پر مذاکرات ختم ہوگئے۔ راجندر پرساد نے بیان کیا:

> "گفتگو، جو میں نے 1935 میں مسٹر جناح سے کی اس میں ہم ایک فارمولا تیار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ میں نے اسے نہ صرف اپنی ذاتی حیثیت میں بلکہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بھی منظور کیا اور کانگریس سے اس کی توثیق کرانے کی بھی پیش کش کی.............. اُس وقت کانگریس ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ممبر دہلی میں تھے اور مجھ سے پورا اتفاق کرتے تھے .... مگر مسٹر جناح نے پنڈت مدن موہن مالویہ اور ہندو سبھا کے دوسرے لیڈروں کے

> دستخطوں پر اصرار کیا۔ ان کے دستخط حاصل کرنے میں میں کامیاب نہیں ہو سکا اور مسئلے کو چھوڑ دینا پڑا .... میں کچھ قدم اور بھی آگے گیا۔ میں نے مسٹر جناح سے کہا تھا کہ کانگریس اور لیگ کو اسے مان لینا چاہیے اور کانگریس اس کی مخالفت کرنے والے ہندوؤں سے بالکل اسی طرح نپٹ لے گی جس طرح اس نے اکثر صوبوں میں خاصی کامیابی کے ساتھ حالیہ اسمبلی انتخابات میں نپٹا تھا۔ مگر مسٹر جناح نے صرف اسے کافی نہیں خیال کیا اور ہندو مہاسبھا کی اس میں شمولیت کا مطالبہ چونکہ پورا کرنا ناممکن تھا اس لیے معاملے کو وہیں پر چھوڑ دینا پڑا۔

اس طرح اُن چند ضدی لیڈروں کی وجہ سے کروڑوں لوگوں کے مقدر پر مُہر لگ گئی جنھوں نے ہندستان کے ایک pluralistic سماج کو اور بیک وقت آئینی طور پر جستہ جستہ رکھنے کی خواہش کی درمیانی خلیج کو پُر کرنے کے لیے نمائندگی کی رعائتوں کو ماننے سے انکار کردیا۔ جناح کو جو اپنی کمیونٹی کو کانگریس کی گاڑی کے ساتھ رکھنے کی صلاحیت رکھنے والا واحد لیڈر تھا، بالکل تنہا کرکے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیا گیا جہاں ان کے دل میں کانگریس کے لیے صرف ضد تھی اور عناد۔

"عزیز بھائی ہم نے کافی تفصیلات دیکھ لیں، اب اس کے بعد؟" پردیپ نے بے صبری سے پوچھا۔

"میں واقعات کے تسلسل کے معاملے میں کچھ الجھ سا گیا ہوں۔ اور یہ ہوتا ہے جب دوستوں کو ہم ذرا لمبی رسّی دے دیتے ہیں"۔

"ہم اب کانگریسی وزارتوں کا کچھ ذکر کرلیں"، جگ موہن نے تجویز پیش کی۔ اس موضوع سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھا کیونکہ اس کے چچا نے پنجاب میں وزیر تعلیم کے پریس سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا تھا۔

اس تجویز سے پردیپ بہت خوش ہوا، "کیا بڑھیا خیال ہے؟ ہم ان کی کارگزاریوں کا یوپی کی اپنی موجود حکومت کے حسن کارکردگی سے موازنہ کریں گے"۔

"ہم اپنے صوبے سے شروع کریں" جگ موہن نے مشورہ دیا، "جہاں ٹیننسی بل، زبردست کامرانی ہے"۔

"تمھارا مطلب ہے یونائٹڈ پراونسز؟"

"یقیناً"، جگ موہن نے کہا۔

"مگر کانگریس کی طرف سے اتنی انقلابیت کیوں؟" پردیپ نے زور دے کر پوچھا۔

"کسانوں کی بغاوتوں کی تاریخی تفصیلات میں جائے بغیر میں تمھیں یہ بتاؤں کہ کسان سبھا اور ایکتا کی تحریکیں، دوسری دہائی کے اوائل میں سارے ملک میں پھیل گئیں۔ الہٰ آباد سے نہرو اور دوسرے نیشنلسٹ لیڈروں نے 1920 کے موسم گرما میں جنوبی اودھ کا دورہ کیا، وہاں انھوں نے دیکھا کہ سارے گاؤں میں جوش و خروش کی ایک آگ لگی ہوئی ہے۔ زبانی اطلاع پر، جلسہ گاہوں میں ہزاروں کا مجمع اکٹھا ہوجاتا ہے۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں کو اطلاع دیتا ہے، اور دوسرا گاؤں چشم زدن میں خبر تیسرے گاؤں کو پہنچا دیتا ہے۔ بسا اوقات تو پورے پورے گاؤں خالی ہو جاتے ہیں اور کھیتوں اور پگڈنڈیوں پر لوگوں کے قافلے، جلسہ گاہوں کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ یا اس سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ، سیتا رام سیتا رام کی آواز فضا میں گونجی، ایک گاؤں میں آواز اٹھی، دوسرے گاؤں میں بازگشت ہوئی اور لوگ جوق در جوق بھاگتے ہوئے جلسوں میں پہنچ گئے۔

راجہ جہانگیر آباد نے دہائی دی کہ بے زمین احتجاجی، زمیندار کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اودھ رینٹ ایکٹ (1921) اور ڈسٹرکٹ بورڈ بل نے خوف و ہراس اور بڑھا دیا۔ زمینداروں نے حکومت کا تحفظ مانگا۔ اس وقت ہر کورٹ بٹلر لفٹنٹ گورنر تھا۔ پہلے کاشتکار کو تحفظ کی ضرورت ہوتی تھی، بارہ بنکی کے تعلقدار نے لکھا، "اور

اب زمیندار کو حکومت کی حفاظت کی ضرورت ہے"۔ اسی سال نواب چھتاری نے زمیندار پارٹی تشکیل دی۔"

"یہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"مجھے ٹھیک معلوم نہیں ہے۔ میں اپنے طالب علمی کے زمانے میں ان سے ملا بھی نہیں۔ ہاں لوگ ان کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ خصوصاً ان کی بڑی بڑی گھنی مونچھوں کا ذکر بڑے لطف سے ہوتا تھا"۔

"تم کسان تحریک کے بارے میں بتا رہے تھے........"۔

"ہاں جگ۔ کسان تحریکیں کیوں چلیں، اس معاملے میں اتفاق رائے ہے۔ اودھ میں زرعی (زمینی) تعلقات کی نوعیت جیسے 'نذرانہ'، 'بے دخلی' اور 'ابواب'۔ قابل غور اور قابل بحث ہے تو وہ ہے قوم پرستی کی سیاست سے ان کا تعلق۔ کچھ مورخین کسانوں اور اس عہد کی سیاست کے مفادات کے باہمی ٹکراؤ کی بات کرتے ہیں مگر کہتے ہیں کہ سیاسی جدوجہد اور کسانوں کی سرگرمیوں کے مقاصد ایک دوسرے سے یکسر مختلف نہیں تھے۔ اس نقطۂ نظر سے جو لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اودھ میں کسان تحریک کانگریس کی اِس میں شرکت سے بہت پہلے زور پکڑ چکی تھی۔ اس کے لیڈر تھے بابا رام چندر، جن کی جیل سے رہائی کے لیے چالیس پچاس ہزار کسان طرح طرح کے مظاہروں اور احتجاجوں کے لیے نکل پڑے تھے۔ کسانوں کے سیاسی mobilisation کی طرف کانگریس کے رویّے میں اگر عدم تسلسل نہ کہیے تو ایک طرح کے بنیادی تذبذب اور بے یقینی کے معاملے میں بھی مورخین متفق نہیں ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ عدم تسلسل، کچھ تو کسانوں کی نامعلوم دنیا کو سمجھنے میں ناکامی کی وجہ سے پیدا ہوا۔"

"لیکن"، پردیپ نے کہا، "ہم تو یہ سمجھتے رہے ہیں کہ کانگریس کلّی طور پر زمینی اصلاحات کے حق میں تھی۔ کیوں، کیا ایسا نہیں ہے؟"

صحیح ہے، یوپی کانگریس نے 1931 میں صوبے میں زرعی صورت حالات پر

غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ ایک دوسری کمیٹی نے پانچ سال بعد، ایک رپورٹ میں سفارش کی :

(الف) کرائے اور محصول کی ازسرنو تعیین، (ب) کرائے میں تخفیف، (ج) غیر سومند زمینی پٹوں کے کرائے یا محصول سے معافی۔ (د) زرعی آمدنیوں کا تدریجی تخمینہ، (ہ) امداد باہمی کاشت کا تعارف، (و) کرائے کے علاوہ جاگیرداری قرضے اور دوسرے مطالبات کا خاتمہ اور (ز) آگرہ اور اودھ میں جوت دار اور ضمنی جوت دار کو حقِ قبضہ۔ اس کمیٹی نے جلد یا بہ دیر زمین داری کو ختم کیے جانے کی بھی سفارش کی"۔

"تو تم جو کہہ رہے ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ یوپی ٹیننسی بل ایسی ہی پیش قدمیوں کا پھل ہے؟" پردیپ نے پوچھا۔

"ہاں، اسی کے ساتھ 1936 کے زرعی پروگرام کے بہت سے نکات کو بھی قبول کیا گیا۔ مگر بہت سے اور تھے جن پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ بہار میں 'بہ کاشت' زمین کے پریشان کن سوال پر منسٹری جھجھک گئی"۔

"یہ 'بہ کاشت' زمین کیا ہے؟"

"1929 میں اقتصادی کسادبازاری کی وجہ سے رعیت کی بہت بڑی تعداد اپنی زیرکاشت زمین کا کرایہ نہیں دے سکی، نتیجتاً زمین کے کرائے کی ڈگریوں کی تعمیل میں انھیں اپنی زمینوں کو فروخت کرنا پڑا۔ اکثر ان زمینوں کو خود زمین دار نے خرید لیا۔ اگرچہ بہار ریسٹوریشن آف بہ کاشت لینڈس اینڈ ریڈکشن آف ایریرس آف رینٹ ایکٹ ایسے ہی کسانوں کو راحت دلانے کے لیے بنایا گیا تھا مگر اس میں دی گئی سہولتوں نے کوئی قابل ذکر کام نہیں کیا۔ ٹیننسی اقدامات کی بنیاد کانگریس اور زمینداروں کے ایک باہمی معاہدے پر مبنی تھی اور محض اشک شوئی۔ یہی وجہ ہے کہ کسان سبھاؤں نے کانگریس کو "زمین دار کانگریس" کا نام دے دیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بہار اور یوپی کی وزارتوں نے زمین دار دوست پالیسیوں ہی کی پیروی کی۔ اسی لیے یہ

کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ بہار منسٹری نے انواری ستیہ گرہ میں سرگرم لوگوں کو یہ کہہ کر کہ ساری جدوجہد دیش دشمن عناصر کی سازش ہے ناقابلِ اعتبار ٹھہرانا چاہا۔ سارن ڈسٹرکٹ میں کسان لیڈروں کو، بشمول راہل سنکراتائین' اسی بنیاد پر سیاسی قیدی کا درجہ بھی نہیں دیا گیا کہ یہ لوگ کسان جدوجہد میں سیاسی مقاصد سے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر شریک ہوئے تھے۔ سردار پٹیل نے 1938 میں سارن میں اعلان کیا کہ کامریڈ لینن ہندستان میں نہیں پیدا ہوئے تھے اور یہ کہ وہ ہندستان میں کوئی لینن نہیں چاہتے ہیں۔ انھوں نے اُن لوگوں کو جو طبقاتی نفرت کی تبلیغ کرتے تھے، ملک دشمن قرار دیا"۔

"حیرت ناک"، پردیپ نے شدید بے اعتباری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"صرف یہی نہیں"، عزیز نے مزید کہا، "پٹیل نے دھالی نگر میں کسان ریلی اور کسان کانفرنس دونوں پر پابندی لگادی۔ مگر پھر بھی دو ہزار کسان خود اپنے قومی اور لال جھنڈوں کے ساتھ قومی جھنڈے کے سامنے سے گزرے۔ اور دس ہزار افراد جلسے میں اکٹھا ہوئے، یہ دوسری بات ہے کہ بے پناہ روشنی والے اس عظیم شہر میں اس جلسے کی زیادہ تر کارروائی اندھیرے میں ہوئی"۔

"مجھے یقین نہیں آتا ہے"، پردیپ نے اپنا خیال ظاہر کیا، "کہ باردولی ستیہ گرہ کا ہیرو اور کانگریس کا مشہور لیڈر ایسا کر سکتا ہے"۔

"کیوں، یقین کیوں نہیں آتا؟" کامگار طبقے کی طرف سے کانگریس کا رویہ بھی اتنا ہی مذبذب تھا"۔

عزیز نے بتایا کہ وزارتوں کے قیام سے پہلے نہرو نے کہا تھا کہ کانگریس اور لیبر موومنٹس کا ایک دوسرے سے رشتہ نہیں تھا۔ انھوں نے ایک کمیونسٹ ٹریڈ یونینسٹ کو بتایا تھا کہ کانگریس کوئی مزدوروں کی تنظیم نہیں بلکہ مختلف قسم کے لوگوں کی ایک جماعت ہے۔ بعد کو جب بمبئی کی ورکرز اینڈ پیزنٹس پارٹی نے کانگریس سے شکایت کی کہ اس نے جی آئی پی ریلوے ورکرز کی ہڑتال میں مدد نہیں کی تو انھوں

نے جواب میں یہ لکھا کہ پارٹی پر ہمہ وقت تنقید کرنا اور پھر اس سے مدد کا طلبگار ہونا مناسب بات نہیں ہے۔

عزیز نے بمبئی میں انڈسٹریل ڈسپیوٹس بل (1938) کو پیش کرنے کے کانگریس حکومت کے فیصلے کے بارے میں بات کی۔ اس نے بتایا کہ اس بل نے ورکنگ کلاس کے ساتھ ایک بڑی کشمکش کی بنیاد ڈال دی۔ 7 دسمبر کو ایک بڑی ہڑتال ہوئی جسے انتہائی سختی سے دبا دیا گیا۔ ناراض امبیدکر نے کہا کہ کانگریس کے راج میں تشدد اور دہشت گردی کا مقابلہ کیے بغیر ایک دن کی ہڑتال کرنا ممکن نہیں ہے۔

ایک دوسری جہت کی طرف رخ کرتے ہوئے عزیز نے رجواڑوں (Princely States) کی طرف کانگریس کے رویتے کے ابہام کا حوالہ دیا۔ ان میں سے کئی رجواڑے اپنے حکمرانوں کے خلاف طاقت ور عوامی تحریکوں کے کرب میں مبتلا تھے۔ راجکوٹ میں، جہاں گاندھی جی کے پتا دیوان تھے، شورش تھی۔ اسی طرح جے پور تھا۔ جہاں پرجامنڈل پر پابندی لگا دی گئی تھی اور ریاست میں داخلے پر لگائی ہوئی پابندی کی خلاف ورزی کرنے کے سلسلے میں جمنا لال بجاج کو گرفتار کرلیا گیا تھا۔ خود گاندھی جی نے لکھا کہ Talcher اور Dhenknal نے استبداد کی سربراہی کی۔ کچھ برسوں تک کانگریس نے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا۔ گاندھی جی نے تدبر اور سیاست دانی کی اعلیٰ مثال قرار دے کر اس کا دفاع کیا۔ دسمبر 1938 کے وسط میں ورکنگ کمیٹی نے اس کام پر حالات کی عائد کی ہوئی کچھ پابندیوں اور ان مصلحتوں کا حوالہ دیا جنھوں نے ریاستوں کی ان داخلی جدوجہدوں میں براہ راست دخل اندازی کو روکا تھا۔ اس کی وضاحت 3 جون 1939 کے نہرو کے انٹرویو سے ہوتی ہے۔

سوال : راج کوٹ کے معاملے میں گاندھی جی کے برت کے بارے میں آپ کو کیا کہنا ہے؟

جواہر لال : راج کوٹ سے متعلق گاندھی جی کا عمل فوری طور پر سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ برت تو ہمیشہ ہی جابرانہ ہوتا ہے۔ مگر میں جبر کے خلاف نہیں ہوں۔

سوال: متعدد ہندستانی ریاستوں میں اس وقت ہونے والی جدوجہدوں کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟

جواہر لال: ریاستوں کی جدوجہد کے مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی کرنا خوفناک حد تک دشوار ہے۔ میں نے کچھ ریاستوں کے لیڈروں سے حالات پر تبادلہ خیال کیا ہے اور صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہاں بوجھ اور ذمے داریوں کو دوسروں کے کندھوں پر ڈال دینے کا رجحان ہے۔ ریاستوں کے عوام چاہتے ہیں کہ بوجھ دوسرے اٹھائیں۔ یقیناً یہ صورت حال قیادت اور اچھے لوگوں کی کمی کے علاوہ بہت سے دوسرے اسباب کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے"۔

"مگر"، جگ موہن نے زور دے کر پوچھا، "وزارتوں نے قابل ذکر کچھ تو کیا ہوگا، مجھے شبہ یہ ہے کہ تمھاری تصویر ایک طرفہ ہے، اس کے علاوہ تم نے اُن دشواریوں کو بھی اپنے سامنے نہیں رکھا جن کا سامنا کرتے ہوئے کانگریس نے اپنا تاریخی مشن پورا کیا"۔

"اس سے پہلے کہ آپ اپنا وعظ شروع کریں، 1935 میں کارکنوں نے کیا کیا تھا آپ کے سامنے رکھوں، "ہمیں سورج وَا میں کا دھرا ہے، جیسے انگریجوا کا راج تیسَو گاندھی مہاراجوا کئی، ہم تو بھیڑیں ہیں، جو انہیں توئ کٹیہیں" نومبر کی ہڑتال میں اس بات کو چھاپ کر خوب بانٹا گیا"۔

30 اپریل کے اخبار "لیڈر" کی لکھی ہوئی رائے بھی یاد رکھیے، "اب جبکہ دو سال تک کانگریس حکومت کا تجربہ ہوگیا ہے اور اس نے گڑبڑ ہی گڑبڑ کی ہے، تو لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا ہے کہ اس حکومت کو آخر ہوا کیا"۔ 6 مئی کو اسی اخبار نے پھر لکھا کہ چیزیں ایسے قابل مذمت مقام پر آگئی تھیں کہ خود کانگریس میں ایک حلقے نے اپنی بنیادی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں عوامی حکومت کی نااہلیت پر اپنی مایوسی، برہمی بلکہ اپنے تنفر کا اظہار برملا کرنا شروع کردیا تھا"۔

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں ...." جگ موہن نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"خود سردار پٹیل نے ان پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ بہار میں جہاں کانگریسی وزارت ناکام رہی تھی انھوں نے اس سلسلے میں بھائی بھتیجاواد، ذات پات کے چلن اور جبر و تشدد کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ 'بہ کاشت' زمینوں کا مسئلہ تو انتہائی سنگین ہوگیا تھا، مگر وزارت اس سب سے غیر متاثر تھی۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو فوری حل چاہتا ہے مگر موجودہ وزیروں کے ہاتھوں کسی حل کا کوئی امکان دور دور نظر نہیں آتا ہے۔ چھوٹاناگپور کو الگ کرنے کی آدی واسی تحریک کی شدید مخالفت وزیراعظم کی طرف سے ہوئی۔ 28 جولائی 1939 کے 'لیڈر' میں آبزرور نے لکھا کہ حکومت سنبھالنے کے دو سال بعد وہاں جتنی بے اطمینانی اور بے چینی تھی صوبے میں اتنی بے چینی اور بے اطمینانی پہلے کبھی نہیں تھی۔

"عزیز بھائی میں کچھ کہہ سکتا ہوں؟"

"نہیں جگ، پہلے میں اپنی بات ختم کرلوں"۔

"O.K."

آخر میں بمبئی اور سی پی حکومتوں نے، پریس ایکٹ کے تحت اخباروں سے ضمانت طلب کی۔ بڑھتی ہوئی نکتہ چینیوں پر اے آئی سی سی ردِّعمل یہ تھا کہ اس نے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کو روزانہ کے انتظامی معاملات میں دخل نہ دینے کی ہدایت کی اور کہا کہ کانگریس کو کسی منسٹر کے خلاف ستیہ گرہ وغیرہ کسی معقول اتھارٹی کے بغیر نہیں کرنا چاہیے"۔

"جگ، تمھارے دماغ میں کیا الجھنیں ہیں؟" پردیپ نے پوچھا۔

"اب تو مجھے یاد نہیں"۔

"بتاؤ بھی، .... یاد کرنے کی کوشش کرو کہ تمھارے چچا نے تمھیں کیا بتایا تھا؟"

اگرچہ میرے چچا ایک Unionist تھے مگر وہ ایک قومی تنظیم کو چلانے کی

دشواریوں کا ذکر کرتے تھے، لوگوں کو ساتھ رکھنے کی بات کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اسی سے پتہ چلتا ہے کہ کانگریسی لیڈر، ذات، طبقے یا کمیونٹی کے الگ الگ اتحاد و یکجہتی کی طرف کیوں اتنے محتاط تھے۔ یہ بات میں ان کے دفاع میں نہیں کہہ رہا ہوں مگر پٹیل یا پرساد سے انقلابیوں کے طور طریقوں کو اپنانے کی ہم توقع نہیں کرسکتے ہیں۔ نہیں کرسکتے ہیں نا؟ نہرو نے بھی اپنی خودنوشت میں لکھا نہیں تھا کہ کانگریس کا نقطہ نظر اور اس کے ڈھنگ petty bourgeoisie تھے۔ کیا انھوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ اپنے وجود میں ایک بحران سے گزر رہی تھی؟ اہم بات یہ ہے کہ کانگریس نے اپنی معذوریوں اور مجبوریوں کے ساتھ، ایک قومی تنظیم کا منصب حاصل کیا، آزادی کی جدوجہد کی قیادت کی اور متعدد ذاتوں، طبقوں اور فرقوں کے مختلف حصوں (communities) کو جمع کیا۔ اس حقیقت سے صَرف نظر نہیں کرنا چاہیے۔ تمھارے طالب علم جو جاننا چاہیں گے وہ یہ ہے کہ کمیونسٹ اور سوشلسٹ، جو سماج کے سہولتوں سے محروم لوگوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہیں، اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیابی کیوں حاصل نہ کرسکے۔ تم نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے اس سے تو ان کی کامیابی کی شرح بڑی مایوس کن لگتی ہے۔ آج کل اخبارات بھی مختلف علاقوں کے ان کے کم ہوتے ہوئے اثر کا ذکر کرتے ہیں۔

"اس منزل میں کمیونسٹوں کو بیچ میں لانا یقیناً غیر متعلق ہے"۔ پردیپ نے کہا۔

"انھیں لانے دو، میں مانتا ہوں کہ تیسری دہائی میں کمیونسٹوں نے غلطی کی۔ اگرچہ جنگ کے نتیجے میں معروضی صورت حال میں ان کی حکمت عملی تصحیح کا مطالبہ کررہی تھی۔ برطانیہ عظمیٰ کی کمیونسٹ پارٹی کے پام دت اور بن بریڈلے نے اس نکتے پر زور بھی دیا۔ نتیجتاً ہندستانی کمیونسٹوں نے ایک متحدہ محاذ کے لیے کام کیا، کانگریس اور سوشلسٹ پارٹی سے انھیں توانائی بھی کافی ملی۔ ان میں ممتاز تھے سوامی سہجانند، اِندولال یاگنک، سجاد ظہیر، زیڈ اے احمد، اشرف اور میاں افتخار الدین"۔

"مگر حکمت عملی میں تبدیلی"، جگ موہن نے خیال ظاہر کیا، "اس زمین کی

بازیافت کے لیے کافی نہیں تھی جو انھوں نے کھوئی تھی۔ بہر حال، مجھے کیمونسٹوں کے مقدر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"یہ منصفی نہیں ہے۔ تم انھیں منافق نہیں قرار دے سکتے ہو۔ ان کے مطمح نظر اور ان کی حکمت عملی سے اختلاف کر سکتے ہو مگر ان کی عظیم قربانیوں کو نہیں بھولنا چاہیے۔ وہ زیادہ تر بے غرض لوگ تھے۔ ان کا اصول محنت کش عوام کی اقتصادی حالت کو بہتر کرنا تھا۔ ان کے اصل دشمن برطانوی کلونیل ازم اور ہندستان میں اس کے حامی زمیندار اور سرمایہ دار تھے۔ صحیح ہے کہ انھوں نے گاندھی اور کانگریس کے رول کو غلط سمجھا، مگر اس الزام کو ان پر زندگی بھر نہیں لگائے رکھنا چاہیے۔ کیمونسٹوں کا مذاق اڑانے کے لیے بلی کے بکروں کی ہمہ وقت تلاش اور آزادی کی جدوجہد میں ان کے حصے اور ان کی دین کو کم کر کے دیکھنا آج کی سیاسی اور دانش ورانہ زندگی میں کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ دائیں بازو کی طرف سے ان پر ہونے والے حملوں کا موثر طور پر جواب دیا جانا چاہیے۔

"میں کیمونسٹوں یا سوشلسٹوں کو بدنام نہیں کر رہا ہوں۔ پچھلی گفتگو کے سیاق و سباق میں میں جس چیز کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں وہ کانگریس میں پرانی انٹرپارٹی کشمکش ہے۔ کیا تم نے 1907 میں سورت تفرقے (Surat split) اور گاندھی جی کے عدم تشدد میں لبرل لوگوں کے ساتھ نہ آنے کا ذکر نہیں کیا تھا؟ کیا تم نے نوچینجرز اور داس - موتی لال ٹولے کے باہمی تنازعے یا مکمل آزادی کے وکیلوں اور ڈومینین اسٹیٹس والوں کے درمیان تنازع پر جو 1929 میں سامنے آیا تھا یہ بات نہیں کی تھی؟ کیا تم نے دائیں بازو کے کانگریسیوں اور اس لے سوشلسٹ معاندوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی باہمی چپقلش اور 1939 میں کانگریس کے صدر کے انتخاب پر نامناسب اختلاف کا حوالہ نہیں دیا تھا؟"

"بوس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا"، پردیپ نے اضافہ کیا، "وہ ظاہر کرتا ہے کہ کانگریس نے بعض اپنے بڑے لیڈروں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا"۔

"اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ"، جگ موہن کی تقریر جاری تھی، "پالیسیوں اور پروگراموں میں کمی بیشی کی جاتی رہی اور ان میں سیاسی ضرورتوں کے لحاظ سے کتر بیونت ہوتی رہی مگر یہ بات ایک ایسی پارٹی میں کچھ غیر متوقع نہیں تھی جو انقلابی یا سوشلسٹ ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں کرتی تھی"۔

"زرا پھر کہو"، پردیپ نے اپنی بھوئیں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے"، جگ موہن نے دھیرے سے کہا، "اصل اور قابلِ غور مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس نے، اگرچہ اپنے داخلی تضادات کا شکار تھی، اپنے لیے ایک غیر ارادی بنیاد بنالی تھی، ایک حقیقت جو خود اس کی اپنی کامیابی و کامرانی کے لیے اہم تھی مگر ہماری جمہوریت کے لیے بھی ضروری تھی۔ اس نے مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے دانش وروں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جنھوں نے اس کے ایجنڈے کی تشکیل میں اپنے اپنے بس بھر حصہ لیا۔ چنانچہ سوشلسٹوں نے فنڈامنٹل رائٹس ریزولیوشن کا مسودہ تیار کیا اور ساتھ ہی پارٹی کا 1936 کا زرعی پروگرام بھی۔ کمیونسٹ پارٹی کی کوششوں کا نتیجہ، جیسا کہ عزیز بھائی نے ہمیں بتایا ہے، ٹریڈ یونینوں، کسانوں اور دوسری تنظیموں کی شمولیت کی شکل میں نکلا"۔

"اب تمھاری بات کچھ سمجھ میں آرہی ہے"، پردیپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے اجازت دو"، جگ موہن نے اپنی بات کو مکمل کرنے کے لیے گفتگو جاری رکھی۔ "میں نے نہرو کی آٹوبایوگرافی بڑے دھیان سے پڑھی ہے۔ ان کے ناقدین، جو چاہیں کہیں مگر انھیں اپنی پارٹی کے خدوخال اور اس کے رجحانات کا احساس تھا۔ مجھے یاد ہے کہ انھیں کتنا دکھ تھا کہ ان کے ساتھیوں نے اسمبلی کے انتخاب سے قبل اپنے پروگرام کو ہلکا کردیا، مدراس میں قدامت پرست عناصر کی تسکین کی خاطر ٹمپل انٹری بل پر کس کس طرح یقین دہانیاں کی گئیں اور کس طرح 1937 میں ایک جارح الیکشن مہم سے احتراز کیا گیا"۔

"حقیقتاً حیرت انگیز"، کیا خوش بیانی ہے، واقعات و رجحانات پر غیر معمولی عبور۔ عزیز بھائی آپ دیکھ رہے ہیں، جگ بالکل ایک پیشہ ور مورخ کی طرح تقریر کرتا ہے"۔

"اس تعریف کا شکریہ، مگر میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پنڈت جی نے بہت صحیح پیش گوئی کی تھی کہ پارلیمانی پروگرام کانگریس کو چند نشستیں زیادہ ملنے کی امید میں، سیاسی اور سماجی طور پر رجعت پسند مفادات سے مفاہمت کرنے کی طرف لے جائے گا۔ انھیں لیڈرشپ اور عوام کے مابین خلیج کے وسیع ہونے کا بھی ڈر تھا"۔

"بہت ٹھیک ہے جگ"، عزیز نے اتفاق کرتے ہوئے کہا، "مگر خدا کے لیے نہرو کی لفاظی کے سیلاب میں بہومَت — ہم جانتے ہیں کہ اہم مسائل پر وہ کس کس طرح جھکے، کس کس طرح انھوں نے رجعت پرست گروہوں کے ساتھ رعایتیں کیں اور کس کس طرح انھوں نے اپنے حامیوں اور معاونوں کی توقعات کو پورا نہیں کیا۔ کیا تم نے آزادی سے فوراً پہلے انڈین سوشلسٹ پارٹی کے سکریٹری جے پرکاش نرائن کا بیان نہیں پڑھا تھا کہ اگر کانگریس نے اگلے چند مہینوں میں سوشلسٹ پالیسیاں اختیار نہ کیں تو وہ اور ان کے ساتھی پارٹی سے الگ ہوکر آزادانہ کام کریں گے"۔

"تم سے بحث کرنے کے لیے میری واقفیت کم ہے"، جگ موہن نے کہا، "مگر میں چاہوں گا کہ تم بات کرو"۔

"نہیں، نہیں"، عزیز نے زور دے کر کہا، "جن دشواریوں کی تم بات کرتے ہو میں ان سے انکار نہیں کرتا ہوں پھر بھی عام کانگریس کی تحریک اور 1937 سے لے کر 1939 تک کے اس کی عظمت کے زمانے میں فرق کرنا چاہوں گا۔ میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ ہے، وزارت کے زمانے میں اعلانیہ نظریات اور اس کی پالیسیوں میں فرق۔ صحیح ہے کہ اس تفریق کے آثار ابتدائی ایام میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں مگر یہ زیادہ واضح اور نمایاں اس زمانے میں ہوئی جب کانگریس نے عِنانِ حکومت سنبھالی۔ دیکھو میں 1935 کے ایکٹ کی عائد کی ہوئی مالی دشواریوں اور وزیروں کی

کوششوں پر قدغن کی نوکرشاہی کی کوششوں سے انکار نہیں کرتا ہوں، نہ ہی میں اہم قوانین سے صَرفِ نظر کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے جہاں 'نوبت چوکیداری' کو ترک کردیا گیا تھا۔ زرعی مقروض راحت ایکٹ (Agricultural Debtors' Relief Act) نے اس سود کی شرح کو محدود کردیا جو ساہوکار لیتا تھا اور اس سود کو بھی منسوخ کردیا جو creditors کو دیا جاتا تھا۔ سی پی اور برار میں The Relief of Indebtedness Act، The C.P. Revision of Land Revenue of Estates Act اور C.P. Revision of Tenancy (Amendment) Act اہم قوانین تھے۔ اڑیسہ میں کسان کو زمیندار کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے سے پہلے آزاد کرانے، مالی امداد فراہم کرنے اور قرضے سے راحت دلانے کے لیے اسے آزاد اور زیادہ خودمختار حیثیت دلانے کی کوششیں کی گئیں۔ مدراس میں اسمبلی نے "ٹمپل انٹری بل" پاس کیا"۔

"اگر معاملہ یہ تھا"، جگ موہن نے پوچھا، "تو پھر 1939 میں جنگ چھڑنے کے بعد وزارتوں نے استعفیٰ کیوں دیا؟"

"نمک ستیہ گرہ سے وزارتوں تک؟ تکلف برطرف، کیا بات ہو رہی ہے، میرے تو کچھ پلے ہی نہیں پڑ رہا ہے"، پردیپ نے دبے دبے احتجاج کیا۔

"کوئی بات نہیں، میں نے شروع ہی میں کہا تھا کہ واقعات کو سلسلہ وار بیان کرنا میرا طریقہ نہیں ہے۔ اس کے لیے تو تم 'انڈین اینول رجسٹر' یا 'رش بروک' کے ترتیب دیئے ہوئے اہم واقعات کی سالانہ سیریز کو دیکھو۔ میں نے جس بات کا ذکر کیا تھا وہ یہ تھی کہ کانگریس نے جنگ کے مقاصد کے فوری تعین اور فوری اعلان آزادی دونوں کا مطالبہ کیا۔ ہائی کمانڈ نے وائسرائے لنلتھگو کی پہل قدمیوں کو ٹھکرادیا۔ گاندھی جی نے 1940 کے موسم خزاں سے سول نافرمانی کی ایک دوسری تحریک شروع کی، 17 اکتوبر کے دن، ونوبھا بھاوے نے واردھا کے قریب ایک گاؤں Paunar میں جنگ کے خلاف ایک تقریر سے شخصی ستیہ گرہ تحریک کا نہایت سنجیدگی کے ساتھ افتتاح کیا۔ 31 اکتوبر کو واردھا سے واپس ہوتے ہوئے Chheoki کے ریلوے اسٹیشن

پر پنڈت جی گرفتار کر لیے گئے۔ انھیں چار سال کی قید کی سزا دے دی گئی۔ وسط نومبر میں نمائندہ ستیہ گرہ (Representative Satyagraha) کے گاندھی جی کے اعلان سے مہم کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی، اے آئی سی سی کے ممبروں اور مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے کانگریسی اراکین کی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ مہم کا تیسرا مرحلہ 5 جنوری 1941 میں شروع ہوا۔ اپریل میں اس کی تجدید ہوئی۔ اس کی خصوصیت ستیہ گرہ کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ تھا۔

ان جزئیات اور تفصیلات کو دیکھو جن کے ساتھ گاندھی جی نے مہم کا منصوبہ تیار کیا۔ کانگریسیوں کے مختلف حلقوں میں ان کی پالیسیوں پر ہونے والی چہ میگوئیاں اور کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی کھلی نکتہ چینیوں کے باوجود انھوں نے اپنے پروگرام کو آگے بڑھایا، اپنی جدوجہد کو ان تمام الجھنوں، مقامی دھڑے بندیوں اور ترجیحات کے باوجود جنھوں نے ایک برسر اقتدار پارٹی کی حیثیت سے کانگریس کو ضدی بنادیا تھا، اپنی جدوجہد کو ایک اعلیٰ اخلاقی سطح تک اٹھا دیا۔ انھوں نے جتا دیا کہ ایک اور موقع ملنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ بہرحال، یہ ان کی کھلی بغاوت تھی۔ اس کے بعد ورکنگ کمیٹی کو پونا میں زیرحراست لے لیا گیا، ایک مختصر مگر گمبھیر تشدد پھوٹ پڑا جس میں بہت سی جانیں تلف ہوئیں اور مالی نقصان کا اندازہ ایک ملین پاؤنڈ لگایا گیا۔

"تو"، پردیپ نے کہا، "1934 میں ریٹائر ہونے کے بعد مہاتما اب پھر کام پر واپس آگئے تھے"۔

"ہاں، اور ایک دھماکے کے ساتھ"، عزیز نے تصدیق کی۔

"اور لیگ؟" پردیپ نے پوچھا۔

"لیگ نے جنگی کوششوں میں اپنے تعاون کا انحصار مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور اس بات کی ضمانت پر رکھا کہ اس کی منظوری کے بغیر کوئی آئینی پیش رفت نہیں ہوگی۔ اس نے "ہندستان چھوڑدو" تحریک کی مخالفت کی، حکومت سے مصالحت کی اور اپنی حیثیت کو مستحکم کرلیا"۔

پردیپ کے اس استفسار پر کہ مسلم لیڈرشپ نے 1938 اور پھر اس کے بعد ایسا شوروغل کیوں کیا، عزیز نے نہرو رپورٹ کے منظرعام پر آنے کے بعد کانگریس سے ان کی دوری کی طرف توجہ دلائی۔ ان کے باہمی اختلافات راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد، کمیونل اوارڈ پر ہنگامے اور 1937 میں اتحاد پر ہونے والے خلط مبحث کے بعد بڑھ گئے۔ کانگریسی وزارتیں آخری تنکا ثابت ہوئیں۔ پیرپور رپورٹ ان کی غلطیوں کی فہرست تھی، مختصراً شکایتیں خصوصی بھی تھیں اور عمومی بھی۔ مسلم لیڈروں نے کانگریس ایجنڈے کو مہاسبھا کا املا کرانے، ہندو حکام کی بددماغی، جبر و تشدد اور ہندو راج کی آمد آمد کی طرف خصوصیت کے ساتھ اشارہ کیا۔ بہار اور سی پی میں انھوں نے واردھا اور وِدیا مندر کی تعلیمی اسکیموں، بندے ماترم کے گائے جانے اور کانگریس کے جھنڈے کے لہرائے جانے کے خلاف احتجاج کیا۔ یوپی میں، انتظامیہ پر ہندو مسلم فسادات کو بھڑکانے کا الزام لگایا۔ اگر سچ کہو تو جھنڈے کے معاملے میں لیگ کو کوئی پریشانی نہیں ہونا چاہیے۔ اس پر اعتراضات حالیہ شاخسانہ تھا۔ نہرو یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ جھنڈا قومی تحریک کی نہایت واضح نمائندگی کرتا ہے اور اسے عام طور پر تمام فرقوں کے اتحاد و یکجہتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

"خوش فہمی"، جگ موہن نے بہت سوچنے کے بعد کہا، "تم نے coalition کی بات ہمیں یہ بتائے بغیر کی ...." اس سے پہلے کہ جگ موہن اپنا جملہ پورا کرے عزیز نے وضاحت کی۔

1936 میں راجہ آف محمود آباد کا خیال تھا کہ کانگریس اور لیگ ایک ہی فوج کے دو حصوں کی طرح تھیں جو ایک مشترک دشمن سے دو محاذوں پر لڑرہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ صحیح تھے۔ ان کے منشور پڑھو تمھیں پتہ چل جائے گا۔ یوپی میں تو یہ لوگ الیکشن میں امیدوار کھڑے کرنے پر بھی متفق ہوئے۔ جناح کو توقع تھی کہ یہ دونوں پارٹیاں مل کر پیچیدہ اور دقت طلب مسائل کو بھی حل کرلیں گی۔ انھوں نے ایک علاحدہ محاذ کی بات کی۔ 18 ستمبر 1937 کو انھوں نے اعلان کیا کہ کانگریس اور لیگ کے آئیڈیلس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ نہرو نے اتفاق کیا، "صرف دو مہینے

بعد ہی انھوں نے اپنے ایک قریبی دوست سے کہا تھا کہ وہ کوئی اختلافات نہیں دیکھتے ہیں"۔

"پھر کیوں"، پردیپ نے پوچھا، "اس زمانے میں لیگ کو ایک مقابل قوت اور ایک سیاسی حریف سمجھا گیا"۔

واقعے کے بعد عقل مند ہوجانا مشکل نہیں ہوتا، مگر میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ ایک اتحادی وزارت کی طرف کانگریس کی تندخوئی ایک سیاسی غلط اندازی تھی۔ اس نے لیگ کے احیاء کے لیے جگہ پیدا کردی، اس نے جناح کو یوپی جیسے صوبے میں قدم جمانے کا موقع فراہم کردیا جہاں ان کی ابتدائی سلسلہ جنبانیوں کو بار بار ٹھکرایا گیا تھا۔ اور ہندستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے ان کے دعوے کو تقویت بخش دی۔ یہ صحیح ہے کہ لیگ کو وزارت میں لانے سے پارٹیوں کے باہمی جھگڑے بڑھ سکتے تھے اور کانگریس کے زرعی ایجنڈے میں بھی ملاوٹ ہوسکتی تھی۔ بہرحال، اس کے نمائندوں کی شمولیت کو منظور نہ کرنے نے لیگ کے مختلف دھڑوں میں ایک وسیع یکجہتی پیدا کردی اور اس کے بعد ان کے رویّوں میں زیادہ سختی آگئی۔

"یہ بات صحیح ہوسکتی ہے۔ میرے چچا کہا کرتے تھے کہ Realpolitik کی دنیا میں پارٹیاں اپنے امکانی حریفوں میں آپس میں تفرقہ ڈالنے اور انھیں کمزور کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کانگریس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس، کانگریس کی بعض ناعاقبت اندیشیوں اور حماقتوں نے لیگ کے وقار میں اضافہ کیا اور اس کے ابھرنے میں مدد کی"۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمھارے چچا ٹھیک تھے"۔ عزیز نے کہا، "مجھے ہیری ہیگ کی اُس وقت کی ایک تحریر یاد آتی ہے۔ اس کے مطابق اگر کانگریس نے coalition کو مان لیا ہوتا تو مسلم لیگ کی یکجہتی کم ہوگئی ہوتی۔ اس کی رائے میں، زرعی اور اقتصادی مسائل میں اختلافات کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ مگر عہدوں پر بیٹھے ہوئے مسلمانوں کو ان معاملات سے متعلق حتمی پالیسیوں کے لیے اپنے آپ کو ذمہ دار بنانا پڑتا۔ انھیں کچھ

مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوتی اور کچھ کی طرف سے مخالفت ہوتی۔ ایک پارٹی کو توڑنے میں عہدے قبول کرانے سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ نہ ہوا ہوتا"۔

"بڑی ذہین رائے ہے"، جگ موہن نے کہا۔

"مگر نہرو نے مصالحت کرنے کی زیادہ مہذب شکلوں کو ہمیشہ کم تر قرار دیا"، پردیپ نے کہا۔

"انھوں نے ایسا کیا مگر کانگریس کی پچھلی عام روش کو دیکھو، 1916 میں اسی مسلم لیگ کے ساتھ اور بعد کو اکالیوں کے ساتھ اس کے تعلقات کو سوچو، ان کانگریس نیتاؤں نے کن اصولوں اور کن آئیڈیلس کی بات کی؟ کیا نہرو نے اس وقت کانگریسی حلقوں میں پھیلے ہوئے اس احساس کا حوالہ نہیں دیا کہ لیگ کے بغیر وہ یوپی کے گورنر کے ساتھ تعلقات کو خود اپنی شرائط پر توڑنے کے لیے زیادہ آزاد ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اس بات کا بھی اضافہ کرنا چاہیے کہ ہندو قوم پرست بھی کانگریس اور لیگ کی دوستی کی توقعات کی ہمت افزائی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ ہندو مہاسبھا نے لکھنؤ پیکٹ کے زمانے سے کانگریس اور لیگ کے اتحاد کی مسلسل مذمت کی تھی۔ اس کے لیڈروں نے، خود اپنے پیروؤں اور ان کے کانگریسی سرپرستوں کی وجہ سے ایک خاصی موثر لابی قائم کر رکھی تھی۔ بی ایس مونجے، مہاسبھا کے معمار نے اعتراف کیا تھا کہ پٹیل اور دائیں بازو کے دوسرے کانگریسیوں نے ان سے ہندو ازم کے مفاد کے متعدد معاملات میں استقامت کے ساتھ جمے رہنے کے لیے کہا تھا۔ جہاں تک 40-1939 میں ہونے والی گفت وشنید کا تعلق ہے پیغام صاف اور واضح تھا۔ ہندو مہاسبھا کے صدر وی ڈی ساورکر پہلے ہی سے ہندو قوم کے نظریے کی تفصیلات تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ آر ایس ایس کے گڑھ ناگپور میں دسمبر 1938 میں انھوں نے ایک بڑا سخت انتباہ کیا تھا کہ ان کی سیاست ہندو سیاست ہوگی، اس کی تشکیل صرف ہندو اصطلاحات سے ہوگی اور اس کی جانچ بھی ان ہی پیمانوں پر ہوگی۔ اور اس طرح ہوگی کہ جو ایک ہندو قوم کے استحکام، اس کی آزادی اور اس کی زندگی کے فروغ و نشو ونما میں معاون ہوگی۔ اس مقصد کے حصول

کے لیے انھوں نے ہندوؤں کو تلقین کی کہ وہ متحد ہوجائیں، اور کانگریس سے جو روز بروز ہندو مخالف ہوتی جارہی ہے، حکومت و اختیار چھین لیں"۔

"جو کچھ تم کہہ رہے ہو، اس سے تو اندازہ یہ ہوتا ہے کہ کانگریس کی صورت حال 'ایک طرف کھائی، ایک طرف کنواں' والی تھی؟"

"تم یہ کہہ سکتے ہو۔ مگر کانگریسی لیڈروں نے مسلمان کارکنوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے یا انھیں تسکین دینے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرقہ وارانہ تناؤ بڑھتا ہی رہا اور فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑنے کا خدشہ بھی بڑھ گیا۔ مسلم مصائب کچھ تو محض تخئیلی تھے مگر کانگریس نے خود اپنے ریکارڈ کو درست کرنے کے لیے کوئی معتدبہ کوشش نہیں کی۔ سیاست کی دنیا میں تصورات کی اہمیت بہت ہوتی ہے۔ اگر مسلم لیگ سیاست کے بازار میں اپنا سامان بیچنے میں کامیاب ہوئی تو ہمیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب کیوں کر ہوئی۔ اسی طرح یہ سوال بھی کرنا چاہیے کہ آخر چوتھی دہائی میں عوامی سطح پر کانگریس کی پیش کشوں کو قبول کرنے والے کافی مسلمان کیوں نہیں تھے؟ کیا کانگریس کا سکہ کم عیار ہو گیا تھا؟ اگر ایسا تھا تو کیوں تھا؟

"مجھے واردھا وڈیا مندر تعلیمی اسکیم اور بندے ماترم کے بارے میں دو سوال اور پوچھنے دو"، پردیپ نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا۔ اس گیت کے بارے میں میں نے بہت سنا ہے مگر خود اس کو سنا نہیں ہے۔

"سوال اچھا ہے، بنکم چندرا چٹرجی نے اسے لکھا اور ٹیگور نے اس کے پہلے بند کی طرز بنائی۔ اور وہی پہلے آدمی تھے جنھوں نے کانگریس کے شروع کے ایک سیشن میں اسے گایا۔ آربندو نے اس کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔

ماں میں تیری بندگی کرتا ہوں
نرمل جل والی تیری ندیاں
پھلوں سے لدی تیری گود

ٹھنڈی اور مہکتی تیری ہوائیں
تیری ہری بھری لہلہاتی کھیتیاں
شکتی مان اور آزاد ماں

تیری ڈھلی چاندنی راتوں کا جادو
ڈالیوں سے لدے تیرے پیڑ، پھولوں سے لدی ڈالیاں
سکھ چین کی داتا ماں
تیری موہک مُسکان، تیرے میٹھے بول
ماں میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں

میں آواز دیتا ہوں تجھے ماں، میری مالک
تو جو محافظ ہے، اٹھ اور ہماری رکشا کر
میں تجھے پکارتا ہوں
جو جل اور تھل سے دشمن کو دور بھگاتی ہے
اور اپنے تمام بندھنوں سے آزاد
تو ہی بدھی ہے اور تو ہی قانون
تو ہی ہماری روح میں اور ہماری سانسوں میں سمائی ہے
تو وہ روحانی طاقت ہے جو
موت کے اس خوف سے بے نیاز کر دیتی ہے

جو ہمارے دلوں پر طاری ہے
تو ہی وہ قوت ہے جو موت پر فتح پاتی ہے
تو ہی حسن ہے تو ہی جمال ہے
ہمارے مندروں کی مقدس ہر مورتی

تیری ہی مورتی ہے
اپنے ان ہاتھوں کے ساتھ جو ضرب لگاتے ہیں
تو ہی درگا ہے
تو ہی ناری ہے تو ہی رانی (آب دار تلواریں)
کمل پر آسن جمائے تو ہی لکشمی ہے
تو ہی صاحبان تخت و تاج کی دیوی ہے
پاکیزہ اور اکمل ہے اور بے مثال
ماں میری بنتی سن
اپنی رواں دواں ندیوں سے مالا مال
پھلوں سے لدے اپنے باغوں سے بھری پُری
سرسبز و شاداب اور بے داغ حسن والی
پاکیزہ روح اور موتیوں سے گُندھے تیرے بال
اور تیری الوہی مسکراہٹ
کرہ ارض کی حسین ترین سرزمین
بھرے ہاتھوں سے دولت لٹاتی ہوئی
ماں میری ماں،
پیاری ماں، میں تیرے سامنے سر جھکاتا ہوں
عظیم ماں، بندھنوں سے آزاد ماں

"اس پر اعتراض کیوں؟" پردیپ نے پوچھا۔ "یہ گیت اگر کچھ ہے تو ایک ہندو گیت ہے جس کا مزاج اور جس کی ساری فضا ہندو ہے۔ اس میں ملک کو ماں دیوی (بھارت ماتا) کے برابر کہا گیا ہے اور یہ خیال یقیناً اسلام کی تعلیمات کے منافی ہے۔ بظاہر گیت میں کوئی مسلم دشمن مواد نہیں ہے پھر وزارت کے زمانے میں یہ شور و غل کاہے کا؟ کیا اس لیے کہ کانگریس نے پہلی دفعہ ہندو علامتیں استعمال کی تھیں؟ عزیز بھائی نے لوگ مانیہ تلک، سودیشی تحریک اور گاندھی جی کے رام راجیہ

جیسی ہندو علامتوں کو استعمال کرنے کا ذکر کیا تھا۔ پنڈت جی نے جو اپنے سیاسی گرو کے اتنے پرستار تھے ان کے مذہب کو سیاست کے ساتھ ملانے پر بے اطمینانی محسوس کی تھی"۔

"چلو بہت دن بعد ہی سہی، پردیپ سمجھداری کی باتیں کر رہے ہیں"، جگ موہن نے کہا۔ "میں ٹیگور کی اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ بندے ماترم سودیشی تحریک کے دوران نہایت مناسب گیت تھا۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ نظم اپنے سیاق و سباق کے ساتھ بحیثیت مجموعی پڑھی جائے تو یہ مسلمانوں کے احساسات کے لیے تکلیف دہ ہوسکتی ہے۔ ٹیگور کا کہنا تھا کہ اس نے اپنی ایک الگ انفرادیت اور ایک ولولہ انگیز اہمیت حاصل کرلی تھی۔ پنڈت جی نے کہا تھا کہ بندے ماترم قومی تحریک کا ایک جزولاینفک تھا"۔

"دیکھو"، عزیز نے وضاحت کی۔ "میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ظاہر ہے کہ مسئلے کو ہر طرف سے سیاسی رنگ دے دیا گیا۔ مجھے جو بات پسند نہیں ہے وہ ہے بنگالی اسکالروں کی طرف سے بنکم کا بے شرم دفاع۔ ساتھ ہی گاندھی جی کے ہندو رجحان کے خلاف عائد کیے جانے والے الزامات کو بھی خاصا بے بنیاد مانتا ہوں۔ مذہبی ہونا ایک بات ہے اور فرقہ پرست ہونا بالکل دوسرا مسئلہ ہے۔ اس فرق کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مذہبیت، میں اصرار کے ساتھ کہتا ہوں، فرقہ پرستی کا سبب نہیں ہوتی گرچہ اسے لوگوں کو اکٹھا کرنے میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ٹھیک ہے گاندھی جی نے ہندو علامتوں کو استعمال کیا۔ انھیں اپنے ہندو حسب نسب پر فخر تھا۔ اس میں غلط بھی کیا ہے؟ ہاں انھوں نے غلطیاں بھی کیں، اور اگر تم چاہو تو یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ چند فاش سیاسی غلطیاں بھی کیں۔ مگر کون ہوگا جو اتنے طویل اور ہنگامہ خیز کیریر میں غلطیوں سے یکسر محفوظ رہے۔ خود گاندھی جی نے کہا تھا:

> "مجھے نہ تو ہندوازم سے کوئی شرم آتی ہے اور نہ اپنے ہندو ہونے پر۔ میں تنگ نظر یا متعصب ہونے سے انکار کرتا ہوں

.... متعصب آدمی کی کوئی بات مجھ میں نہیں ہے
کیونکہ میرا ہندوازم ہمہ گیر ہے۔ یہ نہ تو مسلمان کے خلاف
ہے نہ عیسائی کے۔ نہ میں کسی مذہب کے خلاف۔ یہ مسلمان
دوست اور عیسائی دوست ہے، اور دنیا کے ہر موجود عقیدے
کا احترام کرتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوازم ایک ہی تنے سے
نکلی ہوئی ایک شاخ ہے جس کی جڑیں اور جس کی خوبی کا
اندازہ ہم مختلف شاخوں کی مجموعی قوت اور خوبی سے لگاتے
ہیں۔ اور اگر میں ہندو شاخ کی کہ جس پر میں بیٹھا ہوا ہوں
اور جو میرے وجود کو قائم رکھتی ہے، دیکھ بھال کرتا ہوں تو
یقیناً میں تنے کی دوسری شاخوں کی خبرگیری بھی کررہا ہوتا
ہوں۔ .... اگر خدا مجھے ہندوازم کے اپنے اس نظریے پر
مر مٹنے کا اعزاز بخشتا ہے تو میری موت، سب کی یکجہتی اور
سب کے اتحاد کے لیے اور خود سوراج کے لیے بھی ہوگی"۔

"اصل میں دشواری یہ ہے کہ"، جگ موہن نے اظہار خیال کیا، "گاندھی جی نے مختلف موقعوں پر اتنی مختلف باتیں کیں ہیں کہ بسا اوقات ان کے بیانات کا مطلب سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں وضع داری اور تسلسل ہمیشہ نہیں رہا ہے۔ کیا انھوں نے کانگریس میں فرقہ پرستوں کے خلاف کوئی پختہ اور مستحکم موقف اختیار کیا؟ نہیں، نہیں تو پھر انھوں نے، جیسا کہ آپ نے ہمیں بتایا تھا، لاجپت رائے اور مالویہ کا دفاع کیوں کیا؟ میں جاننا چاہتا ہوں کہ جب دلت ستیہ گرہ اور خلافت تحریک کے زمانے میں مسلمانوں نے ان کی پرستش کی تو پھر انھوں نے مسلمانوں کا اعتماد کیوں کھو دیا؟ یقیناً ایسا نہیں تھا کہ ہر مسلمان قوم کا دشمن اور علاحدگی پسند ہوگیا تھا"۔

"جگ تم ٹھیک کہتے ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 1942 میں باپو نے یہ مانا تھا کہ وہ احترام کی مسند سے نیچے آگئے تھے اور بعض مسلم اخباروں نے اُنھیں اسلام کا

سب سے بڑا دشمن ٹھہرایا تھا۔ مگر پھر بھی انھیں اس بات کا یقین تھا کہ دونوں فرقے ہندستان سے انگریزوں کے رخصت ہونے کے بعد فوراً متحد ہو جائیں گے"۔

"یہ ایک آرزو مندانہ سوچ تھی، تھی نا؟" پردیپ نے رائے ظاہر کی۔ آپ نے واردھا اسکیم کے بارے میں ہمیں ابھی تک کچھ نہیں بتایا"۔

"اس سے پہلے کہ میں اس موضوع پہ آؤں، مجھے تم دونوں نے جو کچھ ابھی تک کہا ہے اس پر اپنا تاثر بیان کرنا چاہیے۔ ہاں، کسی کو یہ سوال کرنا چاہیے کہ بین فرقہ (Inter-community) ہم آہنگی اور مسلمانوں سے دوستی کے جذبات کے اتنے اظہار کے باوجود باپو اہم موقعوں پر انھیں اکٹھا کرنے اور ساتھ لانے میں ناکام کیوں ہوئے، کسی کو یہ سوال کرنا چاہیے کہ اکثر مسلمان بشمول شمالی ہندستان کے روایتی اشراف نہرو کے ساتھ تو زیادہ قربت محسوس کرتے تھے مگر گاندھی جی سے اپنے کو دور رکھتے تھے، آخر کیوں؟" کیا اس کی وجہ ہندوازم میں پیوست ان کا ورلڈ ویو تھا؟ وہ تعلیم یافتہ مسلم طبقے میں اعتماد پیدا نہیں کر سکے؟ بدقسمتی یہ ہے کہ میرے ان سوالوں کے جواب نہیں ہیں۔"

"اگر ایسا ہے تو چلیے ہم لوگ واردھا اسکیم کے بارے میں بات کر لیں"، پردیپ گفتگو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"تعلیم سے متعلق گاندھی جی کے خیالات"، عزیز نے کہا، "1937 میں واردھا ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد ان کے آشرم سے باہر، مختلف ریاستوں میں زیر عمل آئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی اعانت سے تشکیل دیے ہوئے واردھا منصوبے میں جس میں گاندھی جی کے تدریسی طریقے بھی شامل تھے اور جن کو نئی تعلیم کا نام دیا گیا تھا، خاصے نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ اس کے پیچھے سوچ یہ تھی کہ یہ تعلیم ایک زندہ اور حیات بخش تعلیم ہوگی۔ انھوں نے 13 جنوری 1938 کے ہریجن میں لکھا کہ اسکول ورکشاپ میں تبدیل ہوں گے جہاں قومی نصب العین کے مطابق ایک صحت مند زندگی کے لیے ضروری باتیں طالب علم سیکھیں گے۔ واردھا کے ٹریننگ اسکول

(واردھا اسکیم اور روی شنکر شُکلا کے ودّیا مندر اسکیم کے اشتراک سے ہندستانی تعلیمی سنگھ کی زیرِنگرانی چلنے والا ایک ادارہ) کی مکمل حمایت کرتے ہوئے گاندھی جی نے 30 اپریل 1938 کے ہریجن میں لکھا کہ ہٹلر اپنے مقاصد کو تلوار کے ذریعے حاصل کررہا تھا اور وہ اپنے نصب العین کو روح کے ذریعے حاصل کررہے ہیں۔ وہ اپنے پڑھنے والوں سے چاہتے ہیں کہ وہ بدیسی خیالات و نظریات کے لبادے کو اتار پھینکیں اور اپنے آپ کو اپنے گاؤوں سے مانوس اور وابستہ کریں۔ انھوں نے لکھا کہ مغربی دنیا ہندستانیوں کو تخریبی علم دے رہی ہے، ان کا اپنا مشن عدم تشدد کے وسیلے سے تعمیری علم کا فروغ ہے"۔

"یہ تو مخصوص مسائل ہیں۔ وزارتوں کے خلاف شکایتوں کا جو ایک سلسلہ ہے اس پر آپ کا کیا ردِّعمل ہے؟"

"کچھ شکایتیں تو صحیح لگتی ہیں"، عزیز نے جواب دیا، "مگر اکثر بے بنیاد معلوم ہوتی ہیں"۔

گورنر یوپی کا خیال تھا کہ صوبائی خودمختاری کی کارگزاری فرقہ وارانہ مسائل میں خاصی اچھی رہی ہے اور رورل ڈیولپمنٹ جیسی اس کی بعض پالیسیوں نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ہمارے صوبے میں سرکاری نوکریوں میں ان کا معتدبہ حصہ رہا، جیسے پراونشل ایگزیکٹیو سروس میں 39.6 فی صدی، 25 فی صدی جوڈیشیل سروس میں، زرعی سروس میں درجہ اوّل کی اسامیوں پر 24 فی صد۔ سی پی، بہار اور بمبئی میں بھی صورت حال کچھ بہت مختلف نہیں تھی۔ مدراس پریسیڈنسی میں 58 سالہ چکرورتی راج گوپال اچاری کی سربراہی میں وزارت نے تعلیمی اور سماجی اعتبار سے پس ماندہ ذاتوں اور فرقوں کو رعایتیں دیں۔ سی پی حکومت نے مسلمان لڑکوں کے لیے ودّیا مندر کی طرح کے اردو اسکولوں کو چلانے میں مالی اعانت کے لیے مسلمان چندہ دینے والوں کو اجازت دی اور انھیں سرکاری امداد بھی دی۔ بمبئی کی وزارت نے جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اس کے وائس چانسلر ذاکر حسین کی تجویز کی ہوئی درسی کتابوں کو واپس لے لیا"۔

"اس صورت حال کے پیشِ نظر لیگ کی پروپیگنڈہ مشین کی کامیابی کے اسباب کیا تھے؟، قطع کلام معاف، اس وقت مسلمانوں کی آبادی کیا تھی"۔

1941 کی مردم شماری کی رو سے مسلمانوں کی تعداد 92 ملین یعنی 289 بلین کی آبادی کی 24 فی صدی کے لگ بھگ تھی۔ جہاں تک لیگ کے پروپیگنڈے کا تعلق ہے دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ پہلی- عام سیاسی نکتہ چینی حزب اختلاف کی کل کائنات تھی۔ لہذا یوپی میں لستان (بولنے والے) مسلم گروپوں نے پنت وزارت پر صرف اس لیے اعتراض کیا کہ انھیں مساوی اثر و رسوخ حاصل نہیں تھا۔ مختصر یہ ہے کہ ان کی شکایت مذہبی نہیں تھی اگرچہ اس نے جلدی ہی یہ رنگ اختیار کرلیا۔ دوسری - مسلمان زمین داروں کے چلن سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ طبقاتی مسائل نے کس طرح بگڑ کر مذہبی منقاشوں کا روپ دھار لیا۔ اور کس طرح خصوصی مفادات عوامی بن کرساری کمیونٹی کے مفاد بن گئے۔ اس طرح اودھ کے تعلقداروں اور مشرقی اور مغربی یوپی کے زمین داروں نے، کانگریس کے زرعی پروگرام بشمول یوپی ٹیننسی بلِ کی مذمت کے لیے اسلام کا ہوا کھڑا کیا۔ یہ سب انھوں نے اچھی طرح یہ جانتے ہوئے کیا کہ برسر اقتدار جماعت زمینی اصلاحات کی پابند ہے اور یہ کہ "بلِ" کا جسے رفیع صاحب نے پیش کیا تھا، ہدف استحصال کرنے والا ایک طبقہ تھا نہ کہ عام مسلمان زمین دار، مسلمان زمین بلِ کے ہدف بحیثیت مسلمان نہیں بلکہ زمینی اصلاحات کے مخالفین کی حیثیت سے تھے۔ اسی طرح بمبئی شہر میں، شہری پراپرٹی رکھنے والوں پر پراپرٹی ٹکس عائد کیے جانے کو بھی ایک مسلمان مخالف اقدام تصور کیا گیا۔

"کیوں؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"اس بنیاد پر کہ مسلمان اپنا اندوختہ اسٹاک مارکٹ اور شیئرز کی بجائے جائداد میں زیادہ لگاتے ہیں اور یہ کہ ان کے پاس وافر تعداد میں مذہبی اوقاف ہیں"۔

جگ موہن کو ذرا حیرت تھی۔ "اعتراض میں غلط کیا ہے؟"

"یہ ایک فروعی مسئلہ تھا۔ لیگ کے ڈھنڈورچی منسٹری کے ہر کام پر اس لیے بدترین رائیں ظاہر کرتے تھے کیونکہ ان کی پارٹی میں کسی کو بھی کابینہ میں کوئی

جگہ نہیں ملی تھی"۔

"مگر آپ"، جگ موہن اپنے سوال پر مصر رہا، "اس سے تو انکار نہیں کرسکتے کہ ان میں سے بعض شکایتوں میں کچھ صداقت تو تھی، انکار کرسکتے ہیں؟"

"نہیں انکار نہیں کیا جاسکتا"، عزیز نے جواب دیا۔ "سچ بات یہ ہے کہ ہمیں مسلمانوں کی شکایتوں کو سمجھنا چاہیے اور اس بات کو تسلیم کرنا چاہیے کہ انھیں کسی استدلال کے ذریعے دور کرنا منسٹری کے لیے انتہائی دشوار تھا۔ دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ کانگریس کے ڈھائی سالہ عہد حکومت کے بعد مسلمان لیڈروں میں اقلیتوں پر کی جانے والی مفروضہ زیادتیوں کے واقعات سے شدید تلخی پیدا ہوگئی تھی۔ دوسرے یہ کہ اسی کے ساتھ وہ خود اپنی حیثیت کو اس سے پہلے کہ مزید خراب ہو بہتر کرنا چاہتے تھے۔ نتیجہ یقیناً لیگ کے استحکام اور اس کے مطالبات کی قطعیت میں نکلا۔

بحث میں جگ موہن کی دلچسپی بتدریج بڑھتی جارہی تھی۔ "مطالبات کیا تھے؟ ابھی تک آپ نے ہمیں لکھنؤ پیکٹ، مارچ 1927 کی دہلی تجاویز اور دسمبر 1928 کے نیشنل کنونشن میں جناح کی تجاویز کے بارے میں بتایا ہے"۔

ارے مطالبات تھے، (الف) آئندہ آئینی انتظامات کمیونٹیز کی بنیاد پر ہوں، (ب) مسلمانوں کے ساتھ سلوک بالکل ہندوؤں جیسا ہو، (ج) بغیر لیگ کے مشورے کے کوئی معاہدہ نہ ہو۔ پارٹیوں کے بجائے کمیونٹیز پر اپنے مطالبات کی بنیاد رکھ کر لیگ نے کانگریس کے دعووں پر مہاسبھا کے اعتراضات اور شیڈولڈ کاسٹ کی اپنے ساتھ امتیازی سلوک کی خواہشوں کا فائدہ اٹھایا۔ مسلمانوں کے ایک وطن کے خدوخال کی تعیین کی طرف یہ پہلا واضح قدم تھا اگرچہ محض آزمائشی۔ لیگ کے کارکنوں کا کہنا تھا کہ یہ 1937-39 میں کانگریس کی بدانتظامیوں اور بدعملیوں کا ثمرہ تھا۔ ان کی کامیابی جس کا سہرا انھوں نے علی الاعلان اپنے سر باندھا تھا، اپنے حمایتیوں میں اسے مقبول کرانا اور کانگریس کے خلاف ایک فضا تیار کرنا بھی"۔

پردیپ اصلی بحث اور خط و کتابت کی نوعیت کو جاننا چاہتا تھا، اس لیے اس

نے عزیز سے مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈروں کے بیانات اور ان کے خطوط کے اقتباسات سنانے کی درخواست کی۔ عزیز اس توقع کے ساتھ بخوشی راضی ہوگئے کہ انھیں بہت وضاحت نہیں کرنا پڑے گی۔ انھیں یہ بھی امید تھی کہ خطوط اختلافات کو ایک تناظر کے ساتھ پیش کردیں گے"۔

عزیز نے اگلے اتوار کی ساری صبح اپنے دارالمطالعہ کو ٹھیک کرنے اور اس کی بدانتظامی اور بے ترتیبی کو بہتر کرنے میں صرف کی۔ اس کام کے دوران اسے بعض چھپے ہوئے خطوط کی فوٹو کاپیاں ہاتھ آئیں جو اس نے لائبریری سے حاصل کی تھیں۔ مسکراتے ہوئے اس نے انھیں اپنے کتھئی رنگ کے بیگ میں رکھا اور پھر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گیا۔ چار بجے وہ اپنے دوستوں سے ملنے اور ایک اور طویل نشست کے لیے نکل پڑا۔

پردیپ اور جگ موہن نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا اور دونوں اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ عزیز نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کاغذات نکالے۔ اس نے پہلے ہی صفحے سے پڑھنا شروع کردیا۔ یہ دو قومی نظریے پر گاندھی جی کا بیان تھا جس میں انھوں نے اِسے غلط اور خلاف واقعہ بتایا تھا۔ مسلمانوں کی بڑی اکثریت تبدیل مذہب کرکے اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کی خلف تھی۔ تبدیل مذہب کرتے ہی وہ کوئی علاحدہ قوم نہیں ہوگئے۔ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں نہیں تھیں۔ جنھیں خدا نے ایک بنایا ہے، انسان انھیں کبھی الگ نہیں کرسکتا ہے۔ مجوزہ تقسیم پر اگر ہندستان کے مسلمانوں نے اصرار کیا تو عدم تشدد پر ایمان رکھنے والا ہونے کی وجہ سے وہ زبردستی اسے روکنا نہیں چاہیں گے۔ وہ بہرحال اس تقسیم کی خوشی سے حمایت نہیں کریں گے۔ اور درحقیقت وہ اسے روکنے کے لیے ہر غیرمتشدد طریقہ استعمال کریں گے۔ تقسیم کا، انھوں نے کہا، مطلب ایک قوم کی حیثیت سے ساتھ رہنے کی لاتعداد ہندوؤں اور مسلمانوں کی صدیوں کی ریاضت کی تباہی ہے۔ یہ مطالبہ ایک خلاف واقعہ بات کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہندوازم اور اسلام دو معاند تہذیبوں اور مختلف نظریات کی نمائندگی کرتے ہیں، اس خیال سے ان کی روح بغاوت کرتی ہے۔ ایسے کسی

نظریے کی تائید مہاتما کے لیے خدا سے انکار کے مترادف تھی۔

دوسرا بیان کرپس مشن سے متعلق تھا۔ 1942 میں گاندھی جی نے اعلان کیا کہ اگر مسلمانوں کی بڑی اکثریت اپنے آپ کو ایک ایسی الگ قوم سمجھتی ہے جس کا ہندوؤں اور دوسرے لوگوں کے ساتھ نہ کسی قسم کا کوئی رشتہ ہے اور نہ کوئی تعلق تو پھر دنیا میں کوئی طاقت نہیں ہے جو انھیں اس کے برخلاف کسی بات کا یقین دلا سکے۔ اگر وہ اسی بنیاد پر ہندستان کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں تو انھیں تقسیم ملنا چاہیے۔ سوائے اس کے کہ ہندو کسی ایسے بٹوارے کے خلاف لڑنا چاہے۔ جہاں تک وہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں، ایسی تیاریاں فریقین میں خاموشی کے ساتھ چل رہی ہیں، یہ صورت حال، انھوں نے کہا، خودکشی ہے۔

اب ان خیالات کا موازنہ پنڈت جی کے خیالات سے کیجیے۔ 14 جولائی 1945 کو وائسرائے نے درج کیا تھا کہ نہرو کا خیال تھا کہ جناح کا اثر اور ان کی ضد کانگریس اور اس کے پروپگنڈے سے عام مسلمانوں میں پھیلے ہوئے ایک حقیقی خوف کی بناء پر ہے۔ نہرو کا عقیدہ تھا کہ کانگریس حکومتوں کی جانب سے مسلمانوں کے ساتھ برا سلوک نہیں ہوا ہے مگر انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ بعض کانگریسی ہندو، مسلمان مخالف تھے۔ اور یہ کہ نفسیاتی عوامل اہمیت کے حامل تھے۔ نہرو کے بیان کی اصل یہ تھی کہ کانگریس ایک جدید nationalistic نقطہ نظر کی نمائندگی کرتی ہے اور مسلم لیگ ایک محدود، تنگ نظر قرون وسطیٰ کے تصور کی نمائندہ ہے اور حصول آزادی کے بعد دراڑ بالآخر غریب اور امیر کے درمیان کسان اور زمیندار کے مابین اور مزدور اور مالک کے بیچ ہوگی۔

جناح نے فوراً ہی اس نقطہ نظر کی تردید کی۔ 27 جون 1946 کو انھوں نے کانگریس کے اس دعوے کی کہ وہ ہندستان کی نمائندگی کرتی ہے اور اس کا ایک قومی کردار ہے، تردید کی۔ ان کے خیال میں کانگریس ایک ہندو تنظیم تھی اور وہ بھی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی۔ وہ کسی دوسری کمیونٹی کی نمائندگی نہیں کرتی تھی اور مسلمانوں

کی نمائندگی تو یقیناً نہیں کرتی تھی اور یہ حقیقت ہے کہ اس کے ساتھ نمائش کے لیے مٹھی بھر وفادار مسلمان تھے، کانگریس کو ایک قومی کردار رکھنے اور ہندستان کی نمائندگی کرنے کا حق نہیں عطا کرتی تھی۔ کانگریس کو مسلمانوں کی طرف سے بولنے یا ان کی نمائندگی کا دم بھرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اور ایک عارضی حکومت کے قیام کی کیبنٹ مشن کی تجاویز کو منظور کرنے سے ان کے انکار کے پیچھے شرارت آمیز محرکات تھے۔

دسمبر 1941 میں ناگپور میں جناح کی تقریر میں پنہاں طنز کو مسلمان سامعین سمجھنے سے قاصر نہیں رہے۔

"پانچ سال قبل یہ ابتری تھی، دس سال قبل تم مردہ تھے .... مسلم لیگ نے تمھیں مقصد عطا کیا جو میرے خیال میں تم کو اس موعودہ سرزمین تک پہنچائے گا جہاں ہم اپنا پاکستان بنائیں گے۔ لوگ جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، جس طرح باتیں کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے کہ جو آخر میں ہنستا ہے اُسی کی مسرّت سب سے اچھی اور حقیقی ہوتی ہے"۔

عزیز جناح کی یہ تقریر ابھی پڑھ ہی رہا تھا کہ آل انڈیا ریڈیو کے اناؤنسر کی آواز اس کے کانوں میں آئی ۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پردیپ اپنی کرسی سے کھڑا ہوا، اپنے مرفی ریڈیو کی طرف بڑھا۔ اس توقع کے ساتھ کہ کہیں سے خبریں ہورہی ہوں گی اس نے سوئی کو اِدھر اُدھر گھمایا کہ اسی لمحے کسی نوجوان لڑکی کی آواز اس کے کانوں میں آئی جو اسی نظم کا یہ مصرعہ گارہی تھی ۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

وہ غور سے سنتے رہے۔ ایک دوسرے سے الگ ہونے سے پہلے جگ موہن

نے اس شام اپنی آخری بات کہنے کا فیصلہ کیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

☆☆☆☆☆

آٹھواں باب

اَج اَنکھاں وارث شاہ نوں کِتوں قبراں وِچّوں بول
اَج کتابِ عشق دا اِک اگلا ورقا کھول
اِک روئی سی دھی پنجاب دی تو لِکھ لِکھ مارے وین
اَج لکھاں دِھیاں رُوندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہین
اَج کتابِ عشق دا اِک اگلا ورقا کھول

(امرتا پریتم)

یہ سنیچر کی صبح تھی۔ پردیپ اور جگ موہن مے فیر (Mayfair) سنیما میں ایک کامیڈی فلم سے لطف اندوز ہورہے تھے، ادھر عزیز آرکائیوز میں کام کررہا تھا۔ اسے اس بات کا صحیح پتہ نہیں تھا کہ گرد آلود الماریوں سے بھرے ہوئے اس کمرے میں کیا چیز اسے کھینچ لائی ہے یا یہ کوئی خود عائد کردہ پرانسچت یا عقوبت نفس ہے۔ وہ کام کرتا رہا۔ سورج بھان کی مستعدی اور حسن کارکردگی کا شکریہ کہ وہ مجھے چھے چھے فائلوں کے پُلندے ریسرچ روم میں پہنچاتا رہا۔ کمرہ ویران اور بے روح تھا۔ پاس کا نابدان آرام سے پلنے والے مچھروں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے شکایت کیوں ہو؟ لکھنؤ شہر طرب تھا، یہاں کی مسرتوں کو لوٹنے کا حق سب ہی کو ہے، مچھروں کو بھی۔

اس دن کمرہ اس کے اکیلے کے قبضے میں تھا، کوئی دوسرا ریسرچ اسکالر آیا نہیں تھا۔ کسی نے بھی نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ کئی مہینوں بعد وہ مانوس ہوا، اور مطمئن۔ پائپ پینے میں بھی مزہ آنے لگا۔ چائے کے لیے اس نے سورج بھان کو ساتھ لیا اور ساتھ کے ایک ڈھابے میں جا بیٹھا۔ چائے پر اس نے سورج بھان سے آرکائیوز کا حال پوچھا۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ سورج بھان نے چائے

کے ساتھ نہایت اطمینان سے سموسے بھی کھائے، اور جلیبیاں بھی۔ ان سے فارغ ہونے کے بعد اپنی بیڑی سلگائی اور اس کے کش لیتے ہوئے اس نے کملاپتی ترپاٹھی، سی پی گپتا اور سمپورنانند کی اچھائیوں اور برائیوں پر تقریر کی۔

سورج بھان ایک بھاری بھرکم فائل لایا جو پرانی ڈوریوں سے بندھا ہوا تھا۔ عزیز فائل کو چار نمبر کی اپنی میز پر لایا۔ ڈوری کی گرہوں کو کھولنے میں بہت دشواری ہوئی مگر بہرحال وہ کھل گئیں۔ اس نے اسے کھولا۔ کچھ بہت زیادہ نفاست سے نہ لکھی ہوئی تحریر کو پڑھا، 'پارٹیشن' اس نے بڑی بے چینی سے صفحے پلٹنے شروع کیے۔ مواد 'ہندستان کی تقسیم' سے متعلق تھا۔ پونے پانچ بجے اس نے فائل کو الماری میں مُقفل کیا اور اوپر منھ ہاتھ دھونے چلا گیا۔ اگلے دو مہینوں تک اس کا یہی معمول رہا۔

اب جب وہ پردیپ اور جگ موہن سے ملا تو اسے پارٹیشن کے موضوع پر بات کرنے میں اپنے اوپر بہت اعتماد تھا۔ مگر اب وہ اس یک طرفہ گفتگو کو مزید طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ موتی نگر سے گزرتے ہوئے جہاں نہرو نے 1936 میں لکھنؤ کانگریس کی صدارت کی تھی، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ بھی اب کافی طویل ہوچکی ہے۔ اور کافی کافی ہوتا ہے۔ اُس کی اس مصروفیت نے اس کی گھریلو زندگی کو اتھل پتھل کر دیا تھا، طلعت بھی دہلی جانے اور جامعہ ملیہ میں ٹیچرس ٹریننگ کالج جوائن کرنے کی دھمکی دے چکی تھی۔

"اُس عہد کے دو تاثرات میں تم لوگوں کے سامنے رکھوں"۔ اس نے بات شروع کی۔ "جب ہندو مسلم تعلقات انتہائی نیچی سطح پر پہنچ گئے تھے۔ پہلا تاثر، پنجاب میں کئی برس تک ایک سول سرونٹ کی حیثیت سے کام کرنے والے میلکم ڈارلنگ کا ہے۔ 1945-46 میں اپنی سیاحت کے دوران بیاس اور ستلج اور چناب اور راوی دریاؤں کے درمیان کے علاقوں میں اس نے ہندو اور مسلمان فرقوں میں بڑی مماثلت پائی۔ اس نے دیکھا کہ کس طرح گاؤں میں ہندو، مسلمان اور سکھوں کے اسلاف مشترک تھے، کس طرح کرنال کے ایک ہندو نے نہایت فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ قرب و جوار کے پچاس گاؤں کے مسلمان اس کی برادری کے تھے اور پھر ہندو ہونے کے لیے

تیار تھے شرط صرف یہ تھی کہ ہندو اپنی لڑکیوں کی شادی ان کے ساتھ کریں گے۔ اگرچہ یہ شرط مانی نہیں گئی مگر علاقے کے ہندو اور مسلمان شادی بیاہ کے موقعوں پر باہمی خلق و محبت اور شائستگی و تہذیب کے تمام تقاضے پورے کرتے تھے۔ مُلا یا برہمن کو تقریبات میں حصہ لینے کے لیے مدعو کیا جاتا تھا۔ میلکم ڈارلنگ کو حیرت تھی کہ ایسی صورت حالات میں پاکستان کس طرح برمحل اور مناسب سمجھا گیا۔

جامعہ ملیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مجیب کو ایک ایسا تجربہ بہار میں ہوا۔ دریائے گنگا کے کنارے ایک صوفی کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ درگاہ میں رہنے والے مسلمانوں نے جگہ چھوڑ دی تھی۔ بہرحال جلدی ہی ہندو عورتوں کا ایک غول آیا اور انھوں نے وہی ساری رسوم ادا کیں جو ان کے اجداد نسل در نسل ادا کرتے چلے آرہے تھے۔ مجیب کو ایسا لگا جیسے ایک مسلم صوفی کے احترام و عقیدت کے ان کے جذبات و احساسات پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔

ان بیانات میں کیا میں فلپس ٹیلبوٹ کی رائے کا اضافہ کرسکتا ہوں۔ میں اس کا پس منظر نہیں جانتا، عارف نے مجھے بتایا تھا کہ ٹیلبوٹ نے علی گڑھ میں پڑھا تھا، نیویارک میں انسٹی ٹیوٹ آف کرنٹ ورلڈ افیئرز کے لیے لکھتا رہتا تھا۔

"ٹھیک ہے تم بات بتاؤ"، جگ موہن نے بے صبری کے ساتھ کہا۔

"آزادی کے جشن کے دوران سارے ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین دوستی اور محبت کے جذبات دیکھ کر اسے حیرت تھی۔ تعلقات کی اس غیر معمولی خوشگواری کے بارے میں اس کی رائے یہ تھی کہ لوگوں نے ہر جگہ ان تقریبات کو فرقہ وارانہ حملوں اور جوابی حملوں کے چکر کو توڑنے کے لیے استعمال کیا تھا"۔

"تو بات کیا ہے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

پردیپ کی طرف سے عزیز نے جواب دیا۔

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ایسے تاثرات کو محسوس کیا جانا چاہیے اور ماضی کے بارے میں رائے ہمارے تجربے میں آئے ہوئے حالیہ ہندو

مسلم تشدد کی بنیاد پر قائم نہیں کی جانا چاہیے۔ میں اپنے طالب علموں کو بتاتا ہوں کہ وہ اپنے تعصبات کو ختم کریں اور خاندان اور دوستوں سے سنے ہوئے قصّوں اور کہانیوں کو اپنا رہنما نہ بنائیں۔ قوم پرستی کا پیغام لوگوں تک پہنچنے میں وقت لیتا ہے، فرقہ پرستی کا زہر جلدی پھیلتا ہے اور نہایت سرعت کے ساتھ لوگوں کو متاثر کرلیتا ہے۔ زیادہ سادہ لوح افراد حماقت آمیز باتوں پر، وہ چاہے جہاں سے آئی ہوں ایمان لے آتے ہیں۔ میں اپنے پی ایچ ڈی کے طالب علموں سے کہتا ہوں کہ وہ ایک سیاسی مسلم تشخص کے ارتقا کو عقیدوں اور اصولوں کی اصطلاحات میں نہیں بلکہ کلونیل پالیسیوں اور ہندوتوا اور اسلامائزیشن کے فروغ میں ڈھونڈیں"۔

"اس نکتے پر آپ کو پھر آنا چاہیے"، پردیپ نے تجویز پیش کی۔

"یقیناً۔ لیکن مجھے اس بات کا اضافہ کرنے دو کہ اسلام کو حوالے کے ایک منجمد نکتے کی طرح استعمال نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاصر اسکالرشپ (علمیت) نے زمانے کے ساتھ بدلتی ہوئی تاویلات اور توانا کثرت وجودی (pluralist) تصورات جنھوں نے ہندستان اور دوسری جگہوں پر مسلم (اسلامی نہیں) کمیونٹیز کی صورت گری کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ بے شک، مؤرخین نے تصورات کے ایک ذخیرے کی نشاندہی کی ہے جو مسلم ممالک میں سیاسی، سماجی اور دانش ورانہ تحریکوں کے ایک وسیع تنوع کی وضاحت اور توثیق کرنے میں استعمال کیے گئے ہیں"۔

"لیکن"، پردیپ بول پڑا، "مسلم علماء دین اور مسلمانوں کے ترجمان ایک واحد اور غیرمنفک شناخت کی موجودگی کی بات کرتے ہیں"۔

"انھیں کرنے دو"، عزیز نے کہا، "عمومی طور پر اگر بات کی جائے تو جنوبی ایشیا کی تاریخ اور سیاست میں شناختیں شاذ ہی یک رنگ اور متحدہ رہی ہیں۔ مختلف ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے، باہمی طور پر معاند مقامات، بیانات اور طور طریقوں پر تعمیر شدہ یہ شناختیں ایک بنیادی تاریخیت (historicization) کی تابع رہی ہیں اور بنے

اور بگڑنے کے ایک مسلسل عمل سے گزرتی رہی ہیں۔ اسی لیے ہم ہندو مسلم عوام کی روزمرہ زندگی کی تہذیب پر مبنی وجودی تجربات (Existential Experiences) پر توجہ مبذول کرتے ہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ مختلف مقامات پر یہ شناخت پیشے، سماجی مرتبے (class) اور ایک شہر کی روایات پر مبنی تھی۔ کوئی مثال اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے مگر میں ایک ہندو ناول نگار کی تحریر سے بہت متاثر ہوا جو اس نے بنارس کے بنکروں کے فرقے کے بارے میں لکھی تھی"۔

"وہ تحریر کیا تھی؟" پردیپ نے تجسس کا اظہار کیا۔

لکھنے والا کہتا ہے کہ ایک کیمونٹی دنیا کی ہے۔ ایک کیمونٹی ہندستان کی ہے۔ ایک کیمونٹی ہندوؤں کی ہے، ایک کیمونٹی مسلمانوں کی ہے۔ ایسے ہی بنارس میں ایک کیمونٹی بنکروں کی ہے۔ یہ کیمونٹی بہت سے مختلف طریقوں سے دنیا میں دوسری کیمونیٹیز سے مختلف ہے۔

"میں اس سے اتفاق کرتا ہوں"، پردیپ نے کہا۔

"حالیہ تحقیقات و مطالعات نے اعلیٰ یا راسخ العقیدہ اسلامی روایات کے ساتھ اور بنارس کے مسلمان بنکروں کی طرح خالص ہندو دیوی دیوتاؤں سے متعلق تقریبات میں شرکت کے ساتھ ہندو اور مسلمان لوک عبادتوں میں آمیزش کا انکشاف کیا ہے۔

"آپ نے اس سے پہلے ذکر کیا تھا نا" پردیپ نے عزیز کو یاد دلایا، "کہ 1921 کی مردم شماری کی رپورٹ میں یہ تاثر ملتا تھا کہ اسلام کی شدت عوام تک نہیں پہنچی تھی جو اپنے ہندو پڑوسیوں کے ساتھ امن و سکون کے ساتھ رہتے تھے"۔

"یقیناً میں نے ذکر کیا تھا"، عزیز نے اتفاق کرتے ہوئے کہا، تمھارے حافظے کو سلام۔

اس سلام کے بعد دوست اٹھ کھڑے ہوئے، گفتگو ختم ہوئی۔ وہاں سے چلتے وقت اگرچہ انھوں نے ایک دوسرے سے اپنے خیالات کا کوئی اظہار نہیں کیا تھا مگر سب کچھ متفکر سے لگتے تھے۔ ایک دو ہفتوں میں جب عزیز اپنی گفتگو ختم کردیں گے

تو پھر کیا ہوگا؟ ان کی محفلوں کا، رات گئے، ملاقاتوں کا کباب اور پراٹھوں کا کیا ہوگا؟ دوسری طرف ان کے اہل خاندان خوش ہوں گے۔ خصوصاً طلعت کو بڑی مسرت ہوگی۔ وہ عزیز کے رات گئے آنے اور سیدھے بستر پر دراز ہوجانے سے بہت تنگ آچکی تھی۔ اس کے پاس بیوی بچوں کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔ جگ موہن کی بیوی نیلم حرف شکایت زبان پر کبھی نہیں لائی مگر دل میں شکوے پال رہی تھی، وہ اپنی پریشانیوں کا ذکر دہلی میں اپنی سب سے اچھی دوست عابدہ سے کرتی رہتی تھی۔ عابدہ کے میاں تجمل نے جگ موہن کے ساتھ ایک ہی یونیورسٹی میں پڑھا تھا۔ وہ ایک اچھا جرنلسٹ تھا۔ وہ ایک خلیق اور مہذب آدمی تھا۔ بدقسمتی سے اس کی موت ایران میں، تہران کے مقام پر ایک افسوسناک حادثے مں ہوگئی۔ اس کی موت نے سارے خاندان کو بڑی چوٹ پہنچائی، سارے دوستوں کو بھی شدید صدمہ تھا۔ جگ موہن نے تجمل کی قبر کا نقشہ بنایا اور اس کی قبر بنوائی۔ واپس ہوتے ہوئے، راستے میں اس کو تجمل کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار دن یاد آئے، اسے اُس کے خاندان کا خیال آیا، عابدہ، شاذ اور شہزاد جنھوں نے اس عظیم حادثے کو بڑی ہمت اور صبر و تحمل سے برداشت کیا تھا۔

"یارو"، طلعت گھر چھوڑ کر جانے کی دھمکی دے رہی ہے"، رام ایڈوانی کی کتابوں کی دکان پر ایک خوبصورت صبح کو اس کی دوستوں سے ملاقات ہوئی تو اس نے مذاقیہ انداز میں اعلان کیا۔

"بیویاں ایسا کبھی کرتی نہیں ہیں"، پردیپ کا کھرا ردّعمل تھا۔

جگ موہن نے موضوع بدلا۔ وہ گفتگو میں نیلم کا نام نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔

"عزیز اچھے موڈ میں تھا۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں ریسرچ کرنے کے لیے برٹش کاؤنسل کی گرانٹ اسے مل گئی تھی۔ اس وقت وہ بڑے جوش و خروش میں تھا۔ اپنی کامیابیوں پر اسے فخر تو یقیناً تھا مگر شیخی نہیں۔ اس نے اپنے دوستوں کو یہ

خوش خبری سنائی اور اپنے پسندیدہ شاعر غالبؔ کا یہ شعر پڑھا۔

ہوئی مدت کہ غالبؔ مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا؟

چند لمحوں بعد پردیپ نے کہا، "تم نے نیشنلزم کے نظریات کے روایتی طور پر دو اہم کیٹیگریز میں تقسیم ہونے کی بات کی تھی۔ Instrumentalist اور Primordialist ۔

"ہاں میں نے کی تھی — اوّل الذکر نیشنلزم کو اشرافیہ کی جوڑ توڑ کی پیداوار قرار دیتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ قومیں اگر ایجاد نہیں کی جاسکتی ہیں تو جعل کر کے بنائی جاسکتی ہیں۔ دوسری کٹیگری کے وکیل نیشنلزم کو نیشن ہڈ کے فطرت کے ودیعت کیے ہوئے ایک احساس سے پیدا ہونے والے ایک جبلی عمل کی طرح دیکھتے ہیں"۔

یہ مناسب اور مفید مطلب کیسے ہے؟" پردیپ نے جاننا چاہا۔

"بس اس طرح کہ اس مباحثے میں ہندستان کی تقسیم کی صحیح یافت ایک دشوار کام ہے"۔

پردیپ کچھ confused نظر آیا، "یہ تو ہم جانتے ہیں، مگر ہم جا کدھر رہے ہیں؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں متعدد اور متنوع تناظروں پر مطمئن ہونا پڑے گا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ پاکستان کی تخلیق کو سر پر منڈلاتی ہوئی اور ایک ایسی حقیقت کی طرح دیکھا جارہا تھا کہ جس سے مفر نہیں تھا۔ پھر اشوک مہتا اور اچوت پٹور دھن جیسے رائٹرز فرقہ پرستی کی آگ کو بھڑکانے میں حکومت کے حصے کی طرف توجہ مبذول کرا رہے تھے۔ اور آخر میں وہ لوگ ہیں جن کا رخ اور جن کا رجحان مسلم کیونیٹیز سے متعلق تحقیقات کے بارے میں سارے کا سارا کج اور مسخ شدہ ہے"۔

پردیپ مطمئن نہیں تھا، "دشواری کیا ہے؟"

"دشواری؟" عزیز نے جواب دیا، "دشواری ہوتی ہے اس روایتی چوکٹھے کی

وجہ سے جس میں مسلمانوں کو، ایک مشترک عالمی نقطہ نظر، ایک مشترکہ زاویہ نگاہ اور اسلام کے اساسی اصولوں کے مطابق شعور کے ایک ڈھانچے کے ساتھ ایک الگ اور مختص کٹیگری میں رکھا جاتا ہے۔ تمدن اور نظریے (عقیدہ) کی تحلیلی فوقیت پر زور دینا، اسلام کو ایک برتر حیثیت تفویض کرنا اور ایک ہم آہنگ کمیونٹی کی شبیہہ میں پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ آیئے ہم مسلم کمیونٹیز کے پرت دار اور ممیز کردار کے بارے میں بات کریں"۔

عزیز اپنے جملے کو مرتب کرنے کی کوشش میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ جگ موہن نے زیرلب تبسم کے ساتھ کہا، "کوئی بات نہیں، آپ اس کے بارے میں پہلے بھی بات کرچکے ہیں نا؟"

"ہاں میں بات کرچکا ہوں مگر اس موضوع پر مزید وضاحت کی ضرورت ہے کیونکہ ہر شخص سمجھتا ہے کہ پارٹیشن اور دو قومی نظریے کی جڑیں تیسری اور ابتدائی چوتھی دہائی میں نہیں بلکہ انیسویں صدی کی علاحدگی پسندانہ روایت، علی گڑھ کی جدیدیت اور اس کے ترجمان سید احمد میں ہیں"۔

"بات سمجھ میں آگئی"، جگ موہن نے اتفاق کیا۔

"گڈ! پارٹیشن سے متعلق مطالعات میں جو چیز سُقم اور دشواری پیدا کرتی ہے وہ ہے ماضی کے قومی لیڈروں کے دلیرانہ کارناموں میں غلو کرنے اور قومی منصوبے کی بنیاد کی حیثیت سے اسے ایک جواز عطا کرنے والا تاریخی تناظر فراہم کرنے کا رجحان۔ اسی لیے بعض پاکستانی اسکالروں کے یہاں جناح سے موازنے کے لیے Saladin کو ایک استعارے، ایک ثقافتی مظہر کی طرح استعمال کرتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس موازنے کی بوالعجبی اس بیان سے ظاہر ہوجاتی ہے۔ Saladin اور جناح دونوں نے اپنے عہد کے انتہائی ممتاز بلکہ تقریباً اساطیری حریفوں سے مقابلہ کیا۔ Saladin نے شیردل رچرڈ سے جنگ کی اور جناح نے ماؤنٹ بیٹن، گاندھی اور نہرو کو چیلنج کیا۔ اور پھر اسی بنا پر پارٹیشن سے متعلق مطالعات کو علمی کارناموں کا اعزاز بخش دیا گیا۔ یہ

عطا اس لیے نہیں ہوئی کہ ان مطالعات میں کوئی نمایاں عناصر ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ یہ مطالعے مورخ کو اپنے ہیروز اور ان کے کارناموں سے خود اپنے آپ کو منسلک کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

"اس کے علاوہ اور کیا ہے؟" پردیپ اصل واقعات کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔

"دوسری دشواری"، عزیز نے کہا، "ہے قومی پارٹیوں اور ان کے لیڈروں کے بارے میں حسنِ ظن"۔

"ہاں اور اسی وجہ سے ہم نے گاندھی جی، جناح صاحب اور پنڈت جی کی خط و کتابت کے اقتباسات تم سے پڑھوائے"، پردیپ نے کہا۔

"یقیناً، انتقالِ اختیار سے قبل کی دہائی میں کانگریس اور مسلم لیگ کلیدی کردار تھے۔ میں 1937 سے 1940 تک کی پیچیدگیوں کا تذکرہ کرچکا ہوں جو تین متناقص صورتوں میں تھیں۔ سیاسی صحرا میں برسہا برس گزارنے کے بعد لیگ کو امتیاز و شہرت کا ملنا، جناح کا ایک سیکولر سیاستداں سے تبدیل ہوکر مسلم قوم پرستی کا نظریہ ساز بننا، اور کانگریس کا نہایت بکثرتی سے تقسیم کے منصوبے کو منظور کرلینا اور اس طرح قومی اتحاد و یکجہتی کے بلند بانگ اصولوں سے دستبردار ہونا۔ میں نے کانگریسی وزارتوں اور اس کے ساتھ پاکستان کے مطالبے کے وقت کے انتخاب پر اثر انداز ہونے والے طبقے اور کمیونل کشمکشوں کے مابین تفاعل (interaction) کے اپنے تجزیے میں قیاس کی نزاکتوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے یوپی میں اتحادی وزارت پر کانگریس کی تندخوئی سے متعلق بحثوں کو پھر پڑھا اور اس کا بھی جائزہ لیا کہ مسلم ماس کانٹیکٹ کمپین موثر ہونے میں ناکام کیوں ہوا۔ بہرحال اس وقت میں کچھ اور نکتے ہیں جن کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں"۔

بات یہیں تک ہوئی تھی کہ عارف اور ہمایوں کتابوں کا ایک انبار اٹھائے ہوئے داخل ہوئے۔

یہ لوگ پچھلے کئی ہفتوں سے پارٹیشن کے بارے میں پڑھ رہے تھے اور اب یہ کتابیں اپنے دوستوں کو دکھانے کے لیے لائے تھے۔ کے بی کرشنا کی کتاب "The Problems of Minorities" عارف کو پسند آئی تھی مگر ہمایوں کا خیال تھا کہ کتاب غیر دلچسپ ہے۔ عارف کو ڈبلیو سی اسمتھ کی کتاب "Modern Islam in India"، راجندر پرساد کی "India Divided" اور امبیدکر کی "Thoughts on Pakistan" میں لطف آگیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ اے آر ڈیسائی نے اپنی کتاب "Social Background of Indian Nationalism" میں مارکسسٹ نقطہ نظر کی تلخیص کی تھی۔ یہ کتاب 1948 میں شائع ہوئی تھی۔

"تم نے ڈیسائی کے مارکسی تناظر کا ذکر کیا"، عزیز ہمایوں سے مخاطب ہوا "مگر یہ مت بھولو کہ ہندستان میں کمیونسٹ پارٹی، ان علاقوں میں جہاں وہ بھاری پڑتے تھے، خود مختار ریاستوں اور علاحدگی پسندی کے مسلمانوں کے حق کو تسلیم کرتی تھی۔ اس کے ممتاز لیڈر ڈاکٹر جی ادھیکاری نے لکھا کہ درحقیقت، خود اختیاری اور مسلم فرقوں (nationalities) کے علاقوں کی علاحدگی پنجاب، پختونستان، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے مشرقی صوبوں کی علاحدگی کا مطالبہ تھا"۔

"میں جہاں تک سمجھ پایا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ یقیناً اندازے کی غلطی تھی"، عارف نے کہا۔

"میرا تو خیال ہے کہ"، جگ موہن نے کسی قدر جھنجلاہٹ کے ساتھ کہا، "یہ ایک بہت بڑی سیاسی حماقت تھی۔"

"ہاں، بلاشبہ۔ جن کتابوں کا تم نے حوالہ دیا ہے"، ہمایوں کی طرف مڑتے ہوئے عزیز نے کہا، "انھیں میری لائبریری میں ہونا چاہیے۔ بہرحال یہ کتابیں جو بات تمھیں نہیں بتائیں گی وہ یہ ہے کہ صرف برطانیہ، کانگریس اور لیگ کے مذاکرات پارٹیشن کی کہانی کی پیچیدہ نوعیت کا انکشاف نہیں کرسکتے۔ انفرادی اعلانات، پارٹی کے ریزولیوشنز اور منشور یہ تاثر دیتے ہیں کہ گویا برصغیر کے لیڈر انتقال اختیارات کے

وقت قوم کے مقدر کے فیصلے میں ایک ناقابل تسخیر اور مستحکم حیثیت کے مالک تھے۔ حقیقت مختلف تھی۔ چوتھی دہائی کی سیاست کے اہم کردار کسی لحاظ سے بھی آزاد اور اپنے یا اپنی پارٹی کے ایجنڈا پر عمل کرنے میں خودمختار نہیں تھے۔ اگر سب نہیں تب بھی ان کی کچھ پہل قدمیاں فرقہ پرستانہ اور کمیونل تنازعوں کے حامیوں کی طرف سے بڑی سختی سے دبا دی گئیں۔ اس سے اس بات کی بھی وضاحت ہوتی ہے کہ مسلم ماس کانٹیکٹ کمپین، لاہور ریزدلیوشن سے قبل ہی کیوں معدوم ہوگیا"۔

"میں نے تمھارا یہ خیال سنا ہے"، ہمایوں بولا، "کہ ماس کانٹیکٹ کمپین میں بہت دشواریاں اس لیے پیش آئیں کہ ضلع کانگریس کمیٹیوں نے جن میں اکثر ہندو مہاسبھا کے لوگوں کا تسلط تھا، پارٹی میں مسلمانوں کی ریل پیل کو روکنے کے عزم سے اپنی کمریں کس لیں تھیں۔"

"اسی طرح"، عزیز نے بتایا، "کانگریس وزارتوں کا پردہ فاش کرنے کے ایک گمراہ جوش و خروش سے بھری ہوئی مقامی لیگ شاخوں نے اپنے لیڈروں پر "یوم نجات" منانے کے لیے مسلسل زور ڈالنا شروع کیا اور جشن و مسرت کے اظہار اور کانگریس سے اپنی نفرت کے اظہار کے دوران ہندوراج کے تحت ان پر گزرنے والے مصائب کے بدلے کا مطالبہ کیا اور یہ ایک واقعہ دونوں فرقوں کے تعلقات میں زہر گھولنے میں سنگ میل ثابت ہوا۔

"ہاں"، ہمایوں نے اضافہ کیا، "کراچی میں میرے کچھ اعزا مسلمانوں کو پہنچائی جانے والی اذیتوں کا ابھی تک تذکرہ کرتے ہیں"۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ کرتے ہوں گے"، عزیز نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ 'فرقہ وارانہ طور پر ایسے یک رنگے ماحول میں مقامی، ہندو، مسلم اور سکھ گروپوں نے ہر اس کوشش میں روڑے اٹکائے جس سے کانگریس اور لیگ میں مفاہمت کا کوئی امکان پیدا ہوتا تھا۔ انھوں نے اپنے لیڈروں سے بالکل واضح انداز میں یہ کہہ دیا کہ اونے پونے خرید و فروخت پر ہرگز راضی نہیں ہونا ہے۔ ویول نے اپنے جرنل میں

12/ مئی 1946 کو لکھا کہ "پس دوسری شملہ کانفرنس ختم ہوئی، بڑی حد تک اسی طرح جس طرح پہلی کانفرنس ختم ہوئی تھی"۔ وائسرائے نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کیبنٹ مشن، کانگریس اور مسلم لیگ کو کسی مفاہمت تک پہنچنے کے لیے مجبور کرے گا۔ وہ تو درحقیقت، مراجعت کی بات کر رہا تھا اور وہ بھی بڑے مشکل حالات میں۔ مگر اس کی فوجی فطرت نے اسے پسپائی کے وقت زیادہ سے زیادہ بہادری کا تاثر دینے کی تلقین کی تاکہ دباؤ بہت زیادہ نہ ہونے پائے"۔

"ان واقعات نے گاندھی جی کو تکلیف پہنچائی ہوگی؟"، عارف نے خیال ظاہر کیا۔

"یقیناً"، عزیز نے جواب دیا، "لیگ نے ان کی مذمت کی، کانگریس کے لفٹننس نے انھیں چھوڑ دیا، ہندو دائیں بازو نے، مسلمانوں کی منھ بھرائی کرنے اور ہندوؤں اور ہندوازم کو تباہ کرنے میں مدد دینے کا الزام لگاکر انھیں عتاب کا ہدف بنایا۔ ہندستان کی تقسیم یقینی ہوتی گئی اور خود ان کا احساس بے چارگی بڑھتا گیا۔"

"ہم نے جو کچھ سنا ہے یہ اس سے مختلف ہے"، جگ موہن نے کہا۔

"ایک اور بات جو مختلف لگے گی وہ تھی ہمارے قومی لیڈروں کی اپنی رائے کے مطابق آزادانہ طور پر عمل کرنے میں معذوری۔ اس پہلو میں، سمت، شدت (thrust) اور لوگوں کو ساتھ لانے کی متعدد مہموں کی حکمت عملی کے حوالے سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس یا لیگ کی پہل قدمیوں نے متعدد علاقوں میں نئے خوف و ہراس اور نئی بے یقینیاں، اگرچہ واضح طور پر مختلف طریقوں سے، پیدا کیں۔ مسلمانوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے راج نے جو ڈھانچے بنائے انھوں نے کشمکش اور مقابلے کے میدان وسیع کردیے۔ اس صورت حال نے مذہبی اور ثقافتی تنظیموں کے لیے فرقے کی قیادت سنبھالنے اور قومی معاملات میں پرزور مداخلت کرنے کی راہ ہموار کردی۔ انتقالِ اختیار کے عمل کے ہر ہر قدم نے ان کی کارروائیوں کو جواز دے دیا"۔

"مگر اس سے پہلے آپ نے بہت سی اصلاحی تحریکوں کا نام لیا تھا، خصوصاً پنجاب میں آریہ سماج یا ہند۔گنگا (انڈو گینجیٹک) کے میدان میں تبلیغ اور تنظیم کی جماعتیں جنھوں نے اپنے نظریات اور اپنی حمایت کے علاقے کو ادارہ جاتی ڈھانچوں، کلونیل پالیسیوں اور اثرات سے باہر تک بڑھا لیا تھا"۔

"میں نے یہ بھی کہا تھا کہ ان لوگوں نے اپنے نظریات و تصورات کے خود اپنے ایک پیچیدہ خزانے سے خود اپنے self-image اور self-representation سے، اور موجودہ انحطاط کے ذمہ دار مداخلت کرنے والے اثرات سے متعلق اپنے شبہات سے توانائی حاصل کی اور ایک ایسی دنیا میں جس کے بارے میں خیال تھا کہ دوسروں کے تسلط میں ہے اپنی حیثیت اور اپنے مقام کے مجموعی ادراک سے فیض حاصل کیا"۔

"تو آپ کہنا یہ چاہتے ہیں"، پردیپ نے سلسلہ کلام جاری رکھا "کہ "ضرورت اس کی ہے کہ ہم یہ جانیں کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟"

"یقیناً اور میں ہندو اور مسلمان نیشنلزم کی مقامی خبروں پر سے پردہ اٹھانے کی ضرورت پر بھی زور دے رہا ہوں۔"

ایسا کرنے کے اسباب جاننے کی باری اب جگ موہن کی تھی۔

"یہ طے کرنے کے لیے کہ واضح طور پر حدبند مذہبی سرحدوں کے اندر کام کرتے ہوئے اور ہندوتوا یا اسلامسٹ تحریکوں سے اپنے رشتوں کو استعمال کرتے ہوئے، مقامی مفادات نے اپنے اپنے خصوصی مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے کل ہند لیڈروں پر کس طرح دباؤ ڈالا اور یہ کہ انھوں نے کس طرح متشدد ڈھنگ سے مفاہمت کی قیمت کے طور پر اپنے مخالفین کو پیش کی جانے والی وقتاً فوقتاً رعایتوں کی مخالفت کی۔ ان کے خد و خال (profile) ان کا مقام اور ان کے رابطے ان اسباب کی وضاحت کرنے میں معاون ہوسکتے ہیں کہ چوتھی دہائی کی سیاست میں وہ ایک اہم حیثیت کے مالک کیسے ہوئے اور دلی اور کراچی میں یونین جیک کے سرنگوں ہونے سے بہت پہلے ہی پاکستان کے لیے زمین ہموار کرنے کی صلاحیت ان میں کیوں کر پیدا ہوئی۔"

"آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا"، عارف نے کہا، "کہ ملک کی تقسیم کا ذمہ دار کون تھا؟"

"مجرموں کی تلاش میرا کام نہیں ہے"، عزیز نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"ٹھیک"، عارف نے غیر مطمئن ہوتے ہوئے کہا، "مگر ذمہ داری کو متعین کیے جانے کا خیال ہر ایک پر مسلط ہے۔ اس معمے کو ہم کیسے سلجھائیں؟"

"معمہ کوئی نہیں، میری دلچسپی ہے یہ سمجھنے میں کہ تقسیم کیسے اور کیوں ہوئی سمجھے؟"

"میری کم علمی کو معاف کرنا"، عارف نے کہا۔

"اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہندستان میں شہری یکجہتی کی دو مختلف اقسام نے قوم پرستی (نیشنلزم) اور مذہبی فرقہ پرستی کے فروغ و نشوونما کی بنیاد کا کام کیا جس نے بڑے ڈرامائی انداز میں بیسویں صدی کے واقعات پر اپنا اثر ڈالا۔"

اس سے پہلے کہ عزیز اپنی بات ختم کرے پردیپ نے اسے خود اسی کے قول کو یاد دلایا کہ لیڈروں کے فیصلوں اور ان کے افعال کو نیچے سے پڑے ہوئے دباؤ کے فراہم کیے ہوئے جوابی نکتوں کے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔"

بالکل صحیح، 1905 اور 1947 کے درمیان کے فرقہ وارانہ تشدد کے انداز سے میری تاویل کی تصدیق ہوتی ہے۔ غیر منظم، ادارہ جاتی سیاست سے کم وابستہ اور شدید طبقاتی رجحان کے ساتھ ہونے والے فساد سے تبدیل ہوکر بہتر تنظیم کی نمائش اور اعلانیہ فرقہ پرستی کے ساتھ منظم سیاست سے منسلک ہنگامے۔

"ہم process یا processes پر واپس آگئے۔"، جگ موہن نے تمسخر آمیز انداز سے کہا اور چھت کو تکنے لگا۔

"یقیناً، یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ ہندو مسلمان کی تفریق دوسری دہائی میں کیوں اور کیسے ایک تحریک بن گئی۔ عوام اپنے لیڈروں کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے

کیسے آگئے۔ Subaltern گروپوں کی اجتماعی ذہنیتیں اپنے ایلیٹ (elite)سیاستدانوں سے ممتاز اور واضح کیسے ہوگئیں۔ ہمیں یہ سوال پوچھنے کی ضرورت ہے کہ عوامی تصورات نے کمیونٹی کی تعیین مشترک بنگالی یا پنجابی کلچر کی حیثیت سے کرنے کے بجائے ایک مذہبی شناخت کی حیثیت سے کرنا کیوں شروع کردی"۔

"مگر"، پردیپ نے کہا، "کیا آپ نے کسی دوسرے سیاق و سباق میں یہ نہیں کہا تھا کہ بستیوں میں علاقائی اور کل ہند مناظر نظر آتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ اسی وجہ سے آپ نے کہا تھا کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے پیچھے سیاسی دباؤ صوبے سے باہر وجود میں آئے تھے۔"

"ہاں، میں نے کہا تھا پھر بھی اس بات کے اسباب کہ کمیونٹی پر مبنی یکجہتیوں نے اپنے پنجے اوپر کی جانب کیوں پھیلائے، عوامی جگہوں پر عوامی کارکردگی اور اجتماعی سرگرمیوں میں بہترین طریقے پر دیکھے اور سمجھے جاسکتے ہیں۔ سیدھے سادے ڈھنگ سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اَن کہی کہانی صرف یا ہمیشہ بے چہرہ میٹروپولیٹن مراکز میں، مقامی زبانوں کے اخباروں کے بھیڑبھاڑ والے دفتروں میں، کچہریوں، تھانوں اور میونسپلٹیوں میں یا شفیق اور نیک دل مدرسوں، پاٹھ شالاؤں، مسجدوں، مندروں اور صوفیوں کی درگاہوں (سندھ اور پنجاب میں لوگوں کے اجتماع کے اہم مراکز) اور انتہائی پرجوش اور سیماب صفت شدھی اور گئورکشا سبھاؤں، انجمن اسلامیہ، تبلیغ اور تنظیم کی جماعتوں میں نہیں بلکہ شہروں اور قصبوں کے دھول سے اٹے ہوئے گلی کوچوں میں پڑھی جاسکتی ہے۔"

"یا اللہ"، ہمایوں نے مایوسی سے اپنے ہاتھ اٹھائے، "ان ساری جگہوں کو نظر میں رکھنے کے لیے ایک زندگی کافی نہ ہوگی۔"

"ہمت نہ ہارو، یہی جگہیں تھیں جہاں myths اور یادیں بنیں، تفرقہ انگیز مذہبی علامات تخلیق ہوئیں، اشتمالی شعور کو مہمیز لگانے کے لیے ان کی ترویج بھی یہیں سے ہوئی اور 'دوسرے' کی شبیہ کو دوام بھی یہیں سے ملا۔ یہی وہ اکھاڑے تھے

جہاں متنوع مسائل پر، جن میں کچھ نے انیسویں صدی کے اواخر میں بین کمیونٹی ہم آہنگی کے گہوارے میں دراڑ ڈالی تھی، گرماگرم بحثیں ہوئی تھیں۔ گاؤکشی اور مسجدوں کے سامنے باجے عوامی مباحثوں کے موضوع تھے۔ اور بحث اخباروں کے کالموں میں، کتابچوں اور پمفلٹوں میں، رسالوں اور کتابوں میں ہوتی تھی، ان سب نے اِس یا اُس تنازعے کی آگ میں تیل کا کام کیا۔"

ہمایوں کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ ہو کیا رہا ہے۔ myths؟ یادیں؟ اشتمالی شعور؟ دماغ خراب کردیتی ہیں یہ سب باتیں، ان عملوں کی نازک ماہیت کا سراغ آپ کہاں ڈھونڈیں گے؟ پیہانی میں نہیں بلکہ لکھنؤ جیسے شہری مرکز میں، علی گڑھ، الہ آباد اور بنارس، کھردرے اور اجڈ جنوب مشرقی پنجاب میں جہاں، آریہ سماج کی تعلیمات سے فیض یاب جاٹ، شدھی، ہندی اور گائے کے تحفظ کے وکیل بن گئے تھے۔

"ذرا آہستہ"، عارف نے عزیز سے درخواست کی۔

"مہربانی کر کے یہ سمجھ لیجیے کہ دیہی اور شہری کی خلیج کو جزوی طور پر ہندو اور مسلمان احیا پسندی کی پان انڈین آئیڈیالوجی نے پاٹ دیا تھا۔ یہ بھی یاد رکھو کہ اس میں مشترکہ ہندو مسلم کلچر کی پرانی علامتوں سے علاحدگی اور ان کی تکذیب، نئی فرقہ وارانہ علامتوں کی تعیین اور ان کا اثبات، اور پسندیدگی اور ملامت کی حکمت عملی تیار کرنا شامل تھا۔ یہ ایک نئے اور روشن خیال بائیں بازو کے نقطہ نظر سے ایک منحوس نمو تھی۔ اگرچہ کلونیل ماضی سے قبل مشترکہ روایتیں تھیں اور مشترکہ حوالے تھے مگر وہ لازمی طور پر مستحکم یکجہتیوں کا روپ نہیں دھار سکیں کہ جس کا اظہار آخر انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں اسلام اور ہندوازم نے کیا تھا۔ مگر انھوں نے ایک نیا سماجی سیاسی ابعاد نہیں حاصل کیا۔"

"میں اس آخری نکتے کو بہتر طور پر سمجھتا ہوں۔"، پردیپ نے کہا۔

"اگر ایسا ہے تو ذہن میں یہ بات رکھو کہ اسلامائزیشن یا ہندو رواجوں کا نیشنلائزیشن ان عناصر کا نتیجہ نہیں تھا جو نہ صرف ایک دوسرے کی طرف ملتفت

ہوئے بلکہ انھوں نے تاریخ کے ایک مخصوص وقت پر، قبول عام حاصل کیا۔ ان رجحانات کو کسی سیاق میں دیکھو اور انھیں قدیم ناقابل مفاہمت ہندو مسلم جھگڑوں کی روشنی میں نہ پڑھو۔"

"جناب آپ کا ایجنڈا کیا ہے؟"، ہمایوں نے استفسار کیا۔

"حضور میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا ہوں جو مذہبی قوم پرستی کے جشن مناتے ہیں یا ایک ایسے سماج میں جو دنیا کی ہمہ ثقافتی سوسائٹیوں میں سے ایک ہے مشترکہ ورثے پر اختلاف ظاہر کرتے ہیں۔"

"کیوں نہیں؟"، ہمایوں نے اصرار کیا۔

"زیادہ تر شہادتیں، جن میں سے کچھ برطانوی مورخین اور علم الاقوام کے ماہرین نے اکٹھا کی ہیں ایک سرسبز و شاداب ہوتے ہوئے مشترک تمدن کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو ایک ایسا سازگار دائرۂ کار فراہم کرتا ہے جس میں مختلف کیمونٹیز، کلچر اور مذاہب، اپنی منفرد دین کے ساتھ پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔"

"حضرت ہم آپ کی پریشانیاں سمجھتے ہیں مگر مہربانی فرماکر ان کو بیان کیجیے۔"، پردیپ نے کہا۔

"میری دلچسپی اس سوال میں ہے کہ مشترک معاشرت کی ایک قدیم تاریخ رکھنے والے لوگ تاریخ کے ایک خاص موقع پر تنازعوں اور ناہم آہنگیوں کی علامتوں پر کیوں توجہ دینے لگتے ہیں؟ کیوں ایک سماج اپنے شاندار مشترکہ ورثے کے باوصف بیسویں صدی کی تاریخ میں طوفانی واقعات و حادثات کا کارزار بن گیا؟ اگر انیسویں صدی کا شاعر غالب زندہ ہوتا تو اس نے اپنے لاثانی انداز میں پوچھا ہوتا:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

"یہ لبرل لفٹ کے جس تناظر کی آپ بات کرتے ہیں، وہ کیا ہے؟"، پردیپ نے پوچھا۔ اُسے عزیز کے ردعمل کا اندازہ تھا مگر وہ وضاحتوں کا کوئی موقع

ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

روشن خیال اور بائیں بازو کے اکثر رائٹرز، ثقافتی آمیزش اور کمیونٹیز کے باہمی ربط و ضبط پر زور دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ یہ لوگ بسا اوقات نزاعی عناصر سے صَرف نظر کرتے ہیں مگر پھر بھی یہ لوگ ہنگامی زمانوں میں امن و شانتی کے ساتھ رہنے والوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں۔ ساری کہانی سے نکلنے والا نتیجہ یہ ہے کہ ہندو مسلم دشمنی کلونیل ہندستان سے قبل کی پیداوار نہیں تھی۔ بعض علاقوں میں اس کا آغاز 1860 سے ہوا، اگرچہ منظم فرقہ پرستانہ سیاست نے باقاعدہ شکل دو دہائی بعد اختیار کی۔ ان ہی اسباب کی بنیاد پر میں آٹوبایوگرافی میں نہرو کے تاثرات اور رام گڑھ کانگریس میں آزاد کے مطالعہ نفس کی تائید کرتا ہوں۔ وہ آج بھی اتنے ہی موافق و مناسب ہیں جتنے کہ تیسری اور چوتھی دہائی میں تھے۔

"کیوں؟"، جگ موہن نے پوچھا۔

آزاد نے اس نکتے کی وضاحت کی کہ آخر انیسویں صدی سے وسط بیسویں صدی تک واضح منازل میں کسی نہ کسی طرح کی سیاسی علاحدگی پسندگی نے یقیناً نمو پائی، مگر اس کے مخالفین اس کی پیش رفت کو روک نہ سکے۔ چوتھی دہائی میں ان کی عوامی زندگی اور یقیناً اس سے پہلے کی دہائیوں میں اجمل خاں اور انصاری کی زندگیاں، برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کے دوران، فرقہ پرستی کے ایک متبادل کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ ایک متبادل تھا جو ناکام ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کامیابی سے ہم کنار ہو سکتا تھا یا نہیں؟"

"اب ہمیں بنیادی باتوں پر غور کرنا چاہیے۔"، پردیپ نے کسی قدر تحکمانہ انداز میں اعلان کیا، "آپ دو قومی نظریے کو مسترد کرتے ہیں' ٹھیک ہے آپ پاکستان کی ابتدا سید احمد میں نہیں دیکھتے' ٹھیک ہے! آپ نے اس سے متعلق کسی کا حوالہ بھی دیا تھا کہ تیسری دہائی میں پاکستان کا کوئی خاکہ بھی نہیں تھا، مان لیا! آپ نے ہندستان کے حوالے سے اقبال کے صوبائی خودمختاری کے ایک مقدمے کی تشکیل کرنے کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کوئی الگ ملک نہیں چاہتے تھے۔ پھر آخر میں آپ نے مفصل

طور پر بیان کیا تھا کہ 1937 کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ کیسے اچھی کارکردگی نہ دکھا سکی اور کانگریس سے ملنے پر جناح کی رضامندی کا بھی ذکر کیا تھا۔ پھر کس منزل پر پاکستان کی تحریک نے رفتار پکڑی اور کیوں؟"

دوسری جنگ عظیم کا شروع ہونا ایک اہم سنگ میل ہے اگرچہ وزارتوں نے زخم پھر کھول دیے تھے۔ جنگ سے بے حال اور ماندی حکومت نے سیاسی اور اخلاقی مدد کے لیے جناح کی طرف دیکھا جنگ کے چھے برسوں نے برطانوی سلطنت کو نحیف و نزار کردیا تھا مگر اس کے باشندوں کے لیے آزادی کی راہ دشوار گزار تھی اور نتیجتاً قومی یکجہتی کا استحکام بھی اتنا ہی دشوار تھا۔ انٹرکمیونٹی اتحاد کے شرمناک خاتمے اور اسی کے ساتھ پنجاب اور بنگال، لیگ سے دفاع کے آخری مورچوں کی اتحادی حکومتوں کی شکست وریخت نے جناح کے مقاصد کو تقویت پہنچائی۔

"تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ واقعات تیسری دہائی میں سوچے بھی نہیں جاسکتے تھے۔"، جگ موہن نے کہا۔

"بالکل"!

"جناح نے اپنی پارٹی کے تیوروں کو محارب کیوں کر بنایا؟"، پردیپ نے پوچھا۔

"اوہ، انھوں نے دو قومی نظریے کی بات کی، مسلمانوں کے اپنے وطن کی بات کی، ان کے اپنے علاقے اور اپنی ریاست کی بات کی۔ وہ ایک مشترک قومیت کو نہیں مانتے تھے، کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق ایک دوسرے سے مختلف تہذیبوں سے تھا۔"

ایک لمحے کے لیے وہاں سناٹا ہوگیا۔

عزیز نے اپنی بات جاری رکھی۔ دو قومی نظریے کی بنیاد اس غلط فہمی پر تھی کہ ہندو اور مسلمان دو بالکل الگ الگ اور آزاد اکائیاں ہیں اور مذہبی وفاداریاں سماجی رشتوں، تہذیبی لین دین اور مشترکہ مادی مفادات پر مبنی تعلقات پر سبقت رکھتی ہیں۔

"مگر میں نے سنا ہے کہ انھوں نے پاکستان قانون ساز اسمبلی میں ایک سیکولر ملک کی بات کی۔"، عارف نے اظہار خیال کیا۔

"یہ تو بہت تھوڑا بہت دیر میں والا معاملہ تھا"، عزیز نے کہا۔

"مگر یہ تو یقینی بات ہے کہ انگریزوں نے جناح کو پاکستان طشتری میں رکھ کر نہیں پیش کیا"، جگ موہن نے کہا۔

"انگریز حکمرانوں کو ہندستان کے لخت لخت ہونے میں کوئی تردد یا بے کیفی نہیں تھی۔ جناح جن سے پہلے بے توجہی برتی گئی تھی، بعداز جنگ زمانے میں انتہائی محتاط طور پر تیار کیے ہوئے امپریل منصوبوں کو آگے بڑھانے میں ایک مفید اتحادی ثابت ہوئے۔ کچھ برٹش حکام نے ہندستان کے اتحاد سے زبانی ہمدردی دکھائی اور اس کی ناگزیر تقسیم پر افسوس کا اظہار کیا مگر ان حکام کے زیادہ موقع شناس اور زیادہ تجربہ کار آقاؤں کی پالیسیوں نے 1947 میں ایک نہیں دو ملکوں کے وجود میں آنے کو یقینی بنا دیا۔"

"کیا لاہور ریزولیوشن نے پاکستان کا مستقبل کا نقشہ طے کر دیا تھا؟"، پردیپ نے پوچھا۔

"نہیں جناح نے اپنی اسکیم کی مختلف تاویلات کے لیے دروازہ کھلا رکھا۔ وہ امکانی طور پر خود اپنے مقدمے کے لیے ضرررساں طول طویل مباحثوں میں الجھے رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی مرکزی دلچسپی اپنی طاقت کی بنیاد کو استحکام بخشنے اور کانگریس کو باہر رکھنے میں تھی۔ اسی کے ساتھ "ممتاز مسلمان" بشمول پنجاب کے وزیراعظم سکندر حیات خاں لاہور ریزولیوشن کی منظوری کے بعد بھی پاکستان کے خیال کی مخالفت کر رہے تھے۔"

"تو گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں"، پردیپ نے اظہار خیال کیا، "کہ کانگریسی وزارتوں کے استعفیٰ اور دوران جنگ عالمی مجبوریوں نے جناح کو اپنا پاکستان کارڈ چلنے اور اپنے مخالفین پر سبقت لے جانے کے لائق بنا دیا۔"

"ہاں، ایک مسلم انڈیا کے واحد ترجمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک سربراہ کی حیثیت سے ان کی بات سنی جانے کا ان کو اخلاقی حق مل گیا۔ اسی وجہ سے پنڈت جی نے حالات کو غلط پڑھا جب انھوں نے جنوری 1946 میں کرپس کو لکھا کہ اگر حکومت برطانیہ اس بات کو صاف کردے کہ وہ کسی حالت میں پاکستان کی ہمت افزائی نہیں کرے گی تو اس کے لیے ہونے والا احتجاج جلدی ختم ہوجائے گا اور یہ کہ لیگ کی قیادت کسی راست ایکشن یا کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔"

"بہرحال چوتھی دہائی میں مرکزی مسائل کیا تھے؟" ہمایوں نے سگریٹ بناتے ہوئے پوچھا۔

"ایک تو مذاکرات سے کانگریسی مسلمانوں کو الگ رکھنا تھا۔ جناح کا اصرار تھا کہ سیاسی طور پر سوائے کسی لیگی کے کوئی دوسرا مسلم مفادات کی نمائندگی نہیں کرسکتا تھا۔"

"یہ تو خرافات ہے"، پردیپ نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ "لیگ سے ایک معاہدے کی خاطر کانگریس اپنے ساتھیوں، پرانے اتحادیوں کو کیوں کر چھوڑ سکتی تھی؟ گاندھی اور نہرو سیاسی مصلحتوں کی قربان گاہ پر اپنے ذاتی دوستوں اور سیاسی کامریڈ کو بھینٹ کیسے چڑھا سکتے تھے؟ وائسرائے نے مسئلے کی ناقابل حل فطرت پر رائے دی تھی۔ یکم اکتوبر کو وائسرائے اور جناح ملاقات سے قبل ایک ناراض پیتھک لارنس نے کرپس کو اطلاع دی کہ اڑیل گھوڑا اب بھی نیشنلسٹ مسلم لگتے ہیں۔"

"لیکن"، ہمایوں نے کہا، "آپ اس سے تو انکار نہیں کریں گے کہ کانگریسی مسلمانوں نے تقسیم کے منصوبے کو مانا۔"

"نہیں نہیں انھوں نے نہیں مانا جمعیۃ العلما نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، آل انڈیا مومن کانفرنس نے بھی کچھ ایسا کیا۔ خان عبدالغفار خاں نے بہت زور و شور اور جذباتی انداز سے احتجاج کیا۔ دوسروں نے یہی کام کسی قدر خاموشی سے کیا۔ جب 2/ جون 1947 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ماؤنٹ بیٹن پلان

کی توثیق کی تو آزاد اس شرمناک سپردگی کو روکنے کے لیے اس وقت کچھ نہ کرسکے خصوصاً گاندھی اور نہرو کو ڈھلکتا دیکھنے کے بعد۔ 16/ ستمبر 1947 کو ہونے والی طویل میٹنگ میں مولانا اپنی نکیلی داڑھی کے ساتھ خاموش، جذبات سے خالی اور سنجیدہ بیٹھے ہوئے بس دیکھتے رہے۔ بالکل Cardinal Richelieu کی طرح۔"

"عزیز بھائی اگر اجازت دو تو میں مولانا کی کتاب غبار خاطر سے ایک اقتباس سناؤں۔"

"یقیناً ہمایوں یقیناً، ضرور سناؤ۔"

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا، اکیلا ہی نکلنا پڑا، کسی بھی راہ میں وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا"۔

با رفیقان ز خود رفتہ سفر دست نہ داد
سیر صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردیم!

"جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردراہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیزرفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔" (غبارخاطر خط 11، صفحہ 3-92)

"خوبصورت"، جگ موہن نے کہا، "کاش مجھے اتنی اردو آتی کہ میں اسے اردو میں پڑھ سکتا، آپ کا کیا خیال ہے"۔ آزاد نے غالب کے اس شعر کو پسند کیا ہوتا :

ہم نے مجنوں پر لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

(غالبؔ)

عزیز کے ہاتھوں سے صبر کا دامن چھوٹ رہا تھا "براہ کرم یہ شعرو شاعری اور واہ واہ کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے۔" اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا، "مجھے دو

ایک باتیں اور کہہ لینے دو پھر ختم کروں۔"

"اس سے پہلے"، جگ موہن نے اپیل کی "ہمیں کرپس کی پیشکش اور شملہ کانفرنس اور کیبنیٹ مشن کے بارے میں بتا دیجیے۔"

کرپس تجاویز نے 'ہندستان سے ڈومینن اسٹیٹس کا' اور جنگ کے بعد انڈین یونین کے آئین کی تدوین کے لیے ایک قانون ساز جماعت بنانے کا وعدہ کیا۔ طویل المدت تجویز نے ہر صوبے کو اگر وہ چاہے تو مجوزہ یونین میں الحاق سے انکار کا حق دیا۔ الحاق نہ کرنے کا فیصلہ کرنے والی ریاستیں مکمل سلف گورنمنٹ کے ساتھ اپنی یونین تشکیل دے سکتی تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں نے ان تجاویز کو رد کردیا۔

"کیوں؟"، جگ موہن نے پوچھا۔

"لیگ"، عزیز نے کہا، "پاکستان کے قیام کو ایک دورافتادہ امکان کے دائرے میں پھینک دیے جانے پر برہم تھی، جب کہ کانگریس مجوزہ یونین میں ریاستوں کی شریک اکائیوں (constituent units) کی حیثیت سے شمولیت پر اور ریاستوں کو الحاق نہ کرنے کا حق دیے جانے پر معترض تھی"۔

"بالآخر"، پردیپ بڑے فخریہ انداز میں بولا "اب میرے سامنے یہ بات واضح ہے کہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے سے دور کیوں ہوئیں"۔

عزیز سن نہیں رہا تھا، "جہاں تک جون 1945 میں شملہ کانفرنس کا معاملہ ہے یہ اس بات پر ختم ہوگئی کہ جناح وائسرائے کو اس کی اجازت نہیں دیں گے کہ وہ کسی ایسے مسلم رکن کو نامزد کرسکے جو لیگ اگزیکیٹو کاؤنسل کے ساتھ وفاداری نہ رکھتا ہو۔ انھوں نے مولانا آزاد اور خان عبدالغفار خاں کی موجودگی کو بھی بے سبب اور جان بوجھ کر بھڑکانے والی قرار دیا"۔

"ہم نے ایک سی آر فارمولے کے بارے میں بھی سنا تھا"، جگ موہن نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے سنا ہے؟ ہاں 1944 میں راج گوپال اچاری نے پنجاب اور بنگال کے

مسلم اکثریت والے علاقوں پر مشتمل ایک پاکستان کی پیشکش کی تھی۔ مگر جناح نے ان کی اسکیم کو یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ یہ محض پرچھائیں اور صرف خاشاک ہے۔ لولا لنگڑا مسخ اور کرم خوردہ پاکستان ہے۔ کیبنٹ مشن کا منصوبہ مسلم اکثریت والے علاقوں کو وفاقی یونین کے اندر نیم خودمختار علاقائی اکائیوں کی صورت میں اپنے آپ کو اکٹھا ہونے کی اجازت دے کر ہندستان کی یکجہتی کو باقی رکھنا تھا۔ ایسی وفاقی یونین کو مشن ملک کی تقسیم کو روکنے کا آخری موقع تصور کرتا تھا۔

"ایسا لگتا ہے کہ کوئی امید بر نہیں آتی' والی کیفیت تھی"، جگ موہن نے ذرا خفا ہوکر کہا۔ "کیبنٹ مشن کا حشر کیا ہوا؟"

"لیبر گورنمنٹ نے کمیشن کو 15/ اگست 1945 کو جاپان کے ہتھیار ڈالنے کے بعد بھیجا۔ تین ہفتے تک چلنے والے مذاکرات نے نئے تنازعے کھڑے کردیے۔ بالآخر 25/ جون 1946 کو کانگریس ورکنگ کمیٹی نے کیبنٹ مشن پلان کو منظوری دے دی۔ نہرو نے بہرحال مسلم اکثریت والے علاقوں کی گروپ بندی کو مسترد کردیا۔ لیگ کے کان کھڑے ہوئے۔ لیگ چوکنی ہوگئی اس نے نہرو پر سہ سطحی وفاق کے منصوبے کی روح کی تکذیب اور تردید کرنے کا الزام لگایا۔"

"اور یہی وہ وقت تھا جب جناح نے 16/ اگست کو "یوم راست اقدام" کا اعلان کیا۔ جگ موہن نے اس عزم کے ساتھ یہ بات کہی گویا وہ ہر شخص کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے چوتھی دہائی کے بارے میں خاصا پڑھ لیا ہے"۔

صحیح ہے، کلکتے میں فوراً ہی فسادات پھوٹ پڑے اور مشرقی بنگال، بہار اور پنجاب تک پھیل گئے۔ ویول نے ستمبر میں ایک انٹرم گورنمنٹ تشکیل دی مگر لیگ اس سے الگ رہی، ایک مہینے کے بعد اس نے انٹرم گورنمنٹ میں شرکت کی۔ وزیروں کے دو حریف گروپ تھے اور دونوں میں مستقل اَن بن تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے بڑھتے ہوئے تشدد کے پیش نظر ایک لاینحل مسئلے کے حل کے لیے الگ الگ راہ لینا واحد طریقہ تھا۔

پردیپ کچھ اور سوالات پوچھنا چاہتا تھا مگر نہیں پوچھے۔ اس منزل پر زیادہ بات جگ موہن نے کی، "اب آپ ان نکات کی طرف آیئے جو آپ بتانا چاہتے تھے"۔

"شکر ہے۔ تم جانتے ہو کہ یہ تفصیلات میرے لیے کچھ بہت دلچسپ نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھتا کہ پارٹیوں میں سے کسی کو بھی اپنے اختلافات کو دور کرنے میں حقیقی دلچسپی تھی۔ ان میں سے کوئی پارٹی بھی اپنے کسی رویّے میں مصالحتی یا مفاہمتی نہیں تھی۔ کیا تم جانتے ہو کہ 1950 میں پنڈت جی نے ایک معروف ادیب سے کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟"، میز سے قریب ہوتے ہوئے جگ موہن نے کہا۔

"انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ اور ان کے ساتھی تھک چکے ہیں، اور یہ کہ ان کی عمریں بڑھتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے اس کا بھی ذکر کیا کہ اب پھر جیل جانا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ اور اگر وہ اپنی خواہش کے مطابق متحدہ ہندستان کے لیے کھڑے ہوں تو ظاہر ہے کہ قیدخانہ ان کا منتظر ہے۔ انھوں نے پنجاب میں آگ لگتے دیکھی اور قتل و غارت گری کے واقعات سُنے تقسیم کا منصوبہ فرار کا ایک راستہ دکھا رہا تھا، انھوں نے اس راستے کو اختیار کرلیا۔ انھیں توقع تھی کہ تقسیم عارضی ہوگی۔ پاکستان کو ہندستان سے ملنا پڑے گا۔

عزیز نے اس انحراف کے لیے معافی مانگی۔ اس کو احساس ہوا کہ پاکستان کی کہانی کچھ پُراسرار اور پیچیدہ ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے پاس وقت نہیں تھا اپنے دوستوں کو 44-1943 کے بنگال کے قحط کے بارے میں بتانے کا جس میں تین لاکھ پچاس ہزار اور تین لاکھ اسّی ہزار کے درمیان لوگ مرے تھے۔ وہ 1857 کی بغاوت کے بعد کی سب سے بڑی عوامی شورش Quit India Movement کے بارے میں بھی کچھ نہ بتا سکا۔ دوسرے اور متعدد موضوع تھے جن پر بات ہونا تھی مثلاً سبھاش چندربوس کی قیادت میں ہندستان کے شمال مشرقی علاقوں سے شروع ہونے والی مسلح جدوجہد، تبھاگا (Tebhaga) تحریک (1946)، بحریہ کی بغاوت (1946) شمال مغربی ریاست ٹراونکور کے

علاقوں شیر تلائی، ایلاپی، امبالاپوڑا میں ہونے والی انقلابی شورش، اور تلنگانہ کا شاندار معرکہ جو جولائی 1946 سے اکتوبر 1951 تک جاری رہا۔ وہ اس بات کو سمجھانے کے لیے بہت بے چین تھا کہ ان تحریکوں کی قیادت کرنے والے کیمونسٹ ناکام کیوں رہے۔ وہ لال قلعے میں ہونے والے آئی این اے کے مقدمات پر بھی بات کرنا چاہتا تھا جہاں ملک کے بعض بہترین وکلاء نے جنگ آزادی کے مجاہدین کا دفاع کیا تھا۔ اسے بہرحال پاکستان کی کہانی مکمل کرنا تھی جس میں اس کے دوستوں کو دوسرے تمام قصوں سے زیادہ دلچسپی تھی۔

"میں اس بات کو مانتا ہوں کہ لاہور سے ہونے والے اعلانِ جنگ کو مہمیز لگانے والوں میں علی گڑھ اور بعض دوسری جگہوں کے کچھ ممتاز دانش ور تھے۔ بہرحال مطالبہ پاکستان کا تعلق ایک الگ اسلامی ریاست اور ایک الگ اسلامی سماج بنانے سے زیادہ سماجی طبقات کی سیاسی اور اقتصادی تشویشوں سے تھا۔ یہی حقیقت اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ مسلمان زمیندار اور مختلف پیشہ ور گروہوں نے اور ان کے ساتھ ٹریڈنگ اور بینکنگ کمیونٹیز نے مل کر اپنے مقدر کو پاکستان بنانے سے کیوں وابستہ کرلیا۔ تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ہمارے صوبے کے زمینداروں کا، تیسری دہائی تک لیگ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

"تو انھوں نے اپنی روش کب بدلی؟"، عارف نے پوچھا جو خود اپنے وطن فتحپور کے کچھ زمینداروں کو جانتا تھا۔

"منسٹری کے ٹیننسی بل پیش کرنے کے بعد"، عزیز نے جواب دیا۔

ہمایوں تھوڑی دیر تک اپنے طبقے کے انحطاط اور پسپائی میں اپنے خاندان کے طرز زندگی میں آنے والی تبدیلیوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے راجہ آف امیرپور یاد آئے۔ جو ریٹائر ہونے کے بعد امیرپور ہی میں رہنے لگے تھے۔ نامساعد حالات کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے، باوقار اور لیے دیے، شہر میں ان کا محل اسمبلی کے ممبروں کے ہوسٹل کے لیے لے لیا گیا تھا۔ شہر سے باہر آرائشی باغوں والے شکستہ، کھنڈر ہوتے ہوئے گھر کو کرائے کے مکانات بنوانے کے لیے پلاٹس میں تقسیم کردیا

گیا تھا اور اب وہ ایک نئی ریفیوجی کالونی کا مرکز بن گیا تھا۔ آخری سرکاری موقع آزادی کے چار سال بعد آیا تھا جب صدر جمہوریہ کو تعلقداروں کی طرف سے دیے جانے والے ایک استقبالیے میں راجہ صاحب صدر کو خوش آمدید کہنے اور ان کا استقبال کرنے لوگوں کے سامنے آئے تھے۔ رنگ برنگی روشنیاں نہیں تھیں، آتش بازی نہیں تھی، شمپین نہیں تھی۔ زر و جواہر کی چمک دمک نہیں تھی، زربفت، جامیوار اور کامدانی نہیں تھی۔ مجلسی جوڑے اور تقریبی وردیاں نہیں تھیں۔ تعلقداروں کی طرف سے دیا جانے والا یہ استقبالیہ ایک متین اور سنجیدہ پارٹی تھی، جس کے میزبان وہ لوگ تھے جو جلدی ہی اپنے خصوصی درجے اور اپنی خصوصی حیثیت سے اور ملنے والی خصوصی مراعات سے محروم کیے جانے والے تھے۔

ان کی ایسوسی ایشن کے سابق صدر اور شاہی نمائندوں کی گرد آلود تصویریں اور سنگ مرمر کے شکستہ مجسمے سہو زمانہ شان و شوکت کے ساتھ میزوں کو دیکھ رہے تھے۔ میزیں جن پر ٹھنڈی چائے، باسی کیک، ٹھنڈی ہوتی ہوئی ہندستانی اشیائے خوردنی بچی ہوئی تھیں۔ مجمعے میں کھدر پوش مہمان، رسمی کپڑوں میں ملبوس افراد سے تعداد میں کہیں زیادہ تھے۔ اپنے عہد کے اس جشن آخریں کی صدارت، راجہ صاحب نے انتہائی تمکنت اور انتہائی تہذیب و نفاست کے ساتھ کی۔ دوسری طرف حکام کے سامنے عادتاً جھکنے والے، اپنے مہذب اور پُروقار مہمانوں کے گرد آسمان سے من و سلویٰ اترنے کی امیدیں لیے چکر کاٹ رہے تھے۔ جلسہ گاہ سے باہر پولیس بینڈ انگریزی اور ہندستانی دھنیں بجا رہا تھا اور ہراساں کبوتر سبزہ زار پر بنی ہوئی شبہ نشینوں کے اطراف میں حیران و پریشان اڑ رہے تھے۔

"یہ سب تو بہت ٹھیک ہے"، پردیپ نے خیال ظاہر کیا، "مگر مسلمان زمینداروں کی چرب زبانی اسلام کے نام پر بدستور جاری رہی"۔

کافی دیر کے بعد عزیز نے کہا، "ان کی لفاظی سے گمراہ مت ہوجانا کیونکہ ان لوگوں کا ایک سیدھا اور صاف مقصد انگریز اَن داتاؤں کی صدیوں کی بخششوں سے کھڑے کیے گئے نوابی تام جھام کا تحفظ کرنا تھا۔ پنجاب میں ان کے ہم رتبہ لوگوں نے

جو یونینسٹ پارٹی کے زبردست حمایتی رہ چکے تھے، پارٹی نے جو طبقات کی بنیاد پر بنائے ہوئے combination کا ایک انوکھا اور کامیاب تجربہ تھی، اپنی راہ بدل لی۔ یہ لوگ اپنے ہندو سکھ سابق ساتھیوں کو چھوڑ کر 1945 کے پہلے نہیں آخر میں لیگ میں شامل ہوگئے اور کانگریس کو ایک ہندو جماعت کی حیثیت سے پیش کرنا شروع کردیا۔ مختصراً یوں ہے کہ راج کی آخری دہائی میں لیگ اور کانگریس کی سیاست کی باہمی پھوٹ کا سبب دنیاوی علائق سے یکسر خالی مذہبی جوش و خروش نہیں، ہندستانی قوم پرستی کے غالب جذبے سے نکالے جانے کا احساس تھا۔ میں اس بات کا اور اضافہ کرسکتا ہوں کہ ضرورتیں کہ جنھیں سیاسی اظہار ملا وہ ہماری کمیونٹی کی نہیں بلکہ ایک طبقے کی ضرورتیں تھیں جو بڑے اور چھوٹے زمینداروں اور ان وکیلوں، ڈاکٹروں اور سرکاری ملازموں پر مشتمل تھا جو ان زمیندار خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔

"آپ جو کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ جب لیگ کا قافلہ چلا"، پردیپ نے کہا، "تمام دکھی گروپ، عقیدے کے محافظ بن کر اس میں شامل ہوگئے"۔

"ہاں، میں علی گڑھ میں طالب علم تھا۔ ایک بار اپنے والد کے ساتھ، میرس روڈ پر واقع ایک لق و دق کوٹھی میں رہنے والے ایک زمیندار خاندان سے ملنے گیا۔ ابھی ہم نے چائے ختم ہی کی تھی کہ وہاں ایک گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ بحث ہمارے میزبان حامد چچا اور ان کے بھتیجے سلیم کے درمیان تھی۔ سلیم کسی قدر اصرار کے ساتھ کہہ رہے تھے:

> "آخری تجزیے میں آپ کا جس سے مقابلہ ہے وہ بورژازی کی اقتدار کی جدوجہد ہے۔ حقیقتاً یہ کسانوں کی تحریک ہے بھی نہیں مگر جب مال غنیمت کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو طبقاتی مفادات بھی بھلا دیے جاتے ہیں مثلاً چار سو یا تقریباً اتنے ہی تعلقداروں نے اس بات پر اصرار کیا کہ انگریزوں کو چاہیے کہ وہ دوسرے ایک ہزار زمین داروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ نمائندگی دیں"۔

"یہ صرف تعداد کا سوال نہیں ہے"، حامد چچا نے اٹھ کر بیٹھتے اور اپنے پائپ کو انکار میں ہلاتے ہوئے احتجاج کیا۔ "ہم تعلقدار قدیم حقوق اور مراعات کے مالک ہیں جو ہمیں ایک خصوصی چارٹر کے تحت ملی ہیں اور جن کی ہمیں حفاظت کرنا ہے"۔

"ہاں، ہاں، یقیناً۔ روایت کا احترام اور اس کی پاسداری تو ضروری ہے۔ آدمی لڑتا ہے اپنے لیے، اپنے فائدوں کے لیے۔ مگر آپ کسان سے اس کی توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اس لیے آپ سے محبت کرے گا"۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ نام نہاد اصلاحات، زمیندار اور کاشتکار کے درمیان ان کے ذاتی تعلق کے بندھنوں کو تباہ کر رہی ہیں۔ یقیناً ایک حکومت یا اس کے ہر روز بدلتے ہوئے حکام کاشتکاروں کے ساتھ ذاتی تعلق اور روایتی رشتے نہیں رکھ سکتے؟ عوام ہر وقت کس سے رابطے میں ہیں؟ ہمہ وقت ان کا تعلق کس سے ہے؟ اپنے زمینداروں سے یا مقامی سیاسی لیڈروں سے؟"

حکام کو اتنا اقتدار اور اتنی قوت سونپ دیے جانے کے خیال سے اور پھر ایک ایسے وقت میں جبکہ یہ بھی یقینی نہیں کہ سیاسی قوت کس طبقے کے ہاتھ میں آئے گی، زمیندار پریشان اور بے اطمینان ہونے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا ہے؟

سلیم کسی دلیل کی غیر فطری موت کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا، "ابا جان، آپ نے خاتمۂ زمینداری کے خوف کی جو بات کی وہی معاملے کی اصل ہے۔ اپنے وجود کے لیے خطرہ محسوس کرنا ہی ایک ایسی پارٹی کی

تشکیل کا سبب ہے جسے موجودہ صورت حال کو قائم رکھنے میں دلچسپی ہے۔ یہ بات انگریز کو پسند ہے اور بنیادی طور پر ترقی پسند قومی تحریک کے خلاف ہے۔

"الفاظ؟ نظریے! غیرذمہ دارانہ باتیں!" حامد چچا تقریباً چیخ پڑے، "میں جاگیردارانہ نظام کا ایک حصہ ہوں، اور مجھے اس پر فخر ہے، میں اس کے لیے لڑوں گا، یہ میرا ورثہ ہے۔ اور تمھیں یاد دلا دوں کہ تمھارا بھی۔ اور یہ کہ تم اس کے 'رجعت پرست' فوائد سے لطف اندوز ہوتے ہو۔ تم اس کی تباہی کی بات بڑی آسانی سے کرتے ہو مگر خود تمھاری زندگی اس کے وجود کی مرہون منت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہی، صرف یہی ہماری روزی روٹی ہے"۔

"تم نے گفتگو کا ایک ایک لفظ دہرا دیا۔ کمال ہے"، پردیپ نے کہا۔

"ہمایوں کی یادداشت زیادہ اچھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ لیگ میں رقابتوں اور داخلی ناچاقیوں کی گہرائی اور شدت کا ذکر مناسب ہوگا۔ علاقائی گروپ بندیاں، اعلیٰ ذات (شیخ اور سید وغیرہ) اور نیچی ذات (انصاری اور مومن وغیرہ) کے مسلمانوں کے مابین تفرقہ۔ علماء کے درمیان عقائد کے کبھی نہ ختم ہونے والے جھگڑے۔ متعدد جگہوں پر شیعہ سنّی اختلافات غیر معمولی واقعات نہیں تھے۔ کیا تم جانتے ہو کہ خود ہمارے شہر میں تشدد ہوا تھا؟ ہاں ہاں، 39-1938 میں اس شہر کو شیعوں اور سنّیوں کے درمیان شدید فساد کا تجربہ ہوا تھا۔ ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ یہ اختلاف حقیقی ہیں، محض خیالی نہیں۔ ہمیں ان علاقوں کی تلاش و جستجو کرنا چاہیے جہاں ذات اور طبقے کی تقسیم نے اہل اسلام کو بانٹ رکھا ہے۔ ایسی سعی ایک پیچیدہ مظہر کو سمجھنے کے لیے بڑی مفید ہوگی"۔

"اس کے علاوہ"، ہمایوں نے اضافہ کیا، "اگر ہم اپنے لیڈروں سے اور زیادہ اچھی طرح واقف ہوں، اور اُن کے تاریخ کے مطالعے اور مشترک یادوں اور تجربوں

پر سوال کریں تو شاید ہم فیصلوں کی ان غلطیوں کو نہ دہرائیں جن کی وجہ سے ملک کو 14-15 اگست 1947 کو جب گھڑیال نے نصب شب کا اعلان کیا تھا، بڑی قیمت چکانی پڑی تھی۔

میری دوسری یا تیسری بات یہ ہے کہ پاکستان ہر شخص کا خواب نہیں تھا۔ نہ ہی جناح سب کے پیارے تھے۔ سوشلسٹ اور مارکسسٹ، خدائی خدمتگار، دیوبند کے علماء، مومن، شیعہ پولٹیکل کانفرنس سے وابستہ شیعہ اور قومی اور صوبائی سیاست کے حاشیے پر غیر مطمئن زندگی گزارنے والے متعدد مسلمان گروپ، یہ سب ہی تھے جن کے دلوں میں جناح سے تعلق کی کوئی رمق نہیں تھی۔ حاصل کیے ہوئے ووٹوں کی اصلی تعداد کے لحاظ سے اور پاکستان سے توقعات کا جو زبردست تانا بانا تیار کیا گیا تھا اس کے پس منظر میں 1946 کے انتخابات میں کانگریسی مسلمانوں نے خاصی معقول کامیابی حاصل کی تھی شاید کچھ مزید کامیابیاں مل جاتیں اگر کانگریس نے شہری اور دیہی عام حلقہ ہائے انتخابات میں مسلمان امیدوار کھڑے کردیے ہوتے۔ شاید کانگریس کی کارکردگی کچھ تھوڑی اور بہتر بن جاتی اگر وہ اپنے امیدواروں کے انتخاب میں کچھ اور محتاط ہوتی"۔

"پھر مسلمان کانگریسیوں کے نقطۂ نظر کو نظرانداز کیوں کیا گیا؟"

تاریخ میں چیزیں بنانے والوں کے مقابلے میں، فقرے بنانے والے بچ نکلتے ہیں۔ بقول Gore Vidal کسی اچھی بات کو بھلا دینے میں عوامی یادداشت سے زیادہ تیز کوئی نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے بڑے بڑے لوگ بڑی احتیاط سے اپنے کارناموں کے ساتھ اپنی یادگاروں کی تعمیر پر اصرار کرتے ہیں کیونکہ جن لوگوں کی انھوں نے خدمت کی ہے وہ ان کا نہ تو زندگی میں احترام کریں گے اور نہ مرنے کے بعد۔ ہیروز کو اپنی شہرت اور اپنے دوام کا انتظام خود کرنا چاہیے۔ یہ کام کوئی دوسرا نہیں کرے گا۔

"معاف کرنا، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا"، پردیپ نے کہا۔

جنوبی ایشیا کے ایک انگریز مورخ کا مشاہدہ تھا کہ انڈین نیشنلزم کے لیے اپنے آپ کو وقف کردینے والوں کے مقابلے میں تحریک پاکستان کی حمایت کرنے

والے کس طرح زیادہ یاد رکھے گئے۔ اقبال کا سنگِ سرخ کا مقبرہ ایک زیارت گاہ ہے۔ جناح کا سنگ مرمر کا مزار پاکستان کی شناخت کی علامت ہے اور کراچی جانے والے کے لیے حاضری دینے کی پہلی جگہ۔ دوسری طرف مولانا آزاد کو ان کا حق نہیں ملا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ ان کی یاد کو زندہ رکھنے میں اکثر ہندستانی مسلمانوں کی دلچسپی ختم ہوگئی ہو۔ اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ ہندستانی سماج بحیثیت مجموعی، پہلے ہی کی طرح ان کی کوئی قدر نہیں کرے گی۔ اور شاید وہ ان اصولوں سے واقف بھی نہ ہو جن کے لیے انھوں نے جدوجہد کی تھی۔

"لیکن"، پردیپ نے کہا، "آزاد کی علمی قابلیت کا تو پاکستان میں بڑا احترام کیا جاتا ہوگا"۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ نہیں"۔ عزیز نے جواب دیا، "اسی لیے اس بات پر حیرت نہیں ہوتی کہ پاکستان کی تاریخ کی کتابوں میں آزاد کا کوئی ذکر نہیں ہوتا سوائے قائدِ اعظم کے اس نقطۂ نظر کی بازگشت کے جس کے مطابق وہ کانگریس کے ایک نمائشی مسلمان صدر تھے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ آزاد جیسی عظیم شخصیت کا فرد، خود ہمارے اپنے ملک میں فاتحین یعنی موسسین پاکستان کے جواز (rationalization) کے سیلاب میں غرق کردیا گیا۔ اتحاد و یکجہتی کی علامت اور ایک انتہائی بہادر بانکا اور نفیس آدمی، اُس تہذیب کا مکمل نمونہ نہرو طاق نسیاں کی زینت ہے، اور خود ہمارے نیشنلسٹ تذکروں میں معدوم"۔

"واقعی حیرت انگیز صورت حال ہے"، پردیپ نے کسی قدر تاسف کے ساتھ کہا۔

"نہرو کہتے ہیں "آزاد میر کارواں ہیں"، عزیز نے چائے پیتے ہوئے آہستہ سے کہا، "جوکہ وہ نہیں تھے۔ اگرچہ وہ سیاسی ہنگاموں سے بے تعلق نہیں تھے مگر کارگزار سیاسی منتظم نہیں تھے۔ وہ ایک تحریک کے قائد سے زیادہ ایک سوانح نویس کی اپنی حیثیت سے مطمئن تھے۔ وہ سیاست کے گردو غبار سے اٹھی ہوئی وادیوں کی گرد چھان کر عوام کو عمل پر اکسانے والے آدمی نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے گاندھی

جی کی قیادت کی پیروی کی، 32-1930 میں سول نافرمانی کی تحریک میں ان کے لفٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا اور جنگ کے زمانے میں کانگریس کی کشتی کو سیلاب سے صحیح و سلامت نکال لائے۔ برسوں وہ جیل میں رہے۔ جہاں ان کے بعض ساتھیوں کا خیال تھا کہ وہ حیرت انگیز یادداشت اور معلومات کے ایک ہمہ گیر خزانے کے ساتھ ایک غیر معمولی دلچسپ ساتھی تھے۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مولانا اپنی حیثیت اور اپنی ذات سے، ایک نیشنلسٹ پارٹی ہونے کی کانگریس کی آرزوؤں اور اس کے ولولوں کی اہم ترین علامت تھے۔ اسی لیے گاندھی جی کے جناح سے ٹکراؤ میں مرکزی حیثیت ان کے اسی مقام کی تھی اِسی لیے جناح کی ضد تھی کہ صرف کوئی مسلم لیگی ہی مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کر سکتا ہے۔

عزیز اپنی جیب سے ٹشو پیپر نکال کر اسے مروڑتا رہا۔ اس نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی اور پھر بولا، "باردولی ستیہ گرہ کے ہیرو، سردار پٹیل اکثریت واد کی بلندیوں سے بولے بھی اور عمل بھی کیا۔ آزاد ہندو اور مسلمان فرقہ پرستوں کی فائرنگ اور جوابی فائرنگ میں پھنس گئے، ان کے پاس تفوق و برتری کی ایسی کوئی جگہ نہیں تھی، انھیں تو اپنا کردار ناہموار زمین پر اور ناسازگار موسم میں ادا کرنا تھا۔ بسا اوقات خود ان کی پارٹی کے ساتھیوں نے ان کی پہل قدمیوں (initiatives) کی راہ میں روڑے اٹکائے اور ان کی حیثیت کانگریس کے برائے نام صدر کی کر دی۔ مثال کے طور پر، کرپس اور کیبنٹ مشن سے اہم مذاکرات کے دوران۔ دوسری طرف لیگی انھیں مرتد اور غدار کہہ رہے تھے۔ لیکن یہ بزرگ مدبر اور سیاست داں، کانگریس کی میٹنگوں میں خاموش اور جذبات سے عاری بیٹھتا رہا، اور آخر دم تک متحدہ ہندستانی قوم سے اپنی وفاداری کا عہد استوار رکھا اور وقتاً فوقتاً جناح کے دو قومی نظریے کی تردید کرتا رہا۔

"دیکھو"، آواز ذرا اونچی ہوگئی۔ "بنیادی طور پر ایک مفکر اور وحدت دین کے اہم وکیل کی حیثیت سے آزاد نے مذہب، ریاست اور سول سوسائٹی جیسے موضوعات پر بہت غور و خوض کیا۔ سوچ بچار کرنے والے اور تفکر پسند آزاد کے پاس

آب دار تلوار کا سا دماغ تھا جو خیالات و نظریات کی دھند کو چشم زدن میں چھانٹ سکتا تھا (نہرو)۔ کوتاہ عقل و دانش والے ان کے عہد کے لوگوں نے ہندستانی زندگی کے متمول تنوع میں تنازعے دیکھے، کشمکشیں پائیں۔ وہ بہرحال ایک عظیم آدمی تھے۔ انھوں نے اس ساری بوقلمونی کے پیچھے بنیادی وحدت ہی کو نہیں دیکھا بلکہ یہ بھی سمجھا کہ بحیثیت مجموعی ہندستان کے لیے ساری توقعات اسی سے ہیں۔ وہ سرگرم سفر تھے، ان کی نگاہیں ہندستان کے مستقبل پر لگی ہوئی تھیں جس کی تشکیل موجودہ ہمہ فرقہ تانے بانے کی بنیاد پر ہوتی تھی۔ ان کا نامکمل ترجمان القرآن بین عقائد اور مفاہمت کا بلاشبہ عمیق ترین بیان ہے۔ 1940 میں دیا ہوا ان کا سیاسی بیان سیکولر قوم پرستی کے نظریے کا بڑا توانا خلاصہ ہے۔

جگ موہن کسی قدر بے صبری سے دیکھ رہا تھا اور عزیز کی گفتگو جاری تھی۔ ایک ایسے علاقے کے لیے جو تقسیم کے عذاب سے گزرا تھا۔ آزاد کی زندگی دکھاتی ہے کہ جدوجہد آزادی کے دوران ایسے لوگ تھے جنھوں نے بلند ترین سیکولر مقاصد کے لیے کام کیا۔ اس علاقے کے لیے جہاں مذہبی ناروداری نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، آزاد کی زندگی یہ بتاتی ہے کہ ایک بہترین مذہبی ادراک نجی اور عوامی زندگی میں کس طرح ایک فراخ دلانہ اور انسانی نقطۂ نظر کی بنیاد ڈالتا ہے۔ یہی کچھ اسباب ہیں جن کے پیش نظر ان کی زندگی کا حق ہے، خالص علمی دائرے سے نکل کر اس کی واقفیت اور اس کا مطالعہ"۔

"یہ خاصا ادراکی جائزہ ہے"، پردیپ نے اظہار خیال کیا، "مگر آپ نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ آزاد جیسا آدمی ہم سے دیدہ و دانستہ نظرانداز کیوں ہوا۔ اس کی وجہ کہیں یہ تو نہیں ہے کہ ہمارے پاس ابھی تک اس شخص کی تاریخی اعتبار سے حساس اور گہرائی سے تحقیق کی ہوئی سوانح نہیں ہے؟"

اسی کے ساتھ، اسلام اور قوم پرستی، نام نہاد کٹر مسلم زاویہ نگاہ کے بارے میں بعض غلط اور بے بنیاد مفروضات ہیں۔

"بات کیا ہے؟" پردیپ نے خود اپنے شبہات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں جنوبی ایشیائی مسلمانوں سے متعلق ایک کہانی سنانے کی ضرورت ہے، خود ان کے لیے اور ہر اس شخص کے لیے جو اسے سن سکتا ہو"۔

"اور آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں"، پردیپ بیچ میں بول پڑا، "وہ یہ ہے کہ تاریخ یورپی شرقیت (Orientalism) اور ہندستانی سیاست کے ترکے سے پہلے ہی نامعتبر (marginalised) ہو چکی ہے"۔

"بالکل! ہم میں سے اکثر کو مسلمانوں کو ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اُس بے توجہی کو ختم کرنے کی جسے مورخ "بہت کم" (Too little) کہتے ہیں اور ہم میں سے اکثر کو ضرورت ہے ایک ایسی تاریخ کی تدوین کی جو اسلام کو روایتی سوچ سے قبل "بہت زیادہ" کہتی ہے۔ مزید یہ کہ اختلافات پیدا کرنے کی بجائے ہمیں ضرورت ہے مشترکہ سماجی اور سیاسی ڈھانچوں کی حصاربندی کی، اور مواقع اور مشکلات، تحریصات اور تمام دوسرے لوگوں سے مماثل ذوق اور عادتوں کی پیچیدہ دنیا میں مسلمانوں کو رکھنے کی"۔

یہ سب تو بالکل ٹھیک ہے عزیز بھائی"، جگ موہن نے کہا، "مگر آپ نے کانگریسی مسلمانوں کا قصہ تو ختم نہیں کیا"۔

"جائزہ جیسا کچھ جائزہ بھی نہیں"، عزیز نے میز پر اپنی ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی"، جگ موہن جواب لینے پر مصر۔

"ٹھیک ہے"، عزیز نے کہا، "مذہبی اور سیاسی راسخ العقیدگیوں نے کانگریسی مسلمانوں کو کمزور اور بے اثر بنا کر پیش کیا۔ اسی لیے امپریل، سیکولر اور کمیونل تاریخوں میں ان کے نقطۂ نظر پر توجہ نہیں دی گئی۔ ہم مسلمانوں اور اسلام کو بُرا کہنے والوں اور کٹر ہندو فرقہ پرستوں کے جشن مناتے ہیں، ان کے گُن گاتے ہیں مگر

بدرالدین طیب جی کی نسل سے لے کر رفیع صاحب کی نسل تک کے سیکولر اور روشن خیال مسلمانوں کو راندۂ درگاہ کر کے انھیں مورخ کے فُٹ نوٹ میں ڈل دیتے ہیں۔ میں برسوں سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ نیشنلزم، کمیونلزم اور پارٹیشن کی تاریخیں دوبارہ لکھنے کے لیے حاشیے پر درج اِن مسلم صداؤں پر کان دھرے جانے چاہئیں۔

"علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ کو راہ دکھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ جامعہ جو نیشنلسٹ فکر کا گہوارہ رہی ہے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" جگ موہن نے کہا۔

"اس بات کو یہیں چھوڑ دیا جائے۔ عزیز بھائی کو کیوں مشکل میں ڈالیں۔

"بات یہ ہے کہ تقسیم کے نتیجے میں کی جانے والی نقشے کی کانٹ چھانٹ اور سیاسی حصے بخروں کو ہمیں رد کرنا چاہیے۔ قومی سرحدیں سیاسی تعمیریں تھیں، علاقائی قوت و اقتدار کے تخیلی مظہر۔ اگرچہ وہ نظر فریبانہ طور پر واضح شکل میں ظاہر ہوئیں، لیکن وہ کم از کم ابتدا میں سیاستدانوں، وکیلوں اور دانش وروں کی محض ذہنی شبیہیں تھیں۔ ان کے عملی عواقب، مختلف علاقوں میں اور مختلف طبقات کے لیے مختلف ہوئے۔ پہلے اقدام کے طور پر حکومت مرکز (state-centred) علمی تاریخ نویسی سے انھیں الگ کیا جانا چاہیے"۔

"آپ کا مطلب کیا ہے؟" جگ موہن نے پوچھا۔

"عزیز نے بہ آواز بلند کہا، "کوئی مضائقہ نہیں ہے — ٹھیک ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگرچہ ٹرینیں لوگوں کو ان کی نام نہاد پرامن اور محفوظ جنتوں کی طرف لے جا رہی تھیں، مگر ان ٹرینوں میں بیٹھے ہوئے اکثر لوگ اس سلسلے میں واضح نہیں تھے کہ لاہور ہندستان کا حصہ ہوگا یا پاکستان کا۔ یا دہلی گاندھی کے ہندستان میں رہے گی یا جناح کے کرمِ خوردہ پاکستان میں"۔

"مجھے بڑی خوشی ہے کہ آپ یہ کہتے ہیں"، ہمایوں نے دلیل کی مضبوطی کو تسلیم کرتے ہوئے کہا، "شہریار نے مجھے بتایا کہ ایک اردو ادیب نے اپنی ایک کہانی میں، تعمیر ملک و قوم کے ابہام کے ایک استعارے کی حیثیت سے سرحدوں کے کردار

کی بوالعجبیوں اور ان کے قولِ محال ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہانی یوں ہے :

"1947 کے کچھ جوتشیوں نے ستاروں کی گردش کو کچھ اس سائنٹفک انداز سے گھمایا کہ پاکستان اور ہندستان کی سرحد ایک نہیں بلکہ دو ہوکر رہ گئیں۔ دراصل یہ "دو" لفظ گزشتہ کئی سالوں سے جیوتشیوں کے دماغوں میں کچھ ایسی اوٹ پٹانگ سی کھلبلی مچا رہا ہے کہ نہ تو ستاروں کی گردش متوازن رہتی ہے نہ زائچے ٹھیک اترتے ہیں۔ "دو" کی بوکھلاہٹ اور "ایک" سے دشمنی کی زد میں انھیں اتنا بھی احساس نہیں رہتا کہ دو کے ذریعے جس نئی اکائی کی تخلیق کر رہے ہیں وہ بذاتِ خود دو کی منفی شکل ہے"۔

(فکر تونسوی، 'واہگہ کی نہر'، مکتبہ شاہ راہ، دہلی، صفحہ 59-58)

☆☆☆☆☆

"واہگے کی سرحد پر سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت دھرم اور مذہب کی دکانیں تھیں۔ ایک داڑھی والے مولوی صاحب اپنے سامنے کتابوں کا ایک ڈھیر رکھے بیٹھے تھے جس میں وید، شاستر، گرنتھ، گیتا، اُپنشد اور کتنی ہی دوسری سنسکرت اور ہندی کی کتابیں شامل تھیں۔ اس مولوی صاحب کے بالکل پہلو میں ایک سکھ سردار نے بھی کتابوں کی ایک دکان جما رکھی تھی جس میں قرآن مجید، فقہ، حدیث، تفسیر اور عربی کی دوسری کتابیں تھیں۔ یہ کتابیں خرید کر نہیں لوٹ کر لائی گئی تھیں، اگر لوٹ کر نہ لائی گئی ہوتیں تو سکھ سردار اور مولوی دونوں آپس میں لڑ پڑتے مگر وہ لڑنے کی بجائے کتابیں بیچ رہے تھے۔ مسلمان مولوی ہندو سکھوں کے دھرم

کو اور سردار مسلمانوں کے دھرم کو بیچ رہا تھا اور دونوں دل ہی دل میں سوچ رہے تھے کہ اگر یہ ساری کتابیں بک گئیں تو وہ چند مہینے آرام سے روٹی کھا سکیں گے۔ دھرم بیچ کر اگر بھرپیٹ روٹی مل جاتی ہے تو اس سے بہتر جنس اور کیا ہوسکتی ہے"۔

(فکر تونسوی ساتواں شاستر، واہگہ کی نہر، صفحہ 62-63)

☆☆☆☆☆

"میں نے چپکے سے اس فوجی پہرے دار سے پوچھا، کیوں سنتری جی، وہ جو واہگہ کی نہر کے کنارے پر درمیان میں ایک نیم کا درخت اگا ہوا تھا، اس کا کیا ہوا؟ کیا اسے کاٹ کر پھینک دیا گیا؟

سنتری نے سنگین تان کر میری طرف گھورا اور کہا، "تم کون ہوتے ہو جی، حکومتوں کے کام میں دخل دینے والے؟"

اور میں نے دل ہی دل میں کہا، ارے بابا میں بھی تو اس درخت ہی کی ایک شاخ ہوں"۔

(فکر تونسوی، ساتواں شاستر، واہگہ کی نہر، صفحہ 66)

"میں تمھیں بتاؤں ہمایوں"، عزیز نے کہا، "کہ اردو ادب کا "شریر بچہ"، سعادت حسن منٹو نے حکومت مرکز قومی تاریخوں اور سرحدوں کی تعیین پر سوال کیا تھا۔ اس کے کردار، نفرت کی سیاست کی شکار نسلوں کے گومگو کے عالم اور ان کی پریشانیوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ وہ ہمیں کس بات کی یاد دلاتے ہیں؟ اکثر لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی قسمتوں کا فیصلہ ماؤنٹ بیٹن کی تین دن کی ڈپلومیسی کرے گی، انھیں یہ نہیں معلوم تھا کہ موسم گرما کی ایک تپتی ہوئی دوپہر میں Cyrill

Radcliffe نام کا ایک شخص سرزمین ہند پر نازل ہوگا اور محض سات ہفتوں میں سرحدوں کا فیصلہ کردے گا"۔

"یقیناً"، پردیپ نے اظہار خیال کیا، "متعدد تخلیقی ادیبوں نے اپریل پالیسیوں کے بے درد عواقب کی تصویر کشی کی ہے۔ پنجابی اور بنگالی زبانوں میں بھی تقسیم سے متعلق بہت اچھی کہانیاں ہونی چاہئیں"۔

"ہاں، ہاں۔ یقیناً"، ہمایوں نے جواب دیا۔ زمین کی تراش خراش آسان نہیں ہوتی۔ ہندستان کو ایک ماہر اور حساس سرجن کی ضرورت تھی۔ مگر، گھریلو مسائل میں ڈوبے ہوئے برطانیہ نے جلدی جلدی اور انتہائی لاپرواہی سے اس کی کاٹ پیٹ کردی۔ وہ شعوری طور پر شرپسند نہیں تھے۔ ظالمانہ حد تک لاپرواہ تھے۔ دس لاکھ ہندستانی جاں بحق ہوئے۔ زمین نے اپنی نئی پھوہڑ سرحدیں، خون میں ڈبو دیں۔ شہروں شہروں، کھیتوں کھیتوں، سرحدوں کا تعیّن ہوگیا۔ ٹرینیں رات کے اندھیرے میں پناہ گزینوں کو لاتی اور لے جاتی ہیں۔ ہندو ایک طرف جاتے ہوئے اور مسلمان دوسری طرف رواں دواں۔ تباہی کے در پے اپنوں سے بچنے کے لیے یہ لوگ عجیب عجیب اوقات میں روانہ ہوتے۔ مگر اس کے باوجود ٹرینیں روکی جاتیں، چھاپے پڑتے، مال و اسباب لٹتا اور جان بچا کر بھاگتے ہوئے مسافر ذبح کردیے جاتے"۔

"بڑی موثر عبارت ہے"، پردیپ نے رائے ظاہر کی۔ "مگر عزیز بھائی، منٹو اور اس کی کہانی "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے، بتائیے۔

عزیز تھکا ہوا لگ رہا تھا۔

ایک نکتہ جس کے گرد گھومنے کا مورخین کا جی چاہتا ہے۔ ....
بہرحال کہانی کا ایک اقتباس ہے سنو۔ اس نے دھیرے دھیرے بڑی جذباتی آواز میں کہانی پڑھنا شروع کی۔

> "بٹوارے کے دو تین سال بعد پاکستان اور ہندستان کی
> حکومتوں کو خیال آیا کہ اخلاقی قیدیوں کی طرح پاگلوں کا بھی

تبادلہ ہونا چاہیے، یعنی جو مسلمان پاگل ہندستان کے پاگل خانوں میں ہیں، انھیں پاکستان پہنچا دیا جائے اور جو ہندو اور سکھ پاکستان کے پاگل خانوں میں ہیں انھیں ہندستان کے حوالے کردیا جائے..........."

"......... تبادلے کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں، ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر آنے والے پاگلوں کی فہرستیں پہنچ گئی تھیں اور تبادلے کا دن بھی مقرر ہوگیا۔ سخت سردیاں تھیں۔ جب لاہور کے پاگل خانوں سے ہندو اور سکھ پاگلوں سے بھری ہوئی لاریاں پولس کے محافظ دستے کے ساتھ، روانہ ہوئیں، متعلقہ افسر بھی ہمراہ تھے۔ واہگہ کے بارڈر پر طرفین کے سپرنٹنڈنٹ ایک دوسرے سے ملے اور ابتدائی کارروائی ختم ہونے کے بعد تبادلہ شروع ہوگیا جو رات بھر جاری رہا.........."

"......... جب بشن سنگھ کی باری آئی اور واہگہ کے اس پار متعلقہ افسر اس کا نام رجسٹر میں درج کرنے لگا تو اس نے پوچھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ہندستان میں؟" متعلقہ افسر ہنسا، "پاکستان میں"۔

"یہ سن کر بشن سنگھ اچھل کر ایک طرف ہٹا اور دوڑ کر اپنے باقی ماندہ ساتھیوں کے پاس پہنچ گیا۔ پاکستانی سپاہیوں نے اسے پکڑ لیا اور دوسری طرف لے جانے لگے۔ مگر اس نے چلنے سے انکار کردیا، "ٹوبہ ٹیک سنگھ یہاں ہے — اور زور زور سے چلانے لگا..........."۔

"اسے بہت سمجھایا گیا کہ دیکھو اب ٹوبہ ٹیک سنگھ ہندستان میں چلا گیا ہے۔ اگر نہیں گیا تو اسے فوراً وہاں بھیج دیا جائے

گا، مگر وہ نہ مانا۔ جب اس کو زبردستی دوسری طرف لے جانے کی کوشش کی گئی تو وہ درمیان میں ایک جگہ اس انداز میں اپنی سوجی ہوئی ٹانگوں پر کھڑا ہوگیا جیسے اب اُسے کوئی طاقت وہاں سے نہیں ہلا سکے گی۔

آدمی چوں کہ بے ضرر تھا اس لیے اس سے مزید زبردستی نہ کی گئی، اس کو وہیں کھڑا رہنے دیا گیا اور تبادلے کا کام ہوتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ساکت و صامت بشن سنگھ کے حلق سے ایک فلک شگاف چیخ نکلی — اِدھر اُدھر سے کئی افسر دوڑے ہوئے آئے اور دیکھا کہ وہ آدمی جو پندرہ برس تک دن رات اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہا، اوندھے منہ لیٹا تھا۔ اِدھر خاردار تاروں کے پیچھے ہندستان تھا — اُدھر ویسے ہی تاروں کے پیچھے پاکستان — درمیان میں زمین کے اس ٹکڑے پر جس کا کوئی نام نہیں تھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ پڑا تھا"۔

(سعادت حسن منٹو، ٹوبہ ٹیک سنگھ)

پردیپ مبہوت تھا۔ "شکریہ عزیز بھائی، زبردست کہانی ہے"۔

میرے پیارے، یہی بس نہیں ہے۔ متعدد تخلیقی ادیبوں نے خون آلودہ آزادی کے قصے سنائے ہیں۔ یہ کہانیاں تارکینِ وطن کے مصائب، زخمیوں کی دل خراش آہوں بٹے ہوئے خاندانوں کے مصائب اور ان لوگوں کے روح فرسا تجربات کو بیان کیا ہے جن کو ٹرین کا سفر، ان کے خوابوں کی تعبیر کی طرف لے تو ضرور گیا مگر ان میں سے کوئی مرد، کوئی عورت، کوئی بچہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے زندہ نہ رہ سکا۔ کچھ آدمیوں نے ہوش ربا سکوت سے ان عورتوں کی اَن کہی کہانیاں ڈھونڈ نکالیں جو مر گئیں مگر ان کے نام تک ان کے بدبخت لیڈروں کے لبوں پر نہ آئے۔ کچھ ہیں جنھیں ٹرین کی تاریک راتیں اور موت اور تباہی کے وہ مناظر جو پارٹیشن کے ساتھ سامنے آئے تھے اچھی طرح یاد ہیں اور جیسے مناظر وارث شاہ نے اٹھارہویں

صدی کے آخر میں پنجاب میں دیکھے تھے، ہر چہار طرف۔ ایک ادیب لکھتا ہے، "بڑے بڑے شہروں میں وہ آگ لگی تھی کہ بچنیا اور صغیر فاطمہ اس میں پھنسے تو یوں جل گئے جیسے دہکتے شعلوں میں خس و خاشاک۔ پلک جھپکنے میں وہ راکھ ہو چکے تھے...... اب انارکلی (مغل شہزادے سلیم کی محبوبہ جو بادشاہ کے حکم سے بڑی بے دردی سے ماری گئی تھی کے نام پر لاہور کا ایک بازار) کا نام صغیر فاطمہ یا رجنی کور یا ٹلنی بینرجی ہو گیا تھا۔ انارکلی کی لاش کھیتوں میں تھی، سڑکوں پر تھی، مسجدوں اور مندروں میں تھی اور اس کے ننگے جسم پر ناخنوں اور دانتوں کے نشان تھے۔ مَردوں نے پھٹی قمیضوں، نچی ہوئی شلواروں، پھٹی ہوئی ساڑیوں کے خون آلود چیتھڑے بڑی احتیاط سے جمع کیے اور یادگار کے طور پر صندوقوں میں رکھ لیے"۔

اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے پردیپ نے کہا، "آپ جو کہہ رہے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادبی تحریریں، ایک ناقابل بیان، غیرواضح اور دھندلی تاریخ کی فصیح و بلیغ شاہد ہوتی ہیں۔ آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ معصوموں کے کرب اور ان کے مصائب کو پیش کرکے ادب، بین کمیونٹی تعلقات پر ایک متبادل مکالمے کے لیے ایک خاکہ فراہم کرتا ہے"۔

"بالکل"، عزیز اپنی کرسی میں لیٹ سا گیا، "ابھی تک، عام مردوں اور عورتوں کے تجربات سرسری اقوال میں اور ان جانے متنوں کے انبار میں دفن ہیں"۔

عزیز، دوستوں کے درمیان بات سمجھنے اور سمجھانے کا جو سلسلہ بن گیا تھا اس پر خوش تھا، "پردیپ تم اسے ٹھیک سمجھے ہو، لیکن پھر بھی منٹو کے ادبی بیل بوٹوں میں سے تین چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو سنا کر مجھے اپنی بات کی مزید وضاحت کرنے کی اجازت دو۔ مجموعے کا نام ہے 'سیاہ حاشیے' "

صدقے اس کے

مجرا ختم ہوا، تماشائی رخصت ہوگئے تو استاد جی نے کہا "سب کچھ لٹا پٹا کر یہاں آئے تھے، لیکن اللہ میاں نے چند دنوں ہی میں وارے نیارے کردیے"۔

"دیکھو یار تم نے بلیک مارکیٹ کے دام بھی لیے اور ایسا ردی پٹرول بھی دیا کہ ایک دکان بھی نہ جلی"۔

خبردار

"بلوائی مالک مکان کو بڑی مشکلوں سے گھسیٹ کر باہر لے آئے۔ کپڑے جھاڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بلوائیوں سے کہنے لگا، تم مجھے مار ڈالو لیکن خبردار جو میرے روپے پیسے کو ہاتھ لگایا"۔

"یہاں سے اب ہم کدھر جائیں گے؟"، پردیپ نے سنجیدگی سے سوال کیا، "کیا لوگوں کو ذات اور کمیونٹی کی بنیاد پر اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے اور اپنے حق بجانب مطالبات کے لیے اجتماعی طور پر لڑنا چاہیے؟ یا پھر وہ عنایات سے محروم اور عنایات سے بہرہ ور کی بنیاد پر جدوجہد کریں۔ ذاتی طور پر میں دوسرے لائحہ عمل کو صحیح سمجھتا ہوں۔ کیونکہ یہ ذات اور کمیونٹی سے وفاداریوں کی گرفت کو ڈھیلا کرتا ہے اور ہماری پالیسی کے اجتماعی کردار کو مضبوط بناتا ہے"۔

"ایسا لگتا ہے کہ ابھی ہمیں بہت دور جانا ہے"، جگ موہن نے اضافہ کیا۔ صحیح ہے، فسادات کے قصے ختم ہو چکے ہیں، زندگی کی داستانیں شروع ہو گئی ہیں اور زندگی کی داستان تو کبھی ختم بھی نہیں ہوتی۔

پردیپ نے عزیز بھائی کے تجزیے میں یاد ماضی کا پرتو دیکھا۔ زیاں اور مایوسی کے احساس کا پرتو۔

"عزیز بھائی، پاکستان ایک حقیقت ہے۔ تاریخ کی ایک ناقابل تنسیخ حقیقت۔ پھر بات کیوں اتنے مایوس کن اور المناک ڈھنگ سے ختم ہو؟ یقیناً پاکستان میں آپ کے اس درد میں اور ماضی کی اس یاد میں کوئی شریک نہیں ہے"۔

"ٹھیک ہے"، عزیز نے جواب دیا۔ "لاہور اور اسلام آباد میں تقسیم کا مطلب وہ نہیں ہے جو دہلی، لکھنؤ اور کلکتے میں ہم جیسے چند لوگوں کے لیے ہے، سمجھ میں آنے والے اسباب ہیں جن کی وجہ سے اس پر ایک عظیم المیے کی طرح ماتم نہیں ہوتا لیکن اسلامی نیشنلزم کی ایک حیرت انگیز فتح سمجھ کر جشن منایا جاتا ہے۔ بہرحال، مغربی پنجاب کے زرخیز اضلاع میں رہنے والے لوگ یا سنگلاخ سرحدی علاقوں کے باشندے ہندستان کے نحیف و ناتواں اتحاد کا سوگ آخر کیوں منائیں؟ یا ایک مشترکہ تہذیبی اور ذہنی وراثت کے زوال پر اظہار افسوس کیوں کریں؟"

"ہاں"، پردیپ نے کچھ توقف کے بعد عزیز کے مہاجروں سے متعلق پہلے دیے ہوئے بیان سے سلسلہ جوڑا۔ "مہاجر جو ہندستان میں اپنی دوستیوں اور رشتوں کو، گزشتہ یادوں، پرستوں کی یادگاروں کو یاد کرتے ہیں، لکھنؤ اور دہلی سے اپنے ذہنی اور ثقافتی رابطوں کو ڈھونڈھتے ہیں اور منٹو، احمد علی اور جوش ملیح آبادی کی تحریروں میں ایک عہد گزشتہ کی یادوں کو تازہ کرتے ہیں۔ Nostalgia "یادماضی" عزیز نے بزرگوں جیسی سنجیدگی سے جواب دیا۔ یاد ایک ایسے وطن کی جو پہلے ہی سے تصوراتی بن چکا ہے، یا لکھنؤ کے بڑے امام باڑے سے تعلق کی یا اجمیر کے خواجہ معین الدین چشتی سے عقیدت کی۔ یہ سب یادیں یہ سب رشتے وقت کے ساتھ مدھم پڑتے جائیں گے۔ لال قلعے کے سامنے عظمت و شکوہ کے ساتھ کھڑی ہوئی جامع مسجد، ہندستان کے سیکولر خواب کی علامت، اقبال کی مترنم نظم کے موضوع مسجد قرطبہ کی طرح دور ہوتی جائے گی دھندلی ہوتی جائے گی۔ لکھنؤ میں امین آباد، پرانی دہلی میں بلی ماران ان لوگوں کے تصور سے بھی دور ہوجائیں گے جو ایک مختلف سماجی ماحول اور ثقافتی فضا سے مانوس ہوچکے ہوں گے۔ میں، کہہ یہ رہا ہوں کہ ہم بہرحال آج بھی ایسے واقعے کی تاریخ کو ازسرنو لکھنے کے مشترک حوالے ڈھونڈھ سکتے ہیں جنھوں نے برصغیر میں ریاست اور سماج کے بہت سے پہلوؤں پر اپنا سایہ ڈالا ہے۔ میں یہ بھی کہہ رہا ہوں کہ لوگوں کے لیے حکومت سے زیادہ یہ سوچنا اب بھی ممکن ہے کہ کیسے اور کیوں ایک نسل، مذہبی تعصب، عدم برداشت اور فرقہ بندی کی گولہ باری اور جوابی گولہ

باری میں پھنس گئی"۔

"کیوں پہل کیوں نہیں کردیتے؟"، پردیپ نے تجویز پیش کی۔

"مجھے کرنی چاہیے، مجھے کرنی چاہیے"، عزیز نے اپنی ہتھیلیاں کتابوں پر رکھ دیں۔ "مگر آغازکار میں پہل کرنے کے لیے ہمیں ہندستانی سماج کے syncretic اور مشترکہ رخوں اور سمتوں سے متعلق پرانے نظریات پرازسرِنو نظر ڈالنا ہوگی اور ان مشترکہ اقدار و روایات کو یکجا کرنا ہوگا جنھوں نے صدیوں تک مختلف کمیونٹیز کو ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لائق بنا دیا۔ ان نیشنلسٹ مورخین کی باتوں میں بہہ نہ جانا جو کلونیل عہد سے قبل ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی بڑی خوبصورت تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ہی براہ کرم یہ بھی نہ بھولنا کہ مذہبی کمیونٹیز نے خود اپنی روزمرہ کی زندگیوں میں مذہبی رواداری اور pluralism کو کتنی اہمیت دی"۔

پردیپ کو اس بات کا یقین کامل نہیں تھا کہ اتنی محنت و مشقت سے کچھ حاصل بھی ہوگا۔ اس نے اپنے شکوک ظاہر کیے۔ یہ سب ہمیں پہنچائے گا کہاں؟ مجھے شبہ ہے کہ کچھ بہت حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

"اگر کچھ بھی ہاتھ نہ آئے"، عزیز نے کسی قدر جھجکتے ہوئے کہا، "تب بھی اُن فرضی نظریات کو تو تلف کر ہی سکتے ہیں جنھوں نے برطانوی کلونیل ازم کو احترام بخشا۔ بہرحال، یہ جس لائق بھی ہو، ہم کم از کم اسلامسٹ اور ہندوتوا کے مسخ شدہ عالمی نقطہ نظر کے لیے صحت مند پیمانے تو فراہم کر ہی سکتے ہیں۔ میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اسلامسٹ اور ہندو قوم پرستوں نے عام آدمی کے ذہن میں بڑی الجھنیں پیدا کردی ہیں۔ میں اس بات کا بھی اعادہ کر رہا ہوں کہ انھوں نے ملک اور سول سوسائٹی کو بھی بے حساب نقصان پہنچایا ہے۔ میری باتوں سے نکلنے والے نتائج مختلف ہوں گے مگر پھر بھی ہمیں ہندستان اور پاکستان کی آبادی کے بڑے حصوں کے درمیان مفادات کی یکسانی پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ فرقہ پرستی نے ہمارے سماج میں اپنی جڑیں بڑی گہری پیوست کرلی ہیں۔ پڑوسی پاکستان

میں بھی صورت حال کچھ بہتر نہیں ہے جہاں دھڑے بند (sectarian) علاقائی اور لسانی جھگڑوں نے، مسلم اخوت و یکجہتی کے خیالی نظریات سے بندھے ہوئے منصوبوں کی پول کھول دی ہے"

"ہم بے بس ہیں"، جگ موہن نے مایوسی سے اپنے ہاتھ ہوا میں لہرائے، "بدقسمتی یہ ہے کہ ہم آپ کے ورلڈ ویو کو فروغ دینے کی حیثیت میں نہیں ہیں"۔

عزیز نے جگ موہن پر ایک محتاط نظر ڈالی۔ "ہوسکتا ہے کہ میری آواز صدا بہ صحرا ہو"۔

"مہربانی کرکے ایسی بات نہ کہیے"، جگ موہن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے"، عزیز نے بوجھل آواز میں کہا، "ہماری جمہوریت میں ایک امید کی کرن ہے۔ اگر تم جمہوری عمل کو شطرنج کے کھیل کی طرح دیکھو تو شہہ سے پہلے ایک کے بعد ایک بے شمار چالیں ہیں۔ اگر تم تین چالوں میں مات نہیں دیتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بازی زچ ہوگئی"۔

"میں ایک آخری درخواست کروں گا"، پردیپ نے کہا، "آپ نے بہت باتیں کی ہیں، بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے مگر میں چاہوں گا کہ آپ گاندھی اور جناح کے ایک مختصر موازنے پر اپنی بات ختم کریں"۔

"یہ ناممکن ہے"، عزیز نے پرزور طریقے پر کہا، "تمام دوسری چیزیں ایک طرف، ایسا کرنے کے لیے میرے پاس ذہنی وسائل نہیں ہیں"۔

اس کے دوست بہرحال اسے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ بڑی خوشامد کے بعد عزیز بہرحال مان گیا۔ گاندھی کے چھوڑے ہوئے ترکے سے شروع کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ یہ کس طرح ان لوگوں کے دلوں میں جاگزیں رہا جن کی انھوں نے اتنی لگن سے خدمت کی تھی۔ "جب ہندستان نے ان کی باتوں پر کان دھرے"۔ بریلس فورڈ نے لکھا تھا، "تو اسے خود اپنی آواز سنائی دینے لگی"۔

عزیز نے گاندھی کے ملک اور سماج کے تصور کی بات کی، اخلاقیات اور عدم تشدد پر ان کے اصرار، ان کے تیز اور وجدانی دماغ، واضح طور پر طے کیے ہوئے مقاصد اور صاف طور پر متعین کی ہوئی منازل کے حصول کے لیے اپنے وسائل کو مجتمع کر لینے کی ان کی صلاحیت کا تذکرہ کیا۔ وہ نئی نئی راہیں نکالنے والے تھے اور متنوع سیاسی اور فلسفیانہ روایات کو ہم آہنگ کرنے والے تھے۔ ان کا سیاسی نظریہ انوکھے تجربات کی سرزمین میں پروان چڑھتا تھا اور دیسی فلسفیانہ لفظیات سے اسے اظہار کا پیکر ملتا تھا۔ مہاتما کو اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ درد، تشویش اور مادی نقصان جو ان کی جدوجہد اپنے ساتھ لائی تھی، مادی فائدوں کے لحاظ سے ان کے ذہن میں بہت کم ٹھہرے۔ یہ سب، جیسا کہ وہ کہتے تھے آزادی کے لیے کی جانے والی تیاریاں تھیں۔ جو قوم غلامی سے انکار کرتی ہے، اور تشدد کے بغیر کرتی ہے وہ اپنی روح میں آزادی کو حاصل کرلیتی ہے۔ یہ اُس بدیسی راج پر غلامانہ رضامندی سے ہونے والی تحقیر تھی جس راج کے خلاف انھوں نے بغاوت کی۔ ان کے طریقہ کار اس طرح بنائے گئے تھے کہ وہ برطانوی حکومت کے جاری رہنے کو ناممکن بنادیں۔ یہی نہیں بلکہ ان طریقوں کا مقصد احترامِ نفس میں ہندستان کے عوام کی تربیت کرنا بھی تھا۔ یہ طریقے اسی لیے مختلف اقدامات پر مشتمل تھے، ہر قدم پہلے قدم سے مشکل مگر پہلے سے یقیناً زیادہ موثر۔

گاندھی کی زندگی کو توانائی ملتی تھی ایک مذہبی وژن سے جس نے ان کے اندر خوش امیدی کا ایک دائمی احساس پیدا کیا اور ایسے معاملات میں بولنے اور عمل کرنے پر اکسایا جو ہماری اس صدی میں نوع انسانی کے لیے اہم ثابت ہوئے۔ مگر اسی کے ساتھ، ہر کسی نے نہ تو ان کے وژن سے اتفاق کیا اور نہ ہی ان کی سیاسی حکمت عملی کی تائید کی۔ دائیں اور بائیں دونوں طرف سے اختلاف کی زوردار آوازیں اٹھیں۔ خلافت کے مسئلے پر ان کی دلچسپی، ان کے بہت سے ساتھیوں کو پسند نہیں آئی، اسی طرح عدم تعاون کی تحریک کی منسوخی کا اُن کا فیصلہ بھی بلاشبہ ایک غیر مقبول فیصلہ تھا۔ سول نافرمانی کے شباب کے وقت اِروِن سے ان کے مذاکرات سے کانگریس کے

عام کارکنوں میں کافی تلخی پیدا ہوئی۔ اگرچہ سوراج پارٹی کے قیام سے اتفاق کر کے انھوں نے کھوئی ہوئی کچھ ساکھ یقیناً واپس لے لی۔ بائیں بازو والوں نے ان کی انفرادی ستیہ گرہ مہموں کو اس بنیاد پر ہدف بنایا کہ حالات برطانوی اقتدار پر انقلابی حملے کے لیے نہایت سازگار تھے نہ کہ محض انفرادی سول نافرمانی کے لیے۔ آخر میں جے پی جیسے لوگوں نے 'ہندستان چھوڑو' تحریک کی مخالفت اس لیے کی کہ کانگریسی لیڈرشپ میں اسے انقلاب تک لے جانے کے عزم میں کمی تھی۔

عزیز کا اصرار تھا کہ جناح ایک اختلافی آدمی تھے۔ لیکن ان کے رول کی تاویل انڈین نیشنلزم کی ممتاز بلندیوں سے کی جانی چاہیے اور انھیں ہندستان کی تقسیم کا واحد ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جانا چاہیے۔ متحدہ ہندستان کی موت کے پروانے پر دستخط کرنے میں کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے بعض کھلاڑیوں کا بھی خاصا ہاتھ تھا۔ جس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ یہ ہے کہ جناح، گاندھی کی رہنمائی میں چلنے والی تحریکوں کے لیے ناموزوں تھے اور نہرو کی سوشلسٹ باتوں سے متنفر۔ وہ ایک اعلیٰ درجے کے قانون داں تھے، جسے برطانوی پارلیمانی ڈیموکریسی کی روایات قانون کے نازک نکات اور آئینی طریقہ کار پر بحث میں لطف آتا تھا۔

ہوم رول لیگ اور چیمبرس آف دی سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں بڑی اپنائیت محسوس کرتے تھے جہاں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے شاندار مظاہرے کیے تھے۔ انھیں دھول بھری راہوں سے ان گاؤں سے دور رہنا اچھا لگتا تھا جہاں لاکھوں کروڑوں بھوکے، کچلے ہوئے اور جسمانی طور پر کمزور و ناتوان کسان رہتے تھے۔ اور انھیں ان برطانوی جیلوں سے بھی دور رہنا اچھا لگتا تھا جہاں ان کے ہزاروں ہم وطن کلونیل حکومت کی نافرمانیوں کے جرم میں اسیر تھے۔ انھیں اقتدار کی تام جھام سے لطف تو آتا تھا مگر عوام کے ساتھ چل کر، کم از کم تیسری دہائی کے آخر تک، ان کی رہبری کرنے کا رجحان نہیں تھا۔ اگرچہ خلافت تحریک کے زمانے میں انھوں نے مذہب کو سیاست سے ملانے پر اپنی نفرت کا اظہار کیا، لیکن ان کی اصل دشواری گاندھی کی سیاسی حکمت عملی کو سمجھنا تھی اس وقت بھی اور اس کے بعد بھی۔ وہ جیسا

کہ ویول نے 1946 میں لندن میں اپنے آقاؤں کو مطلع کیا تھا، ایک عجیب کیریکٹر تھے۔ ایک تنہا، اداس، من مانی کرنے والے، محو بالذات آدمی تھے، ایک آدمی نہایت عزم کے ساتھ ایک شکست نصیب جنگ لڑتا ہوا"۔

پھر بھی ایک مشترک گجراتی پس منظر رکھنے والے اور برٹش لیگل اسکولوں کے تعلیم یافتہ جناح اور گاندھی سے توقع تھی کہ وہ ایک دوسرے کو آسانی سے سمجھ لیں گے۔ درحقیقت ان کے درمیان مشترک بہت کم تھا۔ تیسری دہائی کے تیکھے مباحثوں سے پہلے بھی۔ یہ صحیح ہے کہ جناح متقی و پرہیزگار مسلمان نہیں تھے نہ ایک مذہبی متعصب۔ لیکن انھوں نے کسی بھی مذہبی بنیاد پرست گروہ سے زیادہ مسلمانوں میں ایک تمدنی اتحاد و یکجہتی کے خیال کی تفسیر کی اور اسے دوسرے روشن خیال (eclectic) مذہبی اور ثقافتی طور طریقوں اور رواجوں کے مقابل کھڑا کردیا۔ انھوں نے اپنی تاریخ بھی کچھ بہت اچھی طرح نہیں پڑھی تھی، نہیں تو وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو باہمی طور پر بے جوڑ، الگ الگ اپنا اپنا مقدر خود بنانے والی اکائیاں قرار نہ دیتے۔

جناح کے لیے 'پاکستان' مسلمانوں کے مصائب کا واحد مداوا تھا۔ وہ کس چیز کے بارے میں بات کررہے تھے؟ کوئی چند افراد اور چند گروہوں کی پریشانیاں سمجھ سکتا ہے۔ انصاف کی بات ہے۔ لیکن ہندستان میں نہ تو مسلمانوں کو نہ ہی کسی دوسرے سماج میں کسی دوسرے گروپ کو اس طرح کی دشواریاں پیش ہیں۔ دیوبند کے علماء کو نہیں معلوم تھا کہ جناح کس چیز کے بارے میں بات کررہے تھے۔ نہیں تو انھوں نے مشترکہ اجتماعی قوم پرستی کا انتخاب نہ کیا ہوتا۔ خان عبدالغفار خاں جناح کی غیرذمہ دارانہ اسکیم کا مطلب نہیں سمجھ سکے، مومن نہیں جانتے تھے کہ ایک مسلم ملک ان کی حیثیت کو کس طرح بلند کردے گا۔ ان افراد اور ان گروہوں کو ایک طرف الگ رکھ دینا اور بالآخر ایک مسلمان ملک کے حصول میں اطمینان پالینا آسان ہے۔ پھر بھی پاکستان ان کے لیے حقیقی سے زیادہ ایک خیالی جنت تھی۔

"یہ ایک اچھی تلخیص کی"، پردیپ نے کہا۔

"یہ تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے"، عارف نے اظہار خیال کیا، "کہ علماء دین کے بجائے جناح جیسے پس منظر والے ایک آدمی نے ایک مسلمان ملک بنا دیا"۔

عزیز نے جماہی کو روکتے ہوئے کہا، "ہاں وہ داڑھی نہیں رکھتے تھے، اپنی تقریروں میں بیچ بیچ میں قرآن سے حوالے نہیں دے سکتے تھے، اردو شعر نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ایک اسلامی جمہوریہ کا انتہائی غیر متوقع امیدوار!"

محفل پر کچھ دیر کے لیے سکوت طاری ہوگیا۔ پاس کے اسکول سے لڑکوں اور لڑکیوں کے رام دھن گانے کی آواز آرہی تھی۔

رگھوپتی راگھو راجا رام
پتت پاون سیتا رام
ایشور اللہ تیرے نام
سب کو سمتی دے بھگوان

"عزیز بھائی کے بیان سے یہ بات بالکل صاف ہے"، پردیپ نے کہا، "کہ سیاسی آئیڈیالوجی سے کہیں زیادہ ذہنی تساہل اور فرسودہ چیزوں کی نئی شکل میں پارسا پیش کش نے پاکستان کی تاریخ نویسی کی راہ کھوٹی کی ہے۔ اسے دانش ورانہ تجسس سے بدلا جانا چاہیے اور ماضی سے متعلق معلومات کی ایک آزادانہ تحقیق ہونا چاہیے"۔

صحیح ہے۔ مگر امکانات بہت روشن نہیں ہیں، کیوں کہ ۔

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہ بر کو میں

آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ عارف نے اپنا چہرہ اپنے سفید رومال سے ڈھانپ لیا اور رک رک کر بولا۔ "چند دنوں بعد میں، 17 تاریخ کو یومِ تاسیس کی تقریبات میں حصہ لینے علی گڑھ جاؤں گا۔ ہمارے عظیم ادارے کے ایک طالب علم کے ناتے آپ وہاں کے طالب علموں اور اپنے ساتھیوں سے کیا کہنا چاہیں گے؟"

عزیز نے اپنا پائپ جلایا اور چھت پر نظر ڈالی مگر صرف یہ جاننے کے لیے

کہ یوپی کی راجدھانی میں بجلی ایک بار پھر غائب ہے۔

"یا اللہ"، اس نے ہنستے ہوئے کسی قدر سکون سے کہا، جیسے وہ کسی کشمکش سے نکل آیا ہو۔

"ایک سوال اور ذہن میں ابھرتا ہے"، جگ موہن نے کہا۔

"کرتے کیوں نہیں ہو؟"

اچانک عزیز نے اپنا پن نکالا اور ایک بادامی کاغذ پر کچھ لکھنا شروع کردیا۔ اس نے لکھا۔ کاٹا اور پھر لکھا۔ ایک بار پھر کاٹا اور پھر لکھا۔ تھوڑی دیر بعد اپنے لکھے ہوئے کو اس نے پڑھنا شروع کیا۔

علی گڑھ یونیورسٹی نے ابھی تک اپنے ماضی سے واسطہ رکھا ہے اور ملک کی یونیورسٹیوں کے خاندان میں اپنی ایک جگہ بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ پھر بھی اس سے متعلق افراد طالب علم اور اساتذہ دونوں کے سامنے اپنے یہاں کے استادوں اور طالب علموں کی برادری کو آنے والی دہائیوں کے چیلنجز سے مقابلے کرنے کے لیے تیار کرنے کا دشوار کام ہے۔ ضرورت ہے کہ وہ روشن خیال اور جدید خیالات و نظریات کے فروغ کے لیے سید احمد کے مشن کو آگے بڑھائیں اور تعلیم، سماجی اصلاح اور gender justice کے مسائل پر بحث کرنے میں پہل کریں۔ ضرورت ہے کہ وہ عالمی دانش ورانہ رجحانات کی روشنی میں اسلام کی تاویل نو کریں، تبدیلیوں کی ہواؤں کا ساتھ دیں، مراعات سے محروم اپنے بھائی بہنوں کے لیے رہنمائی اور قیادت فراہم کریں اور زندگی کے تلخ و ترش حقائق سے نپٹنے کے لیے انھیں مسلح کریں۔ کہ یہی ہے، جو عظیم صاحب کشف سید احمد نے ان سے توقع کی ہوگی۔ اسی لیے وہ اب اپنی ذمہ داریوں سے بہت دنوں تک بھاگ نہیں سکتے۔ ابھی منازل دشت و دمن کچھ اور بھی ہیں۔

"یہ بات صاف ہے"، عارف نے کہا، "کہ تمھیں لکھنے کی فطری صلاحیت ملی ہے۔ دوستو تم نے غور کیا کہ عزیز بھائی بہت چھوٹا چھوٹا، صاف اور خوبصورت لکھتے

ہیں۔ تحریر میں ایک نسوانی حسن ہے۔

عزیز اپنی کامیابیوں پر مفتخر تھا مگر مغرور نہیں۔ گھر واپس ہوتے ہوئے اس کا گزر ایک قدیم قبرستان کے پاس سے ہوا جہاں اس کے خاندان کے بہت سے لوگ دفن ہیں۔ ہوا میں خنکی تھی، آواز صرف کیڑے مکوڑوں کی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ ایک لمبی سانس لی۔ قبرستان کے اندر جانے کے لیے وہ آج بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے دادا جنھوں نے 1857 میں لکھنؤ میں ہتھیار اٹھائے تھے اور اس کے والد اور خالو جن کا انتقال ہیضے کی وبا میں الٰہ آباد میں ہوا تھا، کی قبروں پر جلانے کے لیے موم بتیاں بھی نہیں لایا تھا۔ قبرستان کے دروازے پر وہ ان مرنے والوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جن کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے وہ لوگ آتے ہیں، جن میں ان ہی مرنے والوں کی زندگیوں کے چشمے رواں دواں ہیں اور ان کے وسیلے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کی روایتوں کا احترام کرنے والی نسلوں نے ان کو زندہ رکھا ہے۔ کیا ان کے اجنبی خیالات اور ان کے نامانوس طرز معاشرت نے انھیں گمنامی میں دھکیل دیا ہے۔ وہ طاق نسیاں کے نقش و نگار بن کر رہ گئے ہیں؟ یا یہ ان کی نجات تھی اور زندوں کے لیے آزادی۔ میری زندگی کے ان دنوں کی ہر بات، عزیز نے سوچا، ایک سوالیہ نشان پر ختم ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

نواں باب

جگر کی آگ نظر کی امنگ دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
(فیض احمد فیض)

جن سنگھ کہتی ہے کہ مسلمان باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں۔ میں یہ کہنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ مگر میں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں غازی پور کا ہوں۔ گنگولی سے میرا رشتہ اٹوٹ رشتہ ہے۔ یہ محض ایک گاؤں نہیں ہے۔ یہ میرا گھر ہے۔ گھر .... میں ہمیشہ غازی پور کا سید معصوم رضا عابدی رہوں گا۔ میرے داوا چاہے جہاں سے آئے ہوں اور میں یہ کہنے کا حق کسی کو نہیں دیتا کہ "تم گنگولی کے نہیں ہو اس لیے نکل جاؤ اور جاکر رائے بریلی میں رہو"۔ صاحب میں کیوں چلا جاؤں؟ میں تو نہیں جاؤں گا۔

(راہی معصوم رضا)

ہر سال نو کی شام طرح طرح کے متضاد احساسات جگاتی ہے۔ ماضی کی یادیں، نامعلوم مستقبل کی آرزوئیں، تمنائیں اور خواب۔ اپنا اتنا بڑا کام عزیز نے کس مہینے یا کس سال میں یا کس مہینے میں ختم کیا تھا کسی کو یاد نہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تینوں یار اپنے الگ الگ رستوں پر چلے گئے۔ جگ موہن نے عمارتوں کے ٹھیکے کے اپنے کام میں بڑی دولت کمائی، ساؤتھ ہال میں ایک مکان بنوایا، ایک بہت بڑا گھر نئی دہلی میں گریٹر کیلاش کے پاس چراغ انکلیو میں بنوایا۔ قدیم لکھنؤ کی قدیم دنیا سے اس کا رابطہ صرف ہمایوں تھا، جو اب مسقط میں رہ رہا تھا اور ایرلائن کے اسٹاف کو ابتدائی انگریزی پڑھاتا تھا۔ پردیپ نے ایک سال ٹورنٹو میں آرام کیا اور اپنی نسل کے ہر دوسرے شخص کی طرح، نرالا نگر میں دو کمروں کا ایک گھر بنانے کے لیے لائف انشورنس کارپوریشن سے قرض لیا۔ اس کا گھر اچھا خاصا تھا مگر ریلوے لائن سے قریب ہونے کی وجہ سے اکثر آتی جاتی ٹرینوں کے شور سے وہ پریشان ہو جاتا۔ مشہور تھا کہ غزل کی مشہور گانے والی بیگم اختر اپنے وکیل شوہر کے ساتھ اسی علاقے میں رہتی تھیں۔

پردیپ مشکل ہی سے باہر نکلتا تھا۔ دن بھر وہ اپنے آپ کو کاموں میں مصروف رکھتا مگر شامیں اداس اور طویل ہوتیں۔ اکثر لیٹے لیٹے وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے گھڑی کو دیکھتا۔ بسا اوقات وہ اپنے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھتا اور برسوں میں جمع کی ہوئی اپنی تاریخ کی کتابوں کے ذخیرے پر نظر ڈالتا۔ یہی وقت تھا جب اُسے عزیز، جگ موہن ہمایوں اور عارف کی یاد آتی مگر ؎

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی
یاروں نے اتنی دور بسائی ہیں بستیاں

مہینے میں دو دفعہ وہ دن بھر کے لیے رکشا کرائے پر لیتا اور سیدھا رام اڈوانی کی کتابوں کی دوکان کا رخ کرتا۔ مے فیر (Mayfair) سنیما کے پاس ایک دفعہ اسے عطیہ حسین کا ناول "Sunlight on a Broken Column" اور راہی معصوم رضا کی کتاب ''آدھا گاؤں'' خریدتے ہوئے دیکھا گیا۔ واپسی پر وہ قیصر باغ میں محمود آباد ہاؤس

پر رکتا۔ محمود آباد ہاؤس لکھنؤ کے زوال کا خاموش شاہد، اور بارہ دری، گذشتہ لکھنؤ کو یاد دلانے والی ایک بے رحم نشانی، ایک زمانے میں لکھنؤ ثقافتی ہنرمندوں کے لیے مقناطیس تھا اور جہاں معروف اور مستند جگہوں کے علاوہ بھی ثقافتی زندگی سے بھرپور گھروں کی چہاردیواریوں میں حاصل کیے جانے والے، رقص اور مصوری جیسے متنوع آرٹ کے تجربے ہوتے تھے۔ آج وہاں اپنے شعر سے لوگوں کو مست کردینے والے نہ جگر ہیں نہ جوش نہ مجاز۔ عقائد Myths اور یادیں پہلو بہ پہلو رہتی ہیں۔ ایک مدفون شہر کی طرح لکھنؤ اب صرف پردیپ جیسے افراد کی یادوں میں بسا ہوا ہے۔

گمنام رہنے کی تمام کوششوں کے باوجود کوئی نہ کوئی ہوتا تھا جو اسے ڈھونڈ نکالتا تھا۔ کوئی جو اس کے نام سے واقف ہوتا۔ ”پروفیسر صاحب کے یار ہیں یہ......“

عزیز بیمار تھا اور تنہا۔ 1971 میں اس کی بیوی کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ وہی سال ہے جب بنگلہ دیش آزاد ہوا تھا۔ دیانا کا تربیت یافتہ اس کا بیٹا، ایک ڈینٹسٹ بمبئی میں رہتا تھا۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے بیاہی اس کی بیٹی بھوپال میں رہ رہی تھی اور مزے میں تھی۔ وہ خود شیش محل کی گنجان بستی میں ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔

ہاں وہ ایک تنہا آدمی تھا۔ اسے اپنے دوستوں کی غیر موجودگی کا دکھ تھا۔ یونیورسٹی سے سبک دوش ہونے کے بعد ان لوگوں کی کمی اسے اور زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ کتنا جی چاہتا تھا اس کا، اپنے تجربات اور ایک ایسے شہر میں رہنے کے تلخ حقائق سے حریفانہ مڈبھیڑوں کا تذکرہ کرنے کا جہاں ہر چیز بدل گئی تھی اور زیادہ ابتر ہوگئی تھی۔ بہرحال اب کوئی نہیں ہے اس کے دکھوں کو اس کی پریشانیوں کو سننے والا۔ اُن دنوں لکھنؤ بڑا مختلف تھا آج کی طرح نہیں۔ یہ بڑی نفیس و نازک جگہ تھی، بڑے شریف لوگوں کی بستی۔ وہ لکھنؤ کہاں چلا گیا وہ شان و شوکت، وہ خواب۔

رہی ناگفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

عزیز اپنے گھر سے صرف محرم کے زمانے میں نکلتا تھا۔ اس کے ساتھ

پڑوس میں رہنے والے تین لڑکے بھی ہوتے صفدر، لئیق اور انصار۔ وہ اتنا کمزور ہوگیا تھا کہ خود، بغیر کسی سہارے کے چلنا بھی اس کے لیے مشکل تھا۔ وہ زندہ ہونے کا اظہار تو کرتا تھا مگر آپ دیکھ سکتے تھے کہ زندگی سے اس کا رشتہ کتنا رہ گیا ہے۔

بڑے امام باڑے سے واپس ہوتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہتا۔

آج شہر پہ کیا عالم تنہائی ہے۔

6 نومبر 1992 ایودھیا میں بابری مسجد دن کے اجالے میں گرا دی گئی۔ عین اسی شام عزیز نے حضرت گنج کی خاص شاہ راہ پر چلتے ہوئے ے فیر سنیما کے بالمقابل ایک اسٹال سے "پانیر" اخبار خریدا۔ اس میں دہلی میں قیام پذیر سیاسی سائنسداں رجنی کوٹھاری کا ایک پیغام جلی حروف میں شائع ہوا تھا۔ اس مقدس شہر میں کوئی بنیادی چیز ہوئی تھی۔ ہندستانی تہذیب اور تمدن اس کی اپنی شناخت اس کی سنسکرتی کی بنیادوں پر زبردست حملہ ہوا تھا۔ اصل روایات اور ورثہ پر جسے یہ کارسیوک اور ان کے سیاسی نیتا سمجھتے تھے کہ بچا رہے ہیں .... اس دُہرے حملے سے ہندستان کیوں کر بچ سکے گا۔ یہ دیکھنے کی بات ہے۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ بچ سکے گا۔ یہ وہ ہندستان نہیں جسے ہم جانتے تھے۔

یہ محرم کی نویں تاریخ تھی۔ افق پر ایک ڈوبتے ہوئے کھوئے کھوئے سے چاند کی روشنی تھی، جگمگاتے امام باڑوں سے جہاں تعزیے اور عَلم دفن کیے گئے تھے، آنے والی لاکھوں چراغوں کی روشنی آسمان کو منوّر کررہی تھی اور شہر جوق درجوق آنے والے لوگوں سے جیسے جاگ پڑا تھا۔ اس خوبصورت روشنی میں لوگ یہ بھولے ہوئے تھے کہ سوگ کا مہینہ ہے۔

اگلی صبح، عزیز، تاریخ داں کا انتقال ہوگیا۔ لاؤڈ اسپیکر پر آواز آئی، اللہ اکبر اللہ اکبر۔ حکیمن بوا نے جو خالی کمرے میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں، آہ بھری۔ ہم دنیا میں مٹھیاں بند کیے ہوئے آتے ہیں اور جاتے ہیں کھلے اور خالی ہاتھوں کے ساتھ۔ ہر چیز فانی ہے۔ یا اللہ مرنے والے کی روح کو سکون بخش! حکیمن بوا نے اپنے

شوہر رحیم کو پکارا، جس نے آکر نعش پر ایک سفید چادر ڈال دی، تکیے کے پاس گلاب کی ایک شاخ رکھ دی اور کمرے سے مارکس، نہرو اور گاندھی کی تصویریں ہٹا دیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور زور زور سے پڑھنا شروع کیا۔

اِنَا لِلّٰہِ وَ اِنَا عَلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

کون جانے یہ عزیز کے لیے تھا یا اس کے سیکولر خواب کے لیے؟

"ہمیں یہ توقع رکھنا چاہیے"، پردیپ نے کہا ہوتا، "کہ اگلے ملینیم کی تہذیب کا فیصلہ جھگڑے سے نہیں مکالمے سے ہوگا"۔

"بدترین صورت میں"، عزیز نے آہستہ سے کہا ہوتا، "ہم ایک ایسے ملک کے روبرو ہیں جو خود اپنے عوام سے نبرد آزما ہے"۔

☆☆☆☆☆